۱۸۵۷ کے غدر کی دستاویزات اور تصنیفات کا ادبی جائزہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

(۲۰۱۳ تا ۲۰۱۸)

مقالہ نگار
بشریٰ غفور

نگراں
ڈاکٹر محمد محسن

شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

۱۸۵۷ء کے غدر کی دستاویزات اور تصنیفات

کا ادبی مطالعہ

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستانی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۷ء کا نام ہندوستانی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام قابل ذکر ہے۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت ہی زیادتیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہندوستان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ دوران غدر انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض تھے اور ساتھ ہی ہندوستانی عوام کے جانی و مالی دشمن بھی تھے۔ ان تمام پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرانے کے لیے ہندوستانی عوام کے دل و دماغ میں آزادی حاصل کرنے کا خیال آیا۔

اس مقالے کے ذریعے ہم نے یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ ہندوستان کو آزادی کس طرح حاصل ہوئی اور اردو زبان و ادب کا اس میں کیا کردار رہا ہے۔

مقالے کا عنوان ۱۸۵۷ء کی غدر کی دستاویزات اور تصنیفات کا ادبی جائزہ ہے اس میں آزادی سے قبل اور بعد کے واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے کہ کن کن مشکلات کا سامنا کر کے ہمارا ملک ہندوستان آزادی کی راہ پر گامزن ہوا جس میں دستاویزات، اخبارات اور تصانیف وغیرہ کا بھی خاصا عمل دخل رہا ہے۔

دراصل غدر کے زمانے میں ہندوستان پر انگریزون کا غلبہ طاری تھا۔ ہندوستان پر چہار جانب سے انگریزی حکومت مسلط ہوتی جارہی تھی۔ انگریز ہندوستانیوں کی طرح طرح کے مظالم سے دوچار کررہے تھے اور ہندوستانی عوام انگریزوں کے اس ظالمانہ رویہ سے بہت عاجز ہو چکی تھی۔ ایسے تباہ کن حالات میں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ اس وقت کے برائے نام مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار تھے اور ان کو ہر ماہ ایک لاکھ روپیہ وظیفہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے سے ملتا تھا جس کے نتیجے میں کمپنی نے پورے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ہندوستانی عوام نے ایسے ظالمانہ حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دل میں آزادی حاصل کرنے کی ٹھان لیا۔ فرنگیوں کے اس ظالمانہ رویے سے ہندوستانی عوام ان سے نفرت کرتی تھی۔ ہندوستانیوں نے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے انگریزوں سے لوہا لینا شروع کر دیا۔ جب کسی اچھے کام کے

لیے خدا پر بھروسہ کے اس کام کی جستجو میں دل و جان سے لگ جائے تو اسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں نفرت کی اس آگ اور انگریزوں کے ذریعے ہو رہے استحصال اور جبر واستبداد کے باعث ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ابتدا کر دی۔ انگریزوں کی مخالفت میں ہندوستانیوں کی یہ پہلی اور بڑی جنگ تھی جس کو ہندوستانی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور انگریز اسے بغاوت ہند کا نام قرار دیتے ہیں۔ اس جنگ کی یہ خاص بات تھی کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند ملازم سپاہیوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔

۱۸۵۷ء میں منگل پانڈے اور دوسرے میرٹھ کے سپاہیوں نے اس جنگ کا آغاز کیا۔ میں اپنے اس مقالے میں منگل پانڈے اور چند دیگر اہم شخصیات کا تعارف کرانا چاہوں گی۔ عظیم شخصیات کے ساتھ ساتھ شاعر، ادیب، صحافی اور چند خاص اہم مصنفین نے غدر کے متعلق خاصا کچھ تحریر کیا ہے۔

دراصل غدر کا یہ سلسلہ ہندوستان میں کافی عرصے تک جاری رہا۔ عظیم شخصیات کے صحافیوں کے ساتھ ہی اخباروں، کتابوں اور رسالوں وغیرہ میں بھی غدر کے چند اہم واقعات سے آگاہی کرانے کے لیے ہمارے درمیان عظیم شخصیت، قوم کے مسیحا اور محسن الملک سر سید احمد خاں نے خاصہ کچھ رقم طراز کیا ہے۔

جس میں ان کی سب سے اہم تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' خاص طور سے معروف ہے جس کو اردو ادب میں خاص اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں سر سید احمد خاں سے انگریزوں کی غلط پالیسیوں (Policies) اور کوتاہیوں کو کھل کر بیان کیا ہے جس کا ہندوستانی اور برٹش حکومت دونوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔

اس جنگ کی خاص بات یہ تھی کہ غدر کے اثرات نے ہندوستان کے خاص و عام، ادبا و شعرا صحافیوں وغیرہ پر بے حد اثر ڈالا جس سے آزادی کی اس تحریک نے ادب وصحافت وتصانیف غرض سماج کے ہر طبقہ کو متاثر کیا جس کا اثر ہماری شاعری کے میدان اور دیگر اصنافِ ادب پر پڑا۔ غدر کی اس تحریک سے سماج کے سیاسی، سماجی اور دیگر پہلوؤں سے واقفیت ہوئی۔

اس موضوع پر ریسرچ سے سماجی جدو جہد و جستجو اور آزادی کے متوالوں کی زندگیون کے بہت سے خفیہ گوشوں سے روشنی فراہم ہوئی۔ مقالے کے اس عنوان پر گفتگو کرنے سے آزادی سے پہلے اور بعد کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات سے بھی واقفیت فراہم ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ملک کی فضا کیا تھی اور آزادی کے بعد اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ان سب باتوں کا تذکرہ اس مقالے میں قلم بند کیا گیا ہے۔ ملک کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور ادبی فکری اور معنوی سطحوں کو

پر کھنے کے لیے میں نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

باب اول کا عنوان ۱۸۵۷ء اور اردو ہے: اس باب میں غدر کے زمانے کے اردو حالات پر تبصرہ کیا ہے کہ غدر سے قبل، دورانِ غدر اور غدر کے بعد اردو زبان وادب کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ مغلیہ دورِ حکومت میں اردو کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ کچہری، پولیس اور سرکاری کاموں میں اردو اور فارسی زبان کا ہی استعمال کیا جاتا تھا جو کہ انگریزی حکمرانوں کا ناپسند تھی۔

اگر ہم آزادی سے پہلے کے اردو ادب پر نظر ڈالیں گے تو وہیں یہ بھی از حد ضروری ہے کہ ہم اردو سے متعلق چند بنیادی قواعد وقانون کو بھی ذہن نشین کر لیں گے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس کے ارتقاء اور نشو ونما کے متعلق چند مزید معلومات فراہم کر لیں۔

اردو کا تعلق مذہب سے نہیں ہے نہ ہی اس میدان سے ہے جس کا اپنا اکلوتا معیار ہو۔ بلکہ اردو کا تعلق اس میدان سے ہے جس میں کھلاڑی یکجا ہو کر اپنی جیت حاصل کر کے اپنا ایک اہم مقام بناتے ہیں۔ اردو کے معنی لشکر یعنی جھنڈے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً جس طرح سے لشکر میں بھی ملک وقوم کے افراد شامل ہوتے ہیں اسی طرح اردو بھی قوم ومذہب کی زبانوں کا سنگم ہے۔ مثلاً پنجابی، کھڑی، بولی، سنسکرت، ہندی، فارسی اسپینش وغیرہ۔

مغلیہ سلطنت کے دوران اردو ادب کو شاعری کے میدان میں خاصا فروغ حاصل ہوا۔ غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، شاہ نصیرؔ، حالیؔ، شبلیؔ، بہادر شاہ ظفر، محمد حسین آزادؔ وغیرہ نے نثر، شاعری، صحافت، تصنیفات، افسانے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعے اردو ادب کو خاصا فروغ دیا۔

۱۸۵۷ء میں مئی کے مہینے میں میرٹھ سے جو چنگاری پھوٹی وہ آگ کے شعلے کی مانند ہندوستانی عوام کے درمیان بھڑکی جس کی شدت کو پورا ملک محسوس کر رہا تھا اور لوگ انگریزون کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے موقو پر محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے اپنا اردو اخبار شائع کر کے لوگوں میں جوش وولولہ پیدا کر دیا۔ اس اخبار کا نکلنا تھا کہ ہندوستانی اور انگریزی عوام میں افراتفری، لوٹ کھسوٹ اور مارکاٹ کو ماحول برپا ہو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ کہ آج جو ترقی اردو ادب کو ہوئی وہ کسی اور زبان کے زمرے میں نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں آسان وشگفتہ الفاظ کی بھرپور چاشنی موجود ہے۔ ہندو مسلمان گویا ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے آج بھی اردو کے بے حد پسند کرتے ہیں۔ اس لیے اس خوبصورت زبان کے لیے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

باب دوم کا عنوان ''اسباب بغاوت ہند'': اس میں بغاوت سے متعلق اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں سر

سید احمد خاں کی قابل قدر مشہور تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' خاص قابلِ ذکر ہے اس کی مدد سے اس باب کو مکمل کیا گیا ہے۔

سر سید احمد خاں نے بغاوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ملک کو آزاد کرانے کے لیے انہوں نے انگریزی حکمرانوں کی تابع داری کرنے میں بھلائی سمجھی جس سے انگریزوں سے پیار سے انتقام لیا جا سکے۔

اس دوران نادر شاہ نے بھی دہلی پر حملہ کیا اس لیے غدر کے زمانے میں نادر شاہ کا نام بھی خاصا اہم ہے جس میں اس کی فوج کو خاصا نقصان ہوا۔ نادرن شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی پھر ٹیپو سلطان وغیرہ کا نام بھی جنگ کے لیے خاصا اہم ہے۔ ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے شہید کر دیا۔

ان کے علاوہ نانا صاحب، رانی لکشمی بائی اکبر، جہانگیر، شاہ جہاںؔ، اورنگ زیبؔ وغیرہ جیسی اہم شخصیات کا نام بھی غدر کی قربانی کے لیے خاصا اہم ہے۔

باب سوم کا عنوان ''سیاسی کشمکش اور عوامی اضطراب'' اس باب میں انگریزوں کی سیاسی کشمکش پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں ہی اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک کے حالات خستہ ہو گئے تھے۔ یہی مغل حکمراں کے زوال کی صدی تھی۔ جس میں مغل سلطنت کے حکمراں ہمایوں، جلال الدین محمد اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں وغیرہ نے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے اور ملک کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے خاصی اہم خدمات انجام دیں۔

باب چہارم کا عنوان ''انتقامی جذبہ آزادی کی تڑپ'': اس میں اس بات پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ غدر کے لیے انگریز ہی ذمہ دار تھے تو ایسے تباہ کن حالات میں انگریزوں نے ہندوستانیوں سے کیسے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کیونکہ ۱۷۵۷ء میں انگریزون کی پہلی جنگ نواب سراج الدولہ سے ہوئی جس میں ان کو شکست حاصل ہوئی۔ غرض کہ برطانوی نظام میں مذہبی اور غیر مذہبی طور پر جنگ کا ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔

ہندوستانی عوام کے دلوں میں ادیبوں اور شاعروں نے آزادی کی تڑپ اجاگر کی تو انہوں نے ایسے تباہ کن حالات میں انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایک دن انگریزوں کو شکست دے کر جیت یعنی آزادی حاصل کی جس میں اخبارات کی اشاعت بھی خاصی مقبول و مشہور ہے۔

پانچواں باب ''ادبی تصانیف (۱۸۵۷ء کا ادبی اور لسانی پہلو)

اس میں ۱۸۵۷ء کے ادبی ولسانی پہلو پر اظہارِ خیال کیا جائے گا جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کا تعلق ہندو اور مسلمان کی آپسی سیاسی کشمکش کو قرار دیا ہے۔ اسی دوران عوام زبان کے ساتھ ساتھ آپس میں بھی تفریق کرتی تھی۔ اور

فرنگی اپنے مقصد میں زیادہ دن کامیاب نہیں رہے اور ہندوستانی عوام نے محنت اور لگن کے ساتھ انگریزوں سے آپسی مقابلہ کر کے ایک دن فتح حاصل کر لی۔

اس لیے بغاوت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ملک کے ادبی، سیاسی، سماجی اور لسانی پہلو کو سمجھنا بھی از حد ضروری ہے۔ جس میں ہندوستان کے رہن سہن اور بول چال کو بھی خاص اہمیت دی گئی اس باب میں ان سبھی باتوں کو بہت ہی دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا۔ انسان دنیا میں جو چیزیں آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کان سے سنتا ہے اس کو اپنے خیالات کے ذریعے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زبان و ادب کے ذریعہ ہم دنیا میں پیش آنے والے واقعات کو اہل علم کے سامنے ظاہر کرتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ، حال کی روداد اور ان دونوں کی روشنی میں مستقبل کی فکر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے جدید افسانوں کے لئے انسان کی تاریخ، ان کے بیتے کل کو بیان کر کے سماج میں پھیلی ان تمام برائیوں کو نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں اور عہد عتیق کی کارستانی سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ انہیں واقعات کو ہم (جدید افسانے) ادب میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ میرا تعلق بھی اردو ادب سے ہے جس میں، میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے اور بعد کے واقعات سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۵۷ سے پہلے ملک کی فضا کیسی تھی اور اس ملک کو، کن کن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور غدر سے پہلے اور بعد میں ملک کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی کشمکش کی کیا صورت حال تھی۔ مزید اس مقالے کے ذریعے میرا مقصد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ثقافتی اور دیگر واقعات کو سماج کے سامنے پیش کرنا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ایسے کون سے اسباب نے جنم لیا جس کے تحت جنگ کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس جنگ کو غدر کا نام دے دیا گیا۔ دراصل پہلی جنگ آزادی سے قبل ہندوستان پر انگریزوں کا بول بالا تھا۔ ملک میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کے سامنے بولنے کا بھی حق نہیں تھا۔ پورا ملک انگریزوں کی گرفت میں تھا۔ انگریزوں نے قدم بہ قدم ہندوستانیوں کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان سب کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کی گرفت میں رہتے ہوئے ہندوستانی عوام کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو ان تباہ کن حالات سے چھٹکارا پانے کے لئے ہندوستانی عوام کے دماغ میں ملک کو انگریزوں کی قید سے آزاد

کرانے کا خیال آیا جس کے لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی اور جنگ کا اعلان کر دیا۔انگریزوں کے چنگل سے چھٹکارا پانے کے لئے ہندوستان کے ہر طبقے نے، امیر ہو یا غریب، بوڑھا ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، ہندو ہو یا مسلمان غرض ملک کے سبھی افراد نے ملک کو انگریزوں کے ظلم و زیادتی سے آزاد کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔لیکن ۱۸۵۷ء کی اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز پورے ملک پر مسلط ہو گئے۔اس جنگ کے مدنظر ۱۸۵۷ء کے حالات اور اس میں ادبا کی شراکت داری،ان کے قلم سے نکلے ہوئے اس عہد کی تاریخ خاص طور پر انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد کی تاریخ، کتابیں جو ۱۸۵۷ء کے عہد میں یا اس کے بعد جو دستاویزات تیار ہوئی، کتابیں،اخبارات وغیرہ کے ذریعے وجود میں آئیں۔خاص طور پر سرسید تحریک کے زیر اثر جو کتابیں منظر عام پر آئیں۔سماج میں ان کتابوں کے اثرات کس حد تک اثر پذیر ہوئے اور اردو زبان و ادب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کون کون سی اصناف وجود میں آئیں۔ان ہی تمام چیزوں کو دریافت کرنے کے لئے راقمہ کو پی۔ایچ۔ڈی کا عنوان ''۱۸۵۷ء کے غدر کی دستاویزات اور تصنیفات کا ادبی مطالعہ'' تجویز ہوا ہے۔یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب اپنے آپ میں مکمل اور ہر باب پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

اس مقالے کا پہلا باب ''۱۸۵۷ء اور اردو'' ہے جس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور غدر یا جنگ آزادی کی لڑائی کے بعد کے حالات و واقعات کے ساتھ اردو کی صورت حال پر مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ان دنوں کن کن جگہوں پر اردو کا استعمال کیا جاتا تھا، کیسے عوام کی دلچسپی کا باعث بنی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے زمرے میں نہیں آئی۔جنگ آزادی کے بعد اردو نے ایسی ترقی کی کہ یہ اب عوام کی بول چال کی زبان بن گئی۔

مقالے کا دوسرا باب ''اسباب بغاوت ہند'' ہے۔اس باب میں ہم غدر کے زمانے میں پیش آنے والے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے جس کے لئے ہمارے محسن الملک سرسید احمد خاں کی مشہور تصانیف اسباب بغاوت ہند خاصی اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب کی مدد سے ہم نے اس باب میں گفتگو کی ہے کہ کن اسباب کی بنا پر غدر کا آغاز ہوا۔اس زمانے کی دیگر اصناف کتب کی مدد سے اس باب کو مکمل کیا گیا ہے۔محض یہ کہ ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا تذکرہ ۱۸۵۷ء

میں شائع ہونے والی کتب اور اخبارات کے ذریعہ کیا گیا ہے۔اس باب میں اس بات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے کہ انگریز اپنے سامنے کسی کو نہیں سمجھتے تھے اور اپنی حکومت کے آگے ہندوستانیوں کے ہر خیالات کو نظر انداز کرتے تھے جس سے ہندوستانی عوام انگریزوں کے اس رویے سے آگ ببولا ہو جاتے تھے۔

مقالے کا تیسرا باب ''سیاسی کشمکش اور عوامی اضطراب'' ہے۔اس باب میں سیاسی صورت حال خاص طور پر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک کی کیا صورت حال تھی۔اورنگ زیب کے بعد کون کون بادشاہ بنا،ان کی حکومت کیسی تھی۔جنگ کی نوبت کیونکر پیش آئی۔اور عوامی کیفیت کا خدوخال کیا تھا۔انگریزوں کے مظالم نے عوام کو مضطرب کیا جس کی بدولت عوام نے بھی ۱۸۵۷ء میں انہیں منھ توڑ جواب دینے کی کوشش کی لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔

مقالے کا چوتھا باب ''انتقامی جذبہ آزادی کی تڑپ'' کے عنوان سے دستیاب ہے جس میں ہم نے اس بات کو صحیح اور صدق دل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ غدر کا آغاز کرنے کے لئے انگریز ہی ذمہ دار ہیں۔ان سے لوہا لینے اور آزادی حاصل کرنے کی غرض اور تڑپ کے لئے ہندوستانیوں نے کن کن مشکلات کا سامنا کیا جس کا تذکرہ ہم نے مختلف دستاویزات،اخبارات،کتب اور مختلف تصانیف کی مدد سے کیا ہے۔

مقالے کے باب پنجم جس کا عنوان ''ادبی تصانیف (۱۸۵۷ء کا ادبی لسانی اور تہذیبی پہلو) ہے۔اس باب کے ذریعے میں آپ سبھی حضرات کو ہندوستان کی سیاسی،لسانی،ثقافتی اور تہذیبی پہلو سے واقفیت حاصل کرانا چاہوں گی۔اس لئے اخبارات،اقتباسات کی روشنی میں اس باب کو مکمل کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی زبان و بیان پر بحث و مباحثہ بھی کیا گیا ہے۔

آخر میں اختتامیہ یعنی باب ششم کے ذریعے پورے مقالے کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مقالے کا حاصل کلام کیا ہے۔

آخر میں ان تمام کتب،تصانیف وغیرہ کی فہرست دی گئی ہے جو ریسرچ کے دوران مقالے کو منزل مقصود تک پہنچانے میں میری نظروں کے سامنے سے گزری ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل کے لئے دہلی یونیورسٹی لائبریری (دہلی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

لائبریری، اردو اکادمی (دہلی) لائبریری، دارالمصنفین، شبلی اکادمی وغیرہ کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام اور اسکالرز کی رائے اور مشورہ سے خوب استفادہ کیا ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اس بات کی قبولیت اور شمولیت سے مجھے کوئی پرہیز نہیں کہ مقالے کو اس کی تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجھ سے جو بھی محنت اور گراں قدر خدمات انجام دی گئی میں نے اپنی محنت و جستجو اور لگن کے ساتھ اس مقالے کو پائے تکمیل تک پہنچایا جس میں مجھ کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد محسن نے نہ صرف مشفقانہ کردار ادا کیا بلکہ انھوں نے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی جس سے یہ ریسرچ کا کام آسان ہو گیا۔

میں اپنے شعبہ کے صدر پروفیسر ارتضٰی کریم اور شعبہ سے وابستہ دیگر تمام اساتذہ کرام پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر کاظم، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ابو بکر عباد وغیرہ کی بے حد شکر گزار ہوں جن کے خلوص اور حوصلہ افزائی نے مجھے تقویت بخشی۔

بشریٰ غفور
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی
دہلی۔۱۱۰۰۰۷

فہرست

پیش لفظ ۳۔۷

باب اول: ۱۸۵۷ء اور اردو ۸۔۶۸

باب دوم: اسباب بغاوت ہند ۶۹۔۱۰۴

باب سوم: سیاسی کشمکش اور عوامی اضطراب ۱۰۵۔۱۴۲

باب چہارم: انتقامی جذبہ اور آزادی کی تڑپ ۱۴۳۔۱۷۶

باب پنجم: ادبی تصانیف ۱۷۷۔۲۴۰
(۱۸۵۷ کا ادبی، لسانی اور تہذیبی پہلو)

حاصل مطالعہ: ۲۴۱۔۲۵۷

کتابیات: ۲۵۸۔۲۶۲

باب اول

۱۸۵۷اور اردو

سر زمین ہند میں مختلف رنگ و نسل کے انسان آباد ہیں جبکہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی وجہ سے اس ملک کو زبانوں کا عجائب گھر بھی کہا جاتا ہے۔ ان ہی زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے جسے سماجی ضروریات نے جنم دیا تھا جو ہزار سالہ تاریخ پر محیط ہے۔ اردو زبان آریائی زبانوں کے زیر اثر تقریباً ۱۰۰۰ء میں وجود میں آئی جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد (محمود غزنوی کے ذریعے) ہندوستان کے پنجاب کے علاقے کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد مسلم حکمرانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہیں سے اردو زبان کے پنپنے کی راہ ہموار ہونے لگی۔ کیونکہ ان میں عربی، ترکی اور ایرانی وغیرہ کے ساتھ علاقائی زبان کو کھڑی بولی، برج بھاشا، دہلی اور نواح دہلی کی زبان، تہذیب اور سماجی لین دین کے ایک دوسرے کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے زبان کے مروجہ عام لفظ بھی تبادلے کی شکل اختیار کی۔ عام اور سہل زبان کا سہارا ہر ایک نے لیا۔ اس طرح دسویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک یکے بعد دیگرے مسلح حکمرانوں نے ہندوستان کو اپنا جائے مسکن بنایا لیکن سولہویں صدی میں جب مغل آئے تو انہوں نے بہت ہی منظّم انداز میں حکومت کی اور طویل عرصے (۱۸۵۷) تک اپنی سلطنت قائم رکھی۔ یہ عرض کرتی چلوں کہ ہندوستان پر مختلف حکمرانوں محمود غزنوی، غوری یا پھر مغلوں کے دور حکومت میں یہاں کی درباری زبان فارسی تھی اور عام بول چال کی زبان ہندوستانی تھی۔ محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا پائے تخت بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکن، گجرات اور مالوہ پر بھی اثر انداز ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کے مقابلے دکن میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت سب سے پہلے ہوئی۔ محمد تغلق کے اس فیصلے نے

دونوں سمت کے افراد کو یکجا کر دیا اور دونوں کے لئے نئی تہذیب، نئی زبان اور نئے سماج میں ساتھ رہنے کا نیا تجربہ ہوا۔لیکن چند ماہ بعد محمد تغلق کو دولت آباد راس نہ آیا، بلا آخر دہلی کو پھر سے دارالسلطنت قرار دیا اور یہیں آ کر بس گئے۔ان میں کچھ دہلی آئے اور کچھ نے دولت آباد میں ہی قیام کرنا پسند کیا۔ بعد میں بہمنی دارالسلطنت کے قیام کے زیر اثر ہندوی یعنی دکنی زبان خوب پروان چڑھی۔ بہمنی سلطنت ے خاتمے کے ساتھ نئی خودمختار کئی ریاستوں کا قیام جن میں عادل شاہی اور قطب شاہی دور کافی اہم ہیں۔شمال سے لے کر دکن اور گجرات تک زبان اردو کو آگے بڑھانے کے لئے ایسی سازگار فضا تیار ہوئی کہ یہ زبان مشترک زبان بن گئی۔صوفیائے کرام نے اس زبان کو تبلیغ دین کے لئے وسیلۂ اظہار بنایا۔شاعری، موسیقی اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھہری۔جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''شمال میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ اہل علم و ادب، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جو فارسی میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے تھے۔ دکن اور گجرات میں شمال کے خلاف تہذیبی وسیاسی قلعہ بندی کی وجہ سے اردو زبان کو بہت جلد دربار سرکار کی سرپرستی اور اہمیت وحیثیت حاصل ہوگئی جو شمال میں صرف فارسی کو حاصل تھی۔ شمال میں یہ زبان عوام کے منہ چڑھی اپنا رنگ روپ ضرور نکھارتی رہی لیکن اہل علم اُسے شائستگی سے دور اور قوت اظہار سے محروم جان کر فارسی ہی میں دادِ سخن دیتے اور قدر و منزلت کے موتی رولتے تھے۔لیکن جسے عوام تک پہنچنا ہوتا وہ اسی اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بناتا۔ اس لئے صوفیائے کرام نے تبلیغ دین کے لئے اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اور ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔''[1]

تیرہویں صدی امیر خسرو کا دور ہے۔ یہ وہ عہد ہے جس میں ہندوی یعنی اردو کے الفاظ کو شعراء و ادبا ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرتے تھے۔امیر خسرو کو چھوڑ کر شمالی ہند میں سولہویں صدی تک ہندوی کا کوئی نقش دستیاب نہیں ہے البتہ عام بول چال کی زبان رائج تھی۔شاعر و ادیب بول چال کی زبان کو شاعری اور ادب میں استعمال کرنے سے احتراز کرتے تھے۔جنوب میں انہیں صدیوں میں اردو کو اہم مقام ملنے کے ساتھ قابل ذکر تصانیف بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔مغلوں کے دور میں فارسی اپنے

عروج پر تھی لیکن جوں جوں اس کا سورج غروب ہورہا تھا اس کے اثرات کی آڑ میں تہذیب وسماج، زبان وبیان میں بھی کافی تبدیلی آرہی تھی۔ فارسی زبان اپنا اثر کھورہی تھی اس کی جگہ اردو رفتہ رفتہ گھر کررہی تھی۔

سترہویں صدی کے اوائل میں اردو بول چال کی زبان سے نکل کر شعروادب کے پیرائے میں داخل ہونے لگی تھی۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا نمونہ ہمیں محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' جو ۱۶۳۵ء سے قبل لکھی جاچکی تھی سے دستیاب ہوا۔ روشن علی کی شعری تصنیف ''عاشورہ نامہ'' (۱۶۸۸ء) اس کے علاوہ اسمٰعیل امروہوی نے ایک مثنوی ''وفات نامہ بی بی فاطمہ'' (۱۶۹۳ء) میں قلم بند کیا تھا۔ اس عہد میں ولی محمد کا نام کافی اہم ہے اور دکن کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی میں ان کی آمد سے قبل ان کے نام کے چرچے تھے۔ گلی کوچوں میں ان کے اشعار گنگنائے جاتے تھے۔ دلّی کے شعرا حیرت زدہ تھے کہ جس زبان کو ہم گری پڑی زبان کہتے تھے اور شاعری کرنے سے کتراتے تھے، اسی زبان کا یہ شعر جو ہماری دہلی کی گلیوں میں دھوم مچارہی ہیں۔ ان شعراء کو یہ نمونے نئے اور قابل تقلید لگے۔ بلاآخر وہ شعراء بھی جن کی عام بول چال کی زبان تھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ جب ولی نے دہلی کا رخ کیا اور وہاں کے شعراء سے ملے اور ان کے سامنے اشعار پیش کئے تو ہر شاعر وادیب جو فارسی زبان میں شاعری کیا کرتے تھے وہ بھی عش عش کرنے لگے کہ اس زبان میں بھی اتنی اچھی شاعری ہوسکتی ہے۔ بلاآخر دلّی کے شعرا نے بھی اس زبان میں شاعری کرنی شروع کردی۔ ان میں فطرتؔ، امیدؔ، ندیمؔ، بیدلؔ اور خان آرزوؔ وغیرہ فارسی کے شعرا ہیں۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ ایک ایسے شاعر تھے جو اپنے وقت کے عالم بھی تھے۔ ولیؔ کے عالم بھی تھے۔ ولیؔ کے نام کی آمد سے قبل ان کے تلامذہ ان سے فرمائش کرتے تو وہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ولیؔ کی آمد کے بعد ان کی سرپرستی میں دیگر شعرا نے بھی اردو شاعری کی بنیاد رکھی۔ بنیاد رکھنے سے مراد یہ کہ شعر وشاعری اور ادب میں اردو کے الفاظ شامل کرنے لگے۔ شاعری میں ایک مصرعہ اردو میں تو دوسرا مصرعہ فارسی میں ہوتا تھا۔ اس طرح شعرا وادبا نے اس صدی میں اردو کی ابتدا کی۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے اٹھارویں صدی کافی اہم صدی ہے۔ اس صدی کی پہلی

دہائی میں ہی عظیم مغل حکمراں عالمگیر اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوتا ہے۔یہیں سے مغلوں کے زوال کا دور بھی شروع ہوتا ہے۔عالمگیر کے انتقال کے بعد مرہٹوں کی عسکری قوت دن بدن بڑھنے لگتی ہے اور چہار جانب سے ان پر یلغار ہوتی ہے۔خاص طور پر دہلی میں مغل بادشاہوں کے کمزور کردار سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔دوسری جانب سکھوں نے اپنا محاذ کھول رکھا تھا۔جاٹوں نے اپنی طاقت میں کوئی کمی نہ کر رکھی تھی۔ایسے پُر آشوب حالات میں احمد شاہ ابدالی نے تمام کو شکست دی اور شاہ عالم ثانی کو دلّی کا بادشاہ تسلیم کیا۔یہ صدی سلطنت کے عروج وزوال کے ساتھ ساتھ ادب اور شعری فضا میں بھی کافی تبدیلی لائی۔مغلیہ سلطنت کی دفتری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔شمالی ہند کے شعراء اور ادبا کی زبان فارسی تھی۔لیکن وقت اور حالات کے پیش نظر سلطنت کے ساتھ ساتھ زبان بھی زوال کے عمل کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ملکی پیمانے پر فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ہر شاعر و ادیب نے اردو کو وسیلہ اظہار بنانا شروع کر دیا تھا۔کیونکہ اردو غیر سرکاری زبان ہونے کے رفتہ رفتہ باوجود قلعہ معلیٰ کی زبان بن چکی تھی۔محمد شاہ کے زمانے میں اردو کو ''اردوِ معلیٰ'' کے نام سے جانا جانے لگا تھا۔محمد شاہ جو بذات خود اردو میں شعر و شاعری کیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ آبروؔ، ناجیؔ، حاتمؔ، فائزؔ، یک رنگ، مظہر جان جاناںؔ، مضمون، فغا، تاباں وغیرہ اس عہد کے اہم شعراء ہیں۔ان شعراء نے اپنی اردو شاعری کی ابتدا ایہام گوئی سے کی تھی کیونکہ ان کے سامنے ولی اور دیوان ولی کی شاعری جس میں ایہام گوئی کی سی شاعری موجود تھی۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

> ''شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا پہلا دور شروع ہوا تو اس دور کے اردو شاعر فارسی ہی کی تہذیبی اور شعری روایت کے سائے میں پرورش پا رہے تھے، لہذا اردو شعراء فارسی شاعری کے دور متاخرین کے مقبول رجحانات کی بنیاد پر چلے۔فارسی شاعری کی جس روایت کو پہلی بار اختیار کیا وہ ایہام گوئی کی روایت تھی۔دور محمد شاہی کی تہذیبی نفاستوں نے ان کو لفظی صناعی کا رستہ دکھایا اور وہ ایک ایسے رستے پر چل پڑے جو فنی اور ذہنی لحاظ سے بہت محدود تھا اور زیادہ دیر تک اس پر چلنا ممکن نہیں تھا۔''[۲]

چند شعراء کے کلام پر غور کریں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کئی صدیوں کی محنت کے بعد اس

جتھے نے تیار ہوکر میدان عمل میں قدم رکھا اور اردو شاعری کی آبرو میں چار چاند لگائے۔ اشعار دیکھیں:

شیخ ظہور الدین حاتمؔ:

جس کے دل میں تیرا خیال ہوا — اس کو جینا یہاں محال ہوا
ہوگئے اس کا قد ورخسار دیکھ — سرو، قمری، بلبل و گلزار مست
چشمِ مست سیدکی یاد مدام — شیشۂ دل میں ہے شراب کی طرح
کہتا ہے صاف وشستہ سخن بسکہ بے تلاش — حاتمؔ کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

شاہ مبارک آبروؔ:

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے — وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
جو لونڈا چھوڑ کر رنڈی کو چاہے — وہ کوئی عاشق نہیں ہے بوالہوس ہے
قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی — ہوکر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

سید محمد شاکر ناجیؔ:

آج تو ناجی سجن سے کرتو اپنا عرض حال — مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہوتی ہے سو ہو
محبت کا عجب یک رنگ ہے رنگ — کبھی عاشق کبھی معشوق ہیں ہم
کہیں گل میں کہیں بلبل میں دیکھا — ترا جلوہ سجن ہر گل میں دیکھا

مرزا مظہر جان جاناںؔ ایہام گوئی کے خلاف آواز بلند کرنے والے پہلے شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایہام گوئی کے خلاف ایک علامت بن کر ابھرے اور نئے شعری اسالیب کی نمائندگی کرنے والوں میں سرفہرست تھے:

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
اتنی فرصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

اٹھارویں صدی کی تاریخ ہندوستانی تہذیب وثقافت، لسانی وجودیت، بے شمار آویزش

اور تصادمات کا دور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں نظریات وتصورات ،ضوابط وقواعد وغیرہ ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں لیکن دوسری جانب ربط اور ترتیب کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں سات اور ساڑھے سات سو سالہ لسانی روایات کو ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جس سے اس دور میں زبان اردو کو پھلنے پھولنے اور نکھرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہیں سے اردو زبان اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔ اس درمیان ملک کے حالات بہت دگرگوں ہوتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کا پورا ڈھانچہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ یہ عہد محمد شاہ، عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے دور اقتدار پر محیط ہے۔ لیکن ان حکمرانوں کی نا اہلی کی وجہ سے باہری طاقت نے ان کے وجود، تہذیب وسیاست کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ان میں نادر شاہ اور بعد میں احمد شاہ ابدالی شاہی خزانے کو لوٹ لیتے ہیں اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ ان تمام حالات کو اس دور کے شاعر و ادیب نے دیکھا اور مغلیہ دور کے مٹتے نقوش کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں میرؔ اور ان کے معاصرین دردؔ ،فغاں ،تاباںؔ ،سوزؔ ،قائمؔ وغیرہ نے ادبی روایت کے افق کو وسیع کیا۔ یہ شعراء ایک ہی تہذیب کے نمائندے ہیں، مگر ان کی شاعری جدا جدا ہیں۔ ان کے انداز واسلوب ،موضوعات، تجربات وخیالات اور سماجی احوال وکوائف کو دیکھنے کا نظریہ الگ ہے۔ ان شعرا کے شعری سرمایے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شمال میں غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ہجو وغیرہ شروع کی۔ یہاں صرف سوداؔ، دردؔ اور میرؔ کے حوالے سے سرسری گفتگو کرتے ہوئے میں آگے بڑھنا چاہوں گی۔

سوداؔ کا پورا نام مرزا محمد رفیع سوداؔ (۱۷۸۱-۱۷۱۳ء) تھا۔ شاہ حاتم کے شاگرد عزیز تھے۔ اس کے علاوہ دیگر اہل علم سے بھی خوب کسب فیض اٹھایا۔ سوداؔ نے شعری اصناف کے اکثر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی زیادہ تر پہچان قصیدے سے ہے۔ ان کا واسطہ زیادہ تر درباروں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دہلی میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں سے دہلی تارتار ہوگئی تو اس نے بھی دہلی کو خیر آباد کہہ کر آصف الدولہ کے دربار یعنی لکھنؤ کوچ کر گئے۔ انہوں نے قصیدے میں فارسی شعراء کی تتبع کی اور ایسی زبان میں شاعری کی جو ابھی ترقی یافتہ بھی نہیں تھی۔ تابع اور متبوع ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سوداؔ نے شاعری کو بلند مقام عطا کیا۔ خاص طور پر قصیدے کو فارسی قصیدے کے ہم پلہ لاکھڑا کیا۔ قصیدے کے علاوہ انہوں نے غزل، مثنوی،

مرثیہ، رباعی، واسوخت اور ہجو وغیرہ میں بلند، لطیف اور عمدہ خیالات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کا یہ شعر:

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب　　　ان کی خدمت میں لیے یہ غزل جاؤں گا گا گا

اردو ادب کی تاریخ میں آج تک ان جیسا قصیدہ گو پیدا نہیں ہوا۔یہی اردو قصیدہ کے باوا آدم قرار پاتے ہیں۔لیکن ان کے دیگر اصناف میں عمدہ خیالات کی عکاسی تو خوب ہے، پر ان کے ان خیالات میں وہ رنگینی، شوخی، وسیع پن اور غزل کی اصل دنیا سے محروم نظر آتی ہے۔اس کی جگہ پر سودا نے اپنے زبان و بیان پر بھرپور توجہ دی اور کیوں نہ دیتے اس زمانے میں یہ زمانے کا تقاضہ تھا۔سودا کو زندہ رکھنے والے اصناف میں ایک شہر آشوب بھی ہے۔سودا کے بعد اہم شاعر خواجہ میر دردؔ ہیں۔

خواجہ میر دردؔ (۱۷۸۵۔۱۷۲۱ء) اردو کے اہم صوفی شاعر تھے۔وہ اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے۔انتیس سال کی عمر میں والد خواجہ محمد ناصر عندلیب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تصوف کی دنیا میں قدم رکھا اور اپنی پوری زندگی اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ان کے عہد میں فارسی کا چلن تھا اسی مناسبت سے انہوں نے تصوف کے حوالہ سے بہت ساری کتابیں فارسی زبان میں لکھی ہیں۔فن موسیقی کے بہت بڑے استاد مانے جاتے ہیں۔جب دلّی پر تباہی کی گاج گری تو ہر شاعر و ادیب یہاں تک کہ میر و سودا بھی اس دردناک تباہی کو برداشت نہ کر سکے اور لکھنؤ وغیر کی جانب کوچ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ایسی صورت حال میں میر درد نے دلّی کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی چوکھٹ پر جمے رہے۔دلّی کی تباہی کی داستان ان کی شاعری میں جا بجا موجود ہے۔ان کا زیادہ تر کلام غزل پر محیط ہے۔جس میں تصوف کے احوال و نظریات اور آسان زبان کا پیش خیمہ ہے۔ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دلّی کی زبان بولتے ہیں شاعری میں آسان لب ولہجہ کا استعمال بڑی آسانی سے کرتے ہیں۔درد عشقیہ شاعری سے گریز کرتے تھے لیکن ان کی شاعری میں عشقیہ شاعری موجود ہے تو اس کا جواز یہ نکالا جاتا ہے کہ وہ تصوف کی دنیا کے عظیم فن کار تھے۔اس میں حقیقی اور مجازی کا پہلو پایا جاتا ہے۔اسی مناسبت سے ان کی شاعری میں شاعری کے تذہیبی روایت کے تحت عشقیہ شاعری کو غزل کے مجازی پہلو قرار دیتے ہیں۔

زور عاشق مزاج ہے کوئی

دردؔ کو قصہ مختصر دیکھا

کبھی خوشی بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ذکر میرا ہی ہے وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کے رات کو
عاشق تری گلی سے کئی بار ہو گیا

اس طرح ان کی شاعری میں انسانی واردات، حیرت واستعجاب کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اسی چیز سے کائنات میں انسان اپنے وجود کے حقیقی زرّوں کو تلاش کرتا ہے جس سے وہ دیدہ و بینا حاصل کرتے ہوئے معارف الٰہی اور مشاہدہ حق کے ذریعہ صوفیانہ تجربات اور عملی اقدامات میں سرگرداں رہتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اہم اور سب سے بڑے شاعر میر محمد تقی میرؔ (۱۸۱۰-۱۷۲۲ء) تھے۔ میرؔ اپنی ابتدائی زندگی بڑی کشمکش کے عالم میں گزاری ہے۔ ان کے والد علی متقی بڑے تقوی اور پرہیزگار انسان تھے۔ لفظ ''عشق'' سے بڑا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اخیر ایام میں باطنی اسرار کو محمد تقی میر کے سینے میں اتارنا چاہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ:

''بیٹا عشق کیا کرو۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے۔ عشق ہی کندن کر دیتا ہے۔''[۳]

والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں آگرہ سے دہلی آیا۔ یہاں محمد شاہ کی حکومت تھی۔ ہر طرف عیش ونشاط کی خوشبوئیں پھیل رہی تھیں۔ سلطنت دہلی صوفیوں کی آماجگاہ شروع ہی سے رہی ہے۔ اس وقت ان کی خانقاہوں سے ''ھوحق'' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ادھر میر محمد تقی تلاش روزگار میں سرگرداں تھے۔ بلاآخر ان کے والد کے شناسا امیر الآمر صمصام الدولہ تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے یومیہ ایک روپے مقرر کیا۔ یہ رقم ان کو ملتی رہی اس بیچ محمد تقی آگرہ واپس ہو گئے اور ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے میں ان کے مربی صمصام الدولہ زخمی ہو کر انتقال کر گئے۔ نان و نفقہ کی یہ صورت بھی ختم ہو گئی۔ پھر سے میر محمد تقی نے دہلی کی جانب رفت سفر باندھا اور نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کو اجڑتا دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اپنے سوتیلے

ماموں سراج الدین علی خان آرزو جو فارسی کے بہت بڑے عالم اور شاعر تھے ان کے اردگرد شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ کبھی کبھی ریختہ میں شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن معیوب نظروں سے اس زبان کو دیکھتے تھے۔ میر نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ماموں کے یہاں قیام کرنا مناسب سمجھا اور اس طرح یہ اندازہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں کے میر نے بھی اپنے ماموں خان آرزو سے کسب فیض اٹھایا ہو۔ یہاں سے میر کی نئی دنیا آباد ہونی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری کے چرچے ہر عام وخاص کی زبان پر تھے۔

میر کی شاعری میں زمانے کی تمام ناہمواریاں موجود ہیں۔انہوں نے دہلی کی سلطنت کو اپنی آنکھوں سے مٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہاں کی تباہ کاریاں نظروں کے سامنے ہیں۔زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ کو برتا ہے۔جس سے ان کی شاعری ہر ایک کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کے دلدوز اور دلچسپ تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس عہد کے حالات وواقعات کو اگر تاریخ سے ہٹ کر شاعری کی دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں تو میر کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے جس میں زمانے کی کروٹ لیتی ہوئی تصویریں، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی داستان، سلطنت کے زوال کے اسباب کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''میرؔ آج تک غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ان کے شعر تیر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزا اور اتنی مٹھاس اور اتنی تلخی دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری اور جذبات کا اتنا طوفانی جوش تخلیق شعر کامیاب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے پُر اثر مرثئے بھی کہے ہیں مگر ان میں غزلوں کی المناک بنانہیں ہے۔اسی طرح انہوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ان کا معیار محبت واضح نہیں ہے۔مگر بادشاہ وہ غزل ہی کے ہیں۔''[۹]

میرؔ نے دوران قیام دہلی میں بہت ہی کم آسودگی،خوش حالی دیکھی بلکہ ہمیشہ تنگ دستی کے شکار رہے۔وہ ذکر میرؔ میں اپنے فقیرانہ زندگی کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

تین سال سے فقیر کا یہ حال ہے کہ کوئی قدر دان تو درمیان میں ہے نہیں
اور زمانہ سخت تنگ ہو چکا ہے۔ خدائے کریم پر توکل کر کے جو رزق
دینے والا اور قوت و اقتدار والا ہے۔ گھر میں پڑا ہوں۔ کبھی ایسا بھی
اتفاق ہو جاتا ہے کہ کوئی مجھے فقیر یا شاعر یا متوکل جان کر کچھ بطریق
نذر بھیج دیتا ہے۔ اکثر قرض دار رہتا ہوں اور نہایت عسرت میں زندگی
گذار رہا ہوں۔"۵

اس طرح کی حالت سے پریشان ہو کر غیبی مدد کے طور پر لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے دربار سے ایک خط موصول ہوا۔ میر نے معاشی تنگ دستی سے چھٹکارا پانے کے لئے فوراً زادِ سفر کی تیار کی اور ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ کوچ کر گئے۔ گر چہ شہران کو راس نہ آیا لیکن مالی سکون نے ان کو سکون کی نیند عطا کی۔ اس طرح میر نے اپنی زندگی جی اور شاعری کے ذریعے ان تمام احوال و کوائف کو بیان کیا جو ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کریں:

کیا شہر میں گنجائش مجھے بے سروپا کو ہو — اب بڑھ گئے ہیں میرے اسبابِ کم اسبابی
کیا کروں شرح خستہ جانی کی — میں نے مر مر کے زندگانی کا
اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے — پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابہ
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو! یہ بستی اجاڑ کے
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

یا پھر لکھنوی زندگی کے حوالے سے:

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا — وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگوغم یار میں — نہ فراغ ہے کہ فقیروں سے ملیں جا کے دلّی دیار میں
لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا اداس — میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

اس طرح اٹھارویں صدی اردو شاعری کے لئے اہم ہے کہ اس میں اردو کی جڑیں خوب مضبوط ہوئیں۔ دلّی کی گلیوں میں میرؔ، دردؔ، سوداؔ کے علاوہ قائمؔ چاند پوری، میر سوزؔ اور میر اثرؔ وغیرہ نے شاعری کو پروان چڑھایا تو دوسری جانب دلّی کی تباہ کاری کے بعد لکھنؤ کی سرزمین تہذیب کا مرکز بن

چکی تھی جس کو بڑھاوا دینے میں لکھنوی شعرا بھی اپنی پہچان بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے جس میں وہ شعرا بھر پور کامیاب ہوئے۔ان میں میرؔ حسن (۱۷۸۶۔۱۷۴۱ء) غلام ہمدانی مصحفیؔ (۱۸۲۴۔۱۷۴۸ء) انشااللہ خاں انشاء (۱۸۱۸۔۱۷۵۶ء) قلندر بخش جرأت (۱۸۰۹۔۱۷۴۹ء) اور سعادت یار خاں رنگینؔ (۱۸۳۵۔۱۷۷۵ء) وغیرہ ایسے شعرا ہیں جن کی شاعری میں لکھنوی زندگی کی جھلک،خوشحالی رندومستی اور واہ کی لہر پائی جاتی ہے۔ یہ تمام شعراء زندگی کے مسائل کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرر ہے تھے لیکن پیچیدہ مسائل یا سنجیدہ امور کو گہرائی کے ساتھ نہ لے کر رواروی میں بیان کرنا پسند کرتے تھے۔

اس صدی میں نثر کے حوالے سے بھی کافی اہم کاوشیں ہوئی ہیں۔ فارسی داں طبقے میں سے کچھ ذی شعور اور مستقبل کے ذی شناس مصنفوں نے اردو میں قدم رکھا اور محمد شاہ کے عہد میں اردو کی سب سے پہلی کتاب فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' (۱۷۳۱ء) قرار دی گئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب ''روضتہ الشہدا'' کو محرم کی مجلسوں میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ پڑھی جاتی تھی لیکن بہت سے لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی اس لئے اس کتاب کو فضلی نے بڑی آسان اردو زبان (ریختہ) میں ترجمہ کیا۔۱۷۷۵ء میں میر عطا حسین خاں نے ایک فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' مصنف معصوم کی کتاب کو ''نوطرز مرصع'' کے عنوان سے اس کا بہترین ترجمہ کیا۔اٹھارویں صدی کے اختتام پر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر جو شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے تھے انہوں نے بالترتیب ۱۷۶۶ء اور ۱۷۹۰ء میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ یہ تراجم وقت کی ضرورت کے تحت یعنی جو لوگ فارسی یا عربی نہیں جانتے تھے ان کے سمجھنے کے لئے یہ تراجم کئے گئے۔اپنے وقت میں یہ تراجم کافی مشہور ہوئے اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔اٹھارویں صدی میں اس کے علاوہ بہت سارے تراجم ہوئے اس مختصر سے مقالے میں ہر ایک کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔

میرے مقالے کا پہلا باب کا عنوان ''۱۸۵۷ء اور اردو'' ہے جو انیسویں صدی پر محیط ہے۔ابھی تک بہت ہی اختصار کے ساتھ اردو زبان کی ترویج اور اٹھارویں صدی میں یہ زبان پختگی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اصل موضوع پر آتے ہوئے اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہوں تا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد میں اردو کی صورت حال پر تفصیلی جائزہ لے سکوں۔

۱)   ۱۸۵۷ء سے قبل اردو کی صورت حال

۲)   ۱۸۵۷ء کے بعد اردو کا فروغ

۱۸۵۷ء سے قبل اردو کی صورت حال:

تاریخ کے آئینہ میں انیسویں صدی کا ہندوستان سیاسی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی اعتبار سے کافی تبدیلی کا زمانہ ہے۔ اس صدی کے آنے سے قبل ملک کے اکثر حصے پر انگریزوں کے اقتدار کا سایہ منڈلانے لگا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کے بادشاہوں میں وہ دم خم نہ تھا بلکہ عیش پرستی اور سلطنت کی ہوس نے ان کی حکومت کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس موقع کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔ جبکہ یہ انگریز ہندوستان میں بغرض تجارت آئے تھے۔ تجارت کی آڑ میں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور ہندوستان میں خوب تجارت کی۔ ملک کے حالات اور شاہوں کے عیاشانہ زندگی پر ان کی نظر تھی اور وہ اس بات کو سمجھنے میں دیر نہ کی کہ ملک ہندوستان میں حکومت کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ملک کے ہر حصے میں بادشاہ، راجا، مہاراجہ، نواب اور سرمایہ دار طبقہ ایک دوسرے کے خلاف ہر وقت متصادم اور محاذ آرا تھا۔ یا پھر شراب اور شباب کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے۔ مغلوں کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ انیسویں صدی کے آتے آتے انگریز ملک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو چکے تھے۔ مغل شہنشاہ شاہ عالم کی حکومت از دہلی تا پالم رہ گئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت، نظام حیدر آباد کمپنی کے زیر اثر، جنوب کا اکثر حصہ ان کے قبضے میں آچکا تھا۔ باقی صوبے بھی کسی نہ کسی صورت میں ان کے ماتحت تھے۔ شاہ عالم نے بہار اور بنگال کی مال گذاری وصول کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا تھا۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کی حالت کتنی خراب ہو چکی تھی۔ اب انگریزوں پر لازم تھا کہ وہ یہاں کی زبان، تہذیب اور ان کے رہن سہن کے طور طریقے سیکھے اس کے لئے ان کو ایک بڑے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں ان کے کارندوں کی تربیت ہو سکے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی کمپنی سے اب حاکم وقت کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اسے والیان ریاست، مقبوضہ مقامات کی نگہبانی اور ان مقامات کے لوگوں سے عوامی رابطہ قائم کرنے کے لئے ہندوستانی زبان کا جاننا ان کے لئے از حد ضروری ہو گیا تھا۔ گرچہ سرکاری زبان فارسی تھی اور ابتدائی دور میں انگریزوں نے بھی

سرکاری زبان کے طور پر فارسی کو چنا اور مشرقی علوم سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف میں بنگال میں ''کلکتہ مدرسہ'' اور ''ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے ذریعہ مشرقی علوم وفنون سے رغبت پیدا کرنے کے لئے از حد ضروری قرار دیا۔ اس درمیان یورپ کے کچھ علماء نے اردو کی طرف دھیان دیا۔ سب سے پہلے ڈچ جوشنوا کیٹلر نے ۱۷۱۵ء میں ہندوستانی زبان (اردو) میں چند صفحوں کی قواعد لکھی۔ پادری شلز نے ۱۷۴۴ء میں اردو کی قواعد لکھی اور انجیل کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ دیگر مصنفین نے بھی جس میں مل بیلی گائی، ڈف اور ہیڈلے وغیرہ نے بھی لکھا لیکن ان میں ایک اہم نام گلکرسٹ کا بھی ہے۔ انہوں نے ۱۷۸۵ء میں اردو قواعد اور لغات کے حوالہ سے خوب کام کیا۔ غرض انگریز ایسی زبان کے خواہش ہند تھے جو عوام میں مقبول ہو اور ایک دوسرے کو بآسانی سمجھ اور سمجھا سکیں اور وہ زبان ہندوستانی تھی جس میں کئی زبانوں کا مرقع تھا۔ جیسے آج ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ ولزلی ۱۷۹۸ء میں ہندوستان آیا تو اس وقت کمپنی ایک بہت بڑی طاقت بن کر ابھر چکی تھی۔ اس کے زیر اثر کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا۔ اس کالج کے قیام کا منشا کمپنی اپنے تجارتی کردار سے نکل کر جامع حکمرانی کی منزل کی طرف گامزن تھی جسے وہ ''امپائر'' کا نام دینے لگے تھے۔ کالج کے قیام کی وجہ اور اس کے مقاصد کے پیش نظر ولزلی نے کمپنی کے ڈائرکٹران کے لئے ایک طویل مضمون نوٹ کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ:

> ''کسی کلکٹر مال گذاری کے لئے یا اس کے ماتحت ملازم کے لئے ممکن نہیں کہ اپنے فرائض عام عدل وانصاف کے تقاضوں کے ساتھ انجام دے سکے، چاہے وہ فرائض مملکت سے تعلق رکھتے ہوں یا عام لوگوں سے، تاوقتیکہ وہ ملک کی زبان سے، طور طریقوں سے اور رسم و رواج سے واقفیت نہ رکھتا ہو اور قانون کے ان اصولوں کو نہ جانتا ہو جو انصاف کی مختلف عدالتوں میں برتے جاتے ہیں...''
>
> ہندوستان کے لوگوں کے طور طریقوں، رسم و رواج، زبانوں اور تاریخ سے گہری واقفیت اور اس کے ساتھ قانون محمدی اور ہندو قوانین و مذاہب اور ایشاء میں برطانیہ عظمیٰ کے سیاسی وتجارتی مفادات کے

تعلقات و مطالعے کا اضافہ کرنا چاہئے۔انہیں برطانوی آئین کے
سچے محکم اصولوں کا علم ہونا چاہئے اور اخلاقیات کے عام قاعدوں،
سول قانون کا فلسفہ، قانون اقوام اور تاریخ عمومی سے بھی کافی واقفیت
ہونی چاہئے۔'' [۶]

اس کالج کے ذریعے انگریزوں کے درس و تدریس یا زبانوں کے تبادلے کا ہی مقصد نہیں تھا بلکہ کالج کو اکیڈمک شکل دینا بھی منظور تھا اور فورٹ ولیم کالج برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان میں پہلی سول سروس اکیڈمی تھی۔ یہاں شہری انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کی تربیت گاہ بھی تھی۔اس کالج کا قیام ۴رمئی ۱۸۰۰ء کو کلکتے میں ہوا۔

یہاں یہ بھی عرض کرتی چلوں کہ فورٹ ولیم کالج سے قبل گل کرسٹ اور ولزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نئے انگریزی حکمراں جو ہندوستانی زبان سے ناواقف تھے ان کے لئے ہندوستانی زبان سکھانے کی تجربہ گاہ ''گل کرسٹ کی اورینٹل سمینری (Oriental Seminary) کھول رکھی تھی۔ گورنر ولزلی نے ۳رجنوری ۱۷۹۹ء میں تمام سرکاری افسروں کو مقامی زبان سیکھنا لازمی قرار دیا تھا اور جونیئر سول ملازمین کے لئے گل کرسٹ اورینٹل سیمنری کے درس میں شرکت کرنا تھا۔ یہ بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ''گل کرسٹ اورینٹل سیمنری'' فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی ماڈل کا حصہ تھا۔ بعد میں ضرورت کے پیش نظر بڑے پیمانے پر اسے انگریز حکمرانوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے کے لئے فورٹ ولیم کالج کا قیام ۴رمئی ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا۔

اس کالج کے قیام کے پیچھے بہت سارے اغراض و مقاصد پوشیدہ ہیں۔ ہم ان طویل مباحث میں نہ جاتے ہوئے اس کے ایک پہلو جو ہمارے مقالے کے زیرِعنوان فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت نثر کے حوالے سے کافی اہم ہے۔اس کالج میں ہندوستانی زبانوں کا ادبی مرکز قائم ہوا۔ گلکرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے بعد میں ولزلی نے ان کی ہندوستانی زبانوں کے تئیں دلچسپی اور متعدد اردو زبان کی کتابوں کے مصنف (انگریزی ہندوستانی ڈکشنری، ۱۷۹۰ء، ہندوستانی گرامر ۱۷۹۶ء، اورینٹل لنگوئسٹ ۱۷۹۸ء، قصص مشرق ۱۸۰۳ء، قواعد اردو، رہنمائے اردو زبان ۱۸۰۴ء، انگریزی بول چال ۱۸۲۰ء وغیرہ) ہونے کے ان کو اس کالج میں

ہندوستانی زبانوں کا استاذ اوراسی شعبہ کا سر پرست مقرر کیا تا کہ ان کی نگرانی میں یہ کام ہو سکے۔ گلکرسٹ نے دوران درس وتدریس یہ محسوس کیا کہ درس کی کتابوں میں شاعری جو مذہبی معاملات پر معمور ہے اس وقت ہندوستان میں فارسی زبان کا غلبہ اور سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ جس کے باعث گلکرسٹ نے درس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا شعبہ بھی قائم کیا۔ انہوں نے ملک کے کونے کونے سے ماہر ادیب کو تصنیف وتالیف کے لئے جمع کیا تا کہ منفرد اور یکتا کتابوں کا ترجمہ سلیس اور آسان زبان میں کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں، برہمن للولال جی، امانت اللہ وغیرہ کا انتخاب کیا ہے۔

''چہار درویش'' جو امیر خسرو سے منسوب ہے، لیکن آج تک اس کی تحقیق نہ ہوسکی کہ یہ کتاب خسرو کی ہے یا کسی اور کی، لیکن اس زمانے میں اس کتاب کی بڑی دھوم تھی۔ اسی وجہ سے میر امن نے اس فارسی کتاب کا ترجمہ ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں کیا ہے۔ میر عطا حسین خان تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' ان کے زیر نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کا طرز اسلوب جدا جدا ہے لیکن کہیں کہیں تتبع کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب اردو ادب میں کافی اہم مانی جاتی ہے۔ ہر یونیورسٹی اور کالج کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔ ان کی دوسری تصنیف ''گنج خوبی'' ہے جو فارسی کی کتاب ''اخلاق محسنی'' کا ترجمہ ہے۔

حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں قصہ مہر و ماہ ہفت پیکر، لیلیٰ مجنوں، تاریخ نادری کے علاوہ ان کی مشہور و معروف کتابیں جس سے ان کی پہچان بنی۔ ان میں گلشن ہند، طوطی کہانی، آرائش محفل اور گل مغفرت کافی اہم تصنیف ہیں۔ آرائش محفل میں عرب کے سخی حاتم طائی کے سات سفری خیالی کہانی پر مبنی واقعہ ہے۔ حیدری سے قبل اس کتاب کو دکنی اردو میں محمد قادری نے طوطی کے نام کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کو موضوع بناتے ہوئے حیدری نے آسان اور سہل ہندوستانی زبان میں لکھا۔

مرزا علی لطف دہلی کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش لئے لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ کا سفر کیا۔ کلکتہ میں جان گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسا تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی جس میں اردو

شاعروں کا مختصر اور جامع احوال و کوائف آجائے۔ لطف کی نظر میں فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' مصنف علی ابراہیم کی تھی۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے بہترین اردو کا تذکرہ ''گلشن ہند'' کے نام سے لکھ دیا۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب فورٹ ولیم سے شائع نہ ہوسکی اور بعد میں اس کا مسودہ گم ہوجانے کی وجہ سے چھپ نہ سکی۔ لیکن بہت بعد میں بہتے دریا میں یہ کتاب کسی صاحب ذوق کو ملی۔ انہوں نے ۱۹۰۶ء میں اس قلمی نسخہ کو شائع کرایا۔

میر شمشیر علی افسوس ایک نامی گرامی مصنف، ہندوستان کی ادبی محفلوں کا روشن ستارہ تھے۔ گلکرسٹ سے ملاقات کے بعد انہوں نے دو فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان میں ایک شیخ سعدی کی مشہور کتاب ''گلستان'' کا اردو ترجمہ ''آرائش محفل'' کے نام سے کیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنف مظہر علی خاں ولا دلّی کے باشندہ تھے۔ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ گلکرسٹ نے ان کی زبان دانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کتابوں کا ترجمہ کروایا۔ ان میں بے تال پچیسی، مادھونل، کام کنڈلا اور تاریخ شیر شاہی وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سارے مصنفین ایسے ہیں جنہوں نے کالج کے لئے بہترین کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو آج بھی قابل تقلید اور قابل اشاعت ہے۔ مرزا کاظم علی جو بذات خود کالج کے ملازم تھے۔ انہوں نے کالی داس کی کتاب ''ابھگیان شاکنتلم'' کا ترجمہ ''شکنتلا ناٹک'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ کتاب ڈرامے کے انداز میں نہیں لکھی گئی ہے لیکن اس کے باوجود کچھ نقادوں نے اسے ڈرامے کی پہلی کتاب گردان دیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ نہال چند لاہوری بھی اس کالج کے مصنف تھے۔ انہوں نے عزت اللہ بنگالی کی کتاب ''گل بکاؤلی'' جو فارسی زبان میں تھی اور ہندوستانی لوک کتھاؤں میں بڑی شہرت رکھتی تھی۔ نہال نے سلیس اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس کا نام ''مذہب عشق'' رکھا۔ اسی کتاب کو پنڈت دیاشنکر نسیم نے اپنی کتاب ''گلزار نسیم'' کا موضوع بنایا اور مثنوی کی شکل میں شاہکار تصنیف چھوڑی۔ بنی نرائن جہان نے گل کرسٹ کے جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں قدم رکھا اور دو کتابوں کو ترتیب دیا۔ ان میں ایک ''چار گلشن'' اور دوسری ''دیوان جہان'' کے نام سے ہے۔ دیوان جہان شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کو جمع کیا تو اسی دیوان میں انہوں نے اپنے کلام کو بھی شامل کیا ہے جس سے انہوں نے ''دیوان جہان'' اپنے

نام سے منسوب کر کے اس دیوان کا نام رکھا ہے۔ گجرات کے ایک اہم مصنف جسے جدید ہندی نثر کا بانی بھی کہا جاتا ہے ان کا نام للو لال جی ہے۔ کالج میں ہندی کتابوں کے لئے ان کو مقرر کیا گیا تھا۔انہوں نے کئی اہم ہندی کتابیں کالج کو دی ہیں۔ پریم ساگر، راج نین اور دیگر کتابیں تحریر کیں۔ ان کی ہندی اردو سے ملتی جلتی تھی جو کھڑی بولی سے لی گئی تھی۔للو لال جی اردو زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔انہوں نے بعد میں کاظم علی جوان کے ساتھ مل کر اردو میں سنگھاسن بتیسی لکھی بعد میں ہندی میں بھی چھپ چکی تھی۔

اس طرح فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کی آبیاری اور ملک کے کونے کونے سے مصنفوں کو جمع کرنے میں بہت کوشش کی۔ مذکورہ مصنفوں کے علاوہ اور بھی کئی مصنفین نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان میں امانت اللہ شیدا، حفیظ الدین، مرزا جان تپش، اکرم علی، خلیل علی اشک، تارنی چرن مشرا وغیرہ ایسے عالم وفاضل ادیبوں کو جمع کیا جس سے ہندوستانی ادب میں نثری مواد کی خوب فراہمی نصیب ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ کالج کا قیام بدیسیوں کے لئے تھا۔ان ہی کی زبان دانی، تربیت اور اصلاح کے لئے اس قسم کی کتابیں لکھوائی گئیں تا کہ بآسانی وہ اردو زبان یا ہندوستانی زبان سیکھ جائیں۔ان تمام کاوشوں کا سہرا گل کرسٹ کے سر جاتا ہے جنہوں نے ہر محاذ پر اپنی قربانی دی اور کالج کے ہندوستانی شعبہ میں جہاں مشرقی علوم اور ادب پر بھرپور توجہ دی۔ تمام مصنفوں سے اہم کتابوں کا ترجمہ سلیس زبان میں کروایا جو قابل رشک اور فرض منصبی کو نبھانے کا حق ادا کیا۔محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج کے قیام جولائی ۱۸۰۰ء سے لے کر فروری ۱۸۰۴ء تک کالج کونسل کی رکاوٹوں، مایوسیوں اور حوصلہ افزائی کے بغیر اپنے فرائض منصبی بڑی تن دہی سے ادا کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے نہایت محنت سے ہندوستان کے ادیبوں سے جدید دور کے تقاضوں کے بہ موجب اردو نثر کی کتابیں تیار کروائیں۔ کالج کونسل سے لڑ جھگڑ کر ان کتب کی اشاعت کا بندوبست کیا مگر بیشتر کتب اپنے ذاتی مصارف سے شائع کیں۔۱۸۰۴ء تک شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ جدید اردو نثر کی کتابوں کا

> ایک قابل قدر ذخیرہ گل کرسٹ کی سعی پیہم سے فراہم ہوگیا تھااور اس ذخیرہ میں اردو نثر کا لازوال داستان ''باغ و بہار'' بھی شامل تھی۔ ''باغ و بہار'' کی اشاعت کوفورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم اشاعتی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران میں گل کرسٹ کی کوششوں سے ساٹھ کے قریب کتابیں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔''[7]

فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام کلاسیکی ادب میں نئے تجربے کی راہ ہموار ہوئی۔ داستانی ادب کے ترجموں نے داستانی اسلوب کے دروازے کھول دیئے۔ مستقبل کے داستان نگاروں کے سامنے''باغ و بہار'' ''طوطا کہانی''،'' آرائش محفل'' وغیرہ جیسی داستانوں کے اسلوب اور اس کے داخلی فضا سے فیضیاب ہونے کے امکانات روشن کر دیئے۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج کو'' اردو نثر کا جزیرہ'' کہنا بجا ہوگا۔ پروفیسر وقار عظیم اس کالج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو میں پہلی مرتبہ ایک وسیع پیمانے پر ایک اور باضابطہ انداز میں تصنیف و تالیف کے مقابلے میں ترجمے کی اہمیت واضح ہوئی اور ترجموں کی ان منظّم مساعی نے اردو نثر میں ترجمے کی ایک ایسی روایت کا آغاز کیا جس سے آگے آنے والوں نے اپنی شمعیں روشن کیں۔ اردو نثر کی تاریخ میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں انیسویں اور بیسویں صدی میں شروع کی گئیں ان سب کی زندگی میں فورٹ ولیم کالج کی اس روایت کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔''[8]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کالج کے زیر اہتمام جو کام ہو رہا تھا اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن کالج کے باہر بھی اردو نثر میں بہت کام ہو رہے تھے اور شاعر و ادیب اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ان میں محمد حسین کلیم جو شاعر اور تصوف کی دنیا کے ماہر تھے۔ انہوں نے تصوف کی مستند کتاب'' فصوص الحکم'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد بخش مہجور نے بہت ساری داستانیں جن میں ''گلشن نو بہار''، ''نورتن'' وغیرہ ان کی اہم داستان ہیں۔ انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی''اودے بھان کی کہانی ''کنور اودے'' کافی اہم مانی جاتی ہیں۔ مولوی اسمٰعیل جو وہابی تحریک کے عظیم رہنما تھے۔

ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔مسلمانوں کے اندر حرارت ایمانی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ''تقویت الایمان'' لکھی جو اپنے وقت اور حالات کے اعتبار سے کافی اہم تھی۔اس کے علاوہ اور بھی کتابیں اور رسائل و جرائد ہیں جو اردو نثر کی ترویج میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

لکھنؤ کی سرزمین سے ایک اہم نام جو اردو نثر میں اپنی پہچان ثبت کر دی ہے۔ان کا نام مرزا رجب علی بیگ سرور ہے۔جن کی تخلیق لازوال ہے۔اس لازوال تخلیق کا نام ''فسانۂ عجائب'' ہے جو ۱۸۲۴ء میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں غیر فطری اثرات کوٹ کوٹ کر بھرے پڑے ہیں۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے اس میں پدماوت اور الف لیلیٰ کے اثرات کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب لکھنوی تہذیب کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے جو کتاب کی اہمیت اور لکھنوی تہذیب کی زندہ مثال ہے۔اس کے علاوہ ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی جانے والی کتاب ''سرور سلطان'' شرر عشق'' جو ۱۸۵۶ء میں چڑیوں کی محبت پر مبنی کتاب ہے سرور نے ان کتابوں کے علاوہ ''شگوفہ محبت'' ''انشائے سرور'' اور ''شبستان سرور'' بھی تحریر کی ہیں۔اسی زمانے میں فقیر محمد گویا جو شاہی فوج میں رسالدار تھے اور شاعری میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔۱۸۳۶ء میں انہوں نے فارسی کی مشہور کتاب ''انوار سہیلی'' کا اردو میں ترجمہ ''بستان حکمت'' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی دیگر مصنفین ہیں جنہوں نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اردو نثر کی خدمات انجام دی ہیں۔فارسی کی بہت ساری کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ کیونکہ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ فارسی اپنی وجودیت کھو رہی تھی اور اردو یا ہندوستانی زبان پروان چڑھ رہی تھی۔

۱۸۵۷ء سے قبل اردو ترقی کی منازل طے کرنے میں کوشاں تھی۔اس کے چاہنے والوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔خاص طور پر ہندوستانی زبان (اردو) کی ضرورت ان انگریز حکمرانوں اور ان کے عملے کے لئے انتہائی ضروری تھی۔انگریز ہندوستان کے وسیع و عریض رقبے پر قابض ہوتے جارہے تھے۔ان وسیع مقبوضات پر حکومت کرنے کے لئے تربیت یافتہ ہندوستانی زبان سے واقفیت، یہاں کی تہذیب و ثقافت، سے گہری وابستگی سے لبریز عملہ کے ایک بڑے طبقے کی ضرورت محسوس ہوئی۔تاکہ نئی انتظامی امور کو بہتر انداز میں نبھایا جاسکے۔

اس مقصد کے تحت ۱۸۲۵ء میں دلّی کے قلب شہر میں ایک ایسا کالج کا قیام عمل میں آیا جو

ان تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اس کالج کے مکمل مقاصد بیان کرنا یہاں مشکل ہے البتہ میرے موضوع کے مطابق ۱۸۵۷ء سے قبل اردو کی صورت حال اور اس کی آبیاری کو موضوع بناتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ دلّی کالج میں علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم کی تعلیم بھی زبان اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت ضروری ہے کہ سائنسی علوم کی تدریسی مواد اردو میں نہ کے برابر تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کالج نے ''دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم کی۔ اس سوسائٹی کے تحت جدید سائنسی علوم کے ترجمے کروانا تھا۔ سائنسی علوم کی جن کتابوں کے ترجمے اردو میں ہوئے اس کی فہرست مولوی عبدالحق ''مرحوم دلّی کالج'' میں بیان کی ہیں۔ دلّی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی شمالی ہندوستان میں اردو زبان کے ترجموں کا مرکز بن کر ابھری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی طلباء کے لئے یہ زبان اور زبانوں کے مقابلے زیادہ احسن تھی۔ کیونکہ فروغ علم میں یہ زبان بہتر کردار ادا کر سکتی تھی۔ اس لئے ہندوستانی علما نے مغربی علوم، جدید سائنس کے ترجموں کی ترجمانی کی۔ اسی وجہ سے اس سوسائٹی کی ضرورت محسوس کی اور قیام عمل میں آیا۔ ماسٹر رام چندر اردو کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

> ''واضح ہو کہ زبان اردو ایسی ہے کہ بہت دور سمجھی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہی زبان بآسانی تحصیل ہو سکتی ہے جس کے سمجھنے میں چنداں مشکل نہ ہو۔ اب اگر غور سے دیکھو تو دریافت ہوگا کہ حیدرآباد دکن سے لگا کے سرحد نیپال اور دریائے اٹک تک اور شہر صورت (کذا) سے شہر پٹنہ تک زبان اردو یعنی وہ زبان جو دہلی میں لوگ بولتے ہیں، سمجھی جاتی ہے۔ سوائے اردو کے کوئی ایسی زبان ہندوستان میں نہیں ہے جس کا اس قدر زیادتی سے رواج ہو۔ مثلاً بنگالی زبان سوائے ملک بنگالہ کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی۔ کشمیری زبان سوائے ضلع کشمیر کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی ۔..... لیکن اردو زبان بہت جائے سمجھی جاتی ہے۔ حیدرآباد اور ناگپور اور لکھنؤ اور پٹنہ اور لاہور اور بہاولپور میں جو مختلف اضلاع ہندوستان میں فاصلوں بعید پر واقع ہیں، زبان اردو سمجھی جاتی ہے۔ پس اگر اس زبان کی وساطت سے علوم شیوع ہوں ا

وررواج پاویں تو حقیقت میں خلقت ہند کو بہت فائدہ ہے۔''۹

کالج کے طلباء اور اساتذہ نئے علمی فضا سے خوب فیضیاب ہو رہے تھے اور ذہنی ترقی ونشو و نما میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ادبی نشونما کا چراغ روشن ہوا تھا تو دہلی اور شمالی ہند میں دلّی کالج کے ذریعے سائنسی علوم وفنون کا مرکز بن کر ابھر رہا تھا۔ اس کالج کے ذریعے مشرقی علوم اور مغربی جدید سائنسی علوم کے سنگم سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مولوی عبدالحق نے بجا لکھا ہے کہ:

''یہی وہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغرب اور مشرق کا سنگم قائم ہوا تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق ومغرب کے علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔''۱۰

دلّی کالج کی اہمیت وافادیت کا کوئی منکر نہیں۔ اس کالج کا تعلیمی معیار بھی بہت بلند تھا۔ کتابوں کے تراجم سے بہت فائدے ہوئے۔ ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعہ سوا سو کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ان میں ہر طرح کی کتابیں تھیں۔ جیسے رمائین، مہابھارت، شکنتلا، دھرم شاستر، لیلاوتی، رگھونش کے ترجمے ہوئے۔ تاریخ میں ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ملکوں کی تاریخ پر کام ہوا۔ ادب میں میر، درد، سودا، جرأت وغیرہ کے کلام اور دیوان کی اشاعت اس سوسائٹی کے تحت عمل میں آئی۔ سائنس کے میدان میں جغرافیہ، عمرانیات اور دیگر شعبوں میں کہانی، شعراء کے تذکرے۔ سفر نامے، سوانح عمری، مذہبی کتابوں کے تراجم بھی عمل میں آئے ہیں۔ تراجم کرنے والوں میں ایودھیا پرشاد، شیتل پرشاد، دھرم نارائین، وزیر علی، محمد احسن، رام چندر اور غلام علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دلّی کالج کے طلبا میں رام چندر، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، پیارے لال آشوب، موہن لال کشمیری، میر ناصر علی، پنڈت من پھول وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ بعد میں رام چندر اسی کالج

میں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے اور آگے چل کر ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے اہم رکن کی حیثیت سے بہت کام کیا ہے۔ان کی اہم کتابوں میں عجائب روزگار اور تذکرہ الکاملین ہے۔انہوں نے ''فوائدالناضرین'' اور ''محبّ ہند'' کے نام سے رسالے بھی جاری کیے۔

دبستان لکھنؤ کی مختصر ادبی جھلک:

۱۸۵۷ء سے قبل لکھنوی شعر و ادب کی منفرد لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ تہذیبی و معاشرتی زندگی میں نمایاں ہوکر ابھرا تھا۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت کے حالات جوں جوں خراب ہوتے گئے یہاں کے شاعر و ادیب کی زندگی بھی بے حال ہوگئی۔ترک وطن پر مجبور ہوگئے۔کسی نے اودھ، فرخ آباد، عظیم آباد، فیض آباد، مرشد آباد اور دکن کی طرف کوچ کرنا پسند کیا۔ان دنوں دہلی کے بعد لکھنؤ علمی مرکز بنتا جارہا تھا کیونکہ آصف الدولہ (۱۷۷۵۔۱۷۷۱ء) نے فیض آباد سے اپنی سلطنت کی حکمرانی کے لئے ''اودھ'' کا انتخاب کیا اور اس سرزمین کو ہر محاذ پر سرسبز و شاداب بنایا اور مختلف فنون کی سرپرستی کی۔جس سے تہذیبی و ثقافتی رنگ و آہنگ، انفرادیت کی جانب گامزن تھی۔یہی وہ زمانہ ہے جب دہلی اپنی بربادی دیکھ رہی تھی۔یہاں پر آہ تھی تو لکھنؤ میں واہ تھی۔ابتدائی دور میں جن شعرا سے دہلی کی رونق ہوا کرتی تھی اب وہ لکھنؤ کی زینت بن گئے تھے۔ان میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ میر حسنؔ، سوداؔ، میر سوزؔ وغیرہ تھے جن کا ذکر قبل ہو چکا ہے۔یہ وہ شعراء تھے جنہوں نے اپنی شناخت اور شاعری کی چھاپ چھوڑی اور لکھنوی شاعروں نے خوشی بخوشی اسے قبول کیا۔اس کے برخلاف بعد میں جانے والے شعراء جن میں جرأتؔ، انشاءؔ مصحفیؔ اور رنگینؔ وغیرہ ہیں یہ لوگ لکھنوی انداز فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ان شعراء کی ابتدائی زندگی دہلی میں گذری لیکن حالات خراب ہونے کے باعث لکھنؤ کوچ کر گئے۔یہیں اپنی پہچان بنائی اور عروجیت حاصل کی۔

شیخ قلندر بخش جرأت (۱۸۰۹۔۱۷۴۹ء) دہلی سے ترک وطن کر کے فیض آباد آئے اور شہرت کا پرچم بلند کیا۔جرأت عہد جوانی میں اپنی بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔فیض آباد کے بعد لکھنؤ میں سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہوئے اور اپنی شاعری کے ذریعے لکھنوی شعراء میں ممتاز مقام حاصل کیا۔اس عہد میں سلیمان شکوہ اردو کے بہت بڑے دلدادہ تھے۔کونے کونے سے آنے والے شعراء ان کے دربار کا حصہ بننا چاہتے تھے کیونکہ سلیمان شکوہ کی ہر شاعر و ادیب پر کرم فرمائی ہوتی

تھی۔ان میں مصحفی اور انشا بھی تھے۔ان تینوں کے مابین خوب معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔جرأت کا انداز ایک خاص قسم کا تھا۔ان کی شاعری میں زیادہ تر جنسی تلذذ کا پہلو ملتا ہے۔ان کی شاعری کے حوالہ سے کافی بحثیں ہوئی ہیں۔تنقید کے ابتدائی دور میں میر نے ان کے حوالہ سے کہا تھا۔''تم شعر کہنا تو نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو'' ان کا یہ جملہ ان کے مرنے کے بعد مشہور ہو گیا۔مزید اس معاملے کو طول دینے اور پھیلانے میں آزاد نے کوئی کمی نہ چھوڑی۔جبکہ ان کی شاعری میں داخلیت،سوز وگداز اور محبت کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے پڑے ہیں۔ان کی شاعری کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے کلام میں غم واندوہ کی کیفیات ملتی ہیں۔لکھنوی زندگی کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا اور بینائی ختم ہونے سے قبل تک دنیا دیکھی تھی۔نشاطیہ ماحول کا جائزہ لیا تھا۔ان تمام چیزوں کو انہوں نے شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔

ملکِ دل میرا سدا سنسان ہی رہتا ہے آہ　　　سب نگر بستے ہیں یا رب اس نگر کو کیا ہوا
کیا کیا بیان کروں دلِ غم گیں کی حالتیں　　　وحشی ہوا، دوا نہ ہوا، باؤلا ہوا

یا پھر یہ اشعار:

جنونِ عشق سے یہ حال ہے اپنا کہ ہم وحشی
کبھی ہنس دے کے روتے ہیں کبھی رو دے کے ہنستے ہیں

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

جرأت کی شاعری مختلف اصناف سے مزین ہے۔ان کی شاعری میں غزل،مثنوی،مرثیہ اور قطعات کافی پائے جاتے ہیں۔جرأت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ علم نجوم کے ماہر،موسیقی اور ستار بجانے میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔لکھنوی شاعری میں جرأت نے ایک نئے معاملہ بندی کے ساتھ قدم رکھا اور غزل کو ایک نئی جہت عطا کی۔

انشاءاللہ خاں انشا (۱۸۱۸۔۱۷۵۶ء) کا شمار شاعروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ان کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی۔نو سال کے بعد اپنے والد ماشاءاللہ کے ساتھ فیض آباد آ گئے۔یہ

حیرت کی بات ہے کہ دلّی کی تباہی و بربادی کے موقع پر دلّی کے شعراء دلّی کو ترک کرکے دوسرے محفوظ اور معاش کی تلاش میں فیض آباد، لکھنؤ اور دیگر مقامات پر جار ہے تھے لیکن انشاء اور ان کے والد فیض آباد سے دہلی آ رہے تھے۔ اس سے قبل انشاء نے شاعری شروع کر دی تھی اور فیض آباد میں شجاع الدولہ کے دربار تک ان کی رسائی تھی۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے۔ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد انشا اور ان کے والد دہلی آ گئے۔ دہلی میں انشا مرزا نجف خاں کے لشکر میں شامل ہو کر عسکری زندگی بسر کرنے لگے۔ اس درمیان ان کی شاعری موقع بموقع محفلوں اور مشاعروں میں زینت بنتی رہی۔ نجف کے انتقال کے بعد کچھ اور دن عسکری زندگی گذاری، بعد میں اس زندگی کو خیر باد کہہ کر بزم کی زندگی کو ترجیح دی۔ دہلی سلطنت کی تباہی اپنے عروج پر تھی۔ انشا نے دہلی میں رہ کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ خاص طور پر یہاں کی زبان جو ان کی گھر کی لونڈی بن گئی تھی۔ الفاظ اور محاورے ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ دہلی کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے لکھنؤ کا انتخاب کیا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ لکھنؤ کی زندگی ان کے لئے بہت ہنگامہ خیز رہی۔ سب سے پہلے وہ الماس علی خاں کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد اپنی شاعری اور غزل کے پیچ وخم سے مرزا سلیمان شکوہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد سعادت علی خاں کے دربار سے منسلک ہوئے۔ اس وقت اؔنشا کی مالی پریشانی دور ہو چکی تھی۔ اؔنشا کی سب سے بڑی خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اچھوتا اور ایسا کلام جو دوسروں کو چونکانے والا ہو اس کام کو زیادہ پسند کرتے تھے اور شاہ و گدا کو حیران و ششدر میں مبتلا کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ عوام اور نوابوں کے چہیتے بنے رہے۔ محفلوں اور مشاعروں میں چٹکلوں اور باتوں سے خوب ہنساتے تھے جس سے ہر ایک کے ہر دل عزیز بن چکے تھے۔

چھوڑتے ہیں اب کوئی دو چار بوسے بن لیے
چٹکیاں لے، گالیوں کی خواہ تو بوچھاڑ کر
ہم نہیں ڈرنے کے ان باتوں سے بارے شوق سے
اور غل کر، اور چلاّ ، اور توبہ دھاڑ کر

اؔنشا بنیادی طور پر شاعر تھے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ مثنوی، قصیدے، مرثیہ، قطعات اور منظومات وغیرہ کو خوب برتا ہے۔ ان

کے کلیات ان تمام چیزوں سے پر ہے۔ان کی شاعری میں مختلف زبانوں کا نچوڑ نظر آتا ہے۔ وہ ترکی، پشتو، کشمیری، پنجابی، عربی، مارواڑی اور فارسی زبان کا علم رکھتے تھے اور بقدر ضرورت انگریزی کا استعمال بھی کرتے تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ وہ ماہر لسانیات اور کہانی نگار کی حیثیت سے ہمیں نظر آتے ہیں۔ان کی کہانی کی کتاب ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور ''سلک گوہر بار'' اہم تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی کی اہم کتاب ''دریائے لطافت'' اور ''لطائف السعادت'' وغیرہ اہم ہیں۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی کا تعلق ہے تو وہ اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں تغزل فن اور واردات اظہار کے علاوہ ذہنی و قلبی تہہ داریاں بھی بہت زور و شور سے پائی جاتی ہیں۔ خیالات میں تازگی، بیان میں ندرت خوب دکھائی دیتی ہے۔لیکن سوز و گداز کی کمی کا احساس بار بار ہوتا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

دھم سے ہم دونوں گرے فرش پہ اس روپ کی رات
رہ گیا ان کا دوپٹہ بھی چھپرکٹ سے لپٹ

انشا اور مصحفی کے مابین خوب معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف نظر آتے ہیں۔ ہر محاذ پر آصف الدولہ کے عہد میں ان دونوں کے درمیان خوب معرکہ ہوا۔انشا اپنے علم و فضل اور زبان دانی کے باعث یہ معرکہ ان کے حق میں ہوتا۔ان معرکوں کے باعث آصف الدولہ جو مصحفی کے بہت گرویدہ تھے ان کی بے عزتی برداشت نہ ہوئی اس کے لئے انشا کو لکھنؤ سے در بدر کروا دیا۔انشا کو اس عمل سے بے حد تکلیف ہوئی۔غصہ کے عالم میں انہوں نے بحر طویل میں مصحفی کے خلاف ایک طویل نظم لکھ ڈالی جس میں انہیں بھر پیٹ گالیاں دی ہیں۔ یہ نظم تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔

اس طرح مجموعی حیثیت سے انشا کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ

انفرادیت پسند شاعر تھے۔ان کی شاعری دوسروں کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی تکنیک کی پاسداری کا غلام ہے۔انشا اپنے کلام میں ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کا حل نکالنا جانتے ہیں۔انشا نے اپنے عہد کے تمام شعراء کے مابین رہ کر غزل میں نت نئے راستے تلاش کرنے کی سعی کی۔مختلف محاذ پر مختلف اینٹیں پھوڑیں تا کہ کچھ نیا نکلے۔یہ ان کی تخلیقات کا مظہر ہے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی (۱۸۲۴۔ ۱۷۴۸ء) ایک مشہور شاعر ہیں۔ امروہہ میں پیدا ہوئے۔عہد جوانی میں دہلی آ گئے۔عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ شعروشاعری بھی کروٹیں لینے لگی۔دلّی اس زمانے میں شعر وسخن کا مرکز تھا۔مصحفی بھی مشاعروں میں شرکت کرتے اور ادبی محفلوں میں حاضری دیتے تھےلیکن وہ رونق نہ تھی جو کچھ عرصہ قبل ہوا کرتی تھی۔کیونکہ انگریز حکمراں نے دہلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔شاہ عالم ثانی بے بسی کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے۔شاعر و ادیب دوسرے وطن کی جانب رخ کر رہے تھے۔مصحفی کہتے ہیں کہ:

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشنِ دلّی میں خزاں ہے

شاعر کے کلام سے بھی تاریخی پہلو اور اس عہد کے حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی صورت حال کیا تھی۔بہر حال! مصحفی بھی دلّی کی گلیوں کو خیرآباد کہہ کر لکھنؤ کی رونق افروز محفلوں اور مشاعروں کی زینت بننے کے لئے چلے گئے۔اس وقت لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال کو نو سال گذر چکے تھے۔شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد احد علی لکھتے ہیں کہ:

> ''لکھنؤ جو چند دیہات کے مجموعہ سے زیادہ نہ تھا۔جس میں خرابے اور زمین شور کے سوا کسی طرف کچھ نظر نہ آتا تھا۔بنجر بیہڑ زمین،اونچے ٹیکرے، گہرے گہرے نالے ،ہر طرف دکھائی دیتے تھے۔کہیں جھاڑیوں جھنکاریوں سے جنگل کا سماں.......کہیں پھوس کے چھپروں اور کچے مکانوں سے گاؤں کی کیفیت...چند ہی دن کی مدت میں ایک اچھا خاصا شہر بن گیا تھا۔ہر طرف آبادی ہوگئی بازار لگ گئے۔گنج بن گئے۔سڑکیں نکل گئیں اور گلی کوچے میں کنچن برسنے لگا۔ بڑی بڑی

کوٹھیاں اور محل سرائیں، باغ باغیچے لگے۔ پھلواریاں آراستہ ہوئیں۔
امام باڑے بنے، مسجدیں تعمیر ہوئیں اور ہر طرف چہل پہل ہوگئی۔''[۱۱]

یقیناً لکھنؤ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نواب آصف الدولہ کی زیرسرپرستی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی وجہ سے دور دراز کے علاقوں سے شاعر وادیب حضرات لکھنؤ کی فیاضی بٹورنے اور اپنے کلام کا لوہا منوانے کے لئے اس جانب کا رخ کرنے پر مجبور تھے۔ مصحفی بھی امید لے کر لکھنؤ پہنچے۔ کافی دن گزرنے کے بعد بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ ذریعہ معاش کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ واپس دہلی کا ارادہ کرلیا تھا کہ مرزا محمد حسن قتیل کی ہمدردی اوراعانت ہی کے بدولت قیام لکھنؤ کا ذریعہ بنا لیکن قیام کے باوجود بھی مصحفی ذریعہ معاش سے جڑ نہ سکے۔ پریشانی کے عالم میں دربدری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

اے وائے شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

کیا لکھنؤ کو چھوڑتے لگتا ہے مصحفی
جب ہم نے دلّی شہر سا گلزار تج دیا

مصحفی نے ہمت نہیں ہاری۔ دربار سے منسلک شعرا ان کی راہ کی رکاوٹ تھے۔ ان کی تگ و دو جاری تھی۔ محنت رنگ لائی۔ محفلوں اور مشاعروں کے ذریعہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہونے لگے۔ نواب سلیمان شکوہ کے چہیتے شاعر بن چکے تھے۔ مصحفی نے بھی اپنی شاعری میں شعراء قدیم کی پیروی کو لازم سمجھا اور اسی طرز میں میر، سودا اور دیگر شعرا کی تتبع کی۔ ان کی شاعری میں جذبات نگاری، دلی وابستگی اور شاعری کے معیار کو ملحوظ رکھ کر شاعری کی۔ ان کی شاعری میں داخلی جمالیات اور خارجی کیفیات سے لبریز ہے۔ اسی وجہ سے عوام الناس نے ان کی شاعری کو پسند کیا اور بذات خود نواب سلیمان شکوہ کے ہردلعزیز شاعر بن گئے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مصحفی اردو کے بہترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی غزلوں میں
جذباتیت، سادگی اور فنکارانہ مہارت پائی جاتی ہے۔ان کا ایک نقص
جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے یہ تھا کہ وہ اکثر بڑے بڑے
فارسی اور اردو شعراء کے طرز کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔اس کا
انجام یہ ہوا کہ خود ان کا کوئی رنگ اپنی خصوصیات کے ساتھ واضح شکل
میں ہمارے سامنے نہیں آتا۔''[12]

مصحفیؔ کی شاعری دو دبستانوں کا سنگم ہے۔ انہوں نے دلّی کی داخلیت اور لکھنؤ کی خارجیت سے ایک امتزاجی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔خاص طور پر لکھنوی خارجیت جو داخلی کرب واحساس کے بجائے نفسی واردات، زندگی کی وقتی راحت کے لپیٹ میں تھا۔ ہر شاعر مادیت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مصحفیؔ بھی لکھنؤ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میدان عمل میں کود گئے کیونکہ وہ خود ایک مہم جو اور آرزو مند شاعر تھا۔زندگی بھر مفلسی کا دور دیکھا۔فراوانی بہت کم نصیب ہوئی۔اکثر و بیشتر وہ معاوضہ لے کر دوسروں کو اپنی غزل دے دیا کرتے تھے۔ان کے آٹھ دیوان ملتے ہیں۔ان میں غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور قطعات وغیرہ کی بہتات ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی میں تین اہم کتابیں تحریر کی ہیں ان میں ''عقد ثریا''، ''ریاض الفصحا'' اور ''تذکرہ ہندی'' اہم ہیں۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

ابنائے روزگار کا کیا ماجرا لکھوں
طاقت نہیں ہے ضبط کی پر چپ ہی کیوں رہوں
سارے جہاں کو لاگ ہے جس سے وہ میں ہی ہوں
اب حسبِ حال چاہئے مطلع یہ ہی پڑھوں

جو شخص کہ آج ہیں تسخر پیشہ اور رکھتے ہیں اپنا وہ تکبر پیشہ
اس مسخرگی پہ حیف ہے وے ٹھہریں پھر فن سخن میں بھی تبحر پیشہ

کیا چمکے گا اب فقط میری نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری

سامان سب طرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس
ہے آج کل انہیں مسالے کی شاعری

دبستان لکھنؤ کا تذکرہ ہو اور رنگین یعنی سعادت یار خاں رنگینؔ (۱۸۳۵۔ ۱۷۵۸ء) کا تذکرہ نہ آئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ رنگین دلّی کے ایک تجارت پیشہ شاعر تھے۔ ان کا تخلص رنگین اور مزاجاً بھی وہ بہت رنگین مزاج تھے۔ پیشے کے تحت ادھر ادھر اکثر جانا ہوتا تھا۔ امیروں اور نوابوں سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ عیش پسند انسان تھے۔ ہنسنا اور ہنسانا ان کا پیشہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ دم خم نہیں جو دیگر ان کے عہد کے شعراء میں ہے۔ انشا کے ہر دلعزیز دوستوں میں تھے۔ ان کی شاعری کا محور ریختی ہے جو عورتوں کی بول چال میں ان ہی کے مسائل کو غزلوں اور نظموں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ یہاں ایک سوال قائم ہوتا ہے کہ ریختی کے موجد کون ہیں؟ جب کے رنگینؔ نے خود دعوی کیا ہے کہ وہ ریختی کے موجد ہیں جبکہ انشا نے اپنا اور رنگین کا نام پیش کیا ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ فن شاعری میں یہ صنف ''ریختی'' کا اصل موجود حیدرآباد دکن کے اہم شاعر ہاشمی بیجا پوری ہیں۔ گرچہ اس وقت دکن میں کوئی ماحول نہیں تھا اس کے باوجود ہاشمی نے اپنی غزلوں اور نظموں میں عورتوں کی زبان میں ان احوال کو بیان کیا ہے جو عورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ دبستان لکھنؤ کے اہم شاعر رنگین کی رنگینیاں دیکھیں جو انہوں نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

رنگینؔ کی شاعری میں وہی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جو اس وقت ان کے عہد میں ہو رہا تھا۔ تہذیبی اور سماجی احوال کی گراوٹ ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ ان کی شاعری میں اصلاح کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا بلکہ جیسا ماحول ہے اسی ماحول کی عکس بندی کا ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے دیوان میں ایک قصیدہ شامل کیا ہے جس کا نام ''شیطان'' ہے۔ اس قصیدے کی ابتدا بسم اللہ کے بجائے نعوذ باللہ سے کیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ذہنی تخیل کا عکس ان کی شاعری میں کتنا دکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی کج روی کو بڑے سلیقے سے ادب پارے میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری میں وہ بات نہیں جو ان کے عہد کے دیگر شعراء انشاؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، ناسخؔ، حسرتؔ وغیرہ کے کلام میں ملتی ہے۔ ہر شاعر کی اپنی پہچان ہوتی ہے۔ رنگین نے اپنی پہچان اسی سے بنائی ہے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں نسوانیت کا دور شروع ہوا، یہیں

سے جنسی تہذیب کے زیر اثر امراء، نوابین اور عوام الناس میں سے کچھ نے عورتوں کے سے کپڑے زیب تن کرنے لگے۔ ان کے مزاج اور زندگی میں بھی نسوانیت جھلکنے لگی۔ چال ڈھال بدلنے لگے جس کے تحت یہ ریختی کی شکل میں رنگین نے اس ابھرتے سماج اور تہذیب کو قلمبند کیا ہے۔

وہ لگاتا ہی نہیں چھاتی کو ہاتھ　　　　اپنی چھاتی میں مروڑوں کیسے

مردوے یوں تو بہت مسٹنڈے ہیں لیکن ہے ہے　　　　کوئی ایسا نہیں جھاڑے ترا پانی باندی

رنگین قسم ہے تیری، ہوں میلے سر سے میں　　　　مت کھول کر کے منت و زاری ازار بند

اس طرح رنگین نے اپنی شاعری کی بنا رکھی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رنگین کی شاعری غیر مہذب ہے جو لکھنؤ کی سیاسی و معاشرتی مجہولیت پر مبنی ہے۔ نوابوں اور امراء کا پیدا کردہ ماحول ہے۔ ریختی کہنے والے شعراء کے نزدیک حیات و کائنات کے مقاصد بے معنی تھے۔ عبدالسلام ندوی بہت ہی بے باک انداز میں تبصرہ کرتے ہیں کہ:

> ''یہ صنف اس قدر غیر مہذب الفاظ کا مجموعہ ہے کہ ہم اس دورِ تہذیب وشائستگی میں ان کے دو چار شعر نقل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔''۱۳

اس طرح لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت اپنے عروج پر تھی۔ داخلیت کا اثر بہت کم نظر آرہا تھا۔ غزل اپنے ماحول کے اعتبار سے معنی کھوتی جارہی تھی۔ مصنوعی زندگی کے اثرات سے لکھنؤ آرائش و جمال کا ہالہ بن گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ خارجیت کی دھند چھٹنے لگی۔ شاعری کا ایک نیا دور کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا اور وہ نیا دور ناسخ، آتش، انیس و دبیر، نسیم وشوق وغیرہ کے زیر اثر تھا۔ ان لوگوں نے شاعری کو ایک الگ فکری میلان سے جوڑا اور نئی شاعری کو رواج دیا۔ جس سے دبستان لکھنؤ کی شاعرانہ مزاج پھر سے عود کر آئی۔ ناسخ اور آتش نے دبستان لکھنؤ کو ایک منفرد مقام عطا کیا خاص طور پر ناسخ نے زبان کے معاملے میں سختی برتتے ہوئے اپنا سکہ قائم کیا اور دہلی میں بھی ان کی زبان دانی پر ہر ذی علم حیران و ششدر تھا۔

امام بخش ناسخ (۱۸۳۷-۱۷۷۲ء) فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ناسخ نے اپنی شاعری کا آغاز نواب سعادت علی خاں لکھنؤ کے عبوری دور میں کیا۔ اودھ کی شاعری اس وقت ایک جداگانہ

ادبی حیثیت کے عمل سے گزر رہی تھی۔ عشقیہ شاعر جنسی کیفیات کو جنم دے چکی تھی۔ تصور سے باہر تھا کہ لکھنوی ادب میں کوئی نئی تبدیلی جلد آ سکے گی لیکن اندرون خانہ کہیں نہ کہیں شاعروں کے دل میں ایک چنگاری سلگ رہی تھی جو دل ہی دل میں تبدیلی کے آرزومند تھے۔ اس تبدیلی کا نام ناسخ ہے جس نے شعری لب ولہجہ میں منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کی کوششوں سے پرانے طور طریقے، اسلوب اور غیر مہذب الفاظ متروک کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اردو شاعری کا قدیم دور کا خاتمہ تھا تو نئے شعری دبستان کا آغاز تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ناسخ نے نئی تبدیلی کے ساتھ اردو شاعری کو خیال بندی اور معنی آفرینی کا جامعہ پہنایا۔ ان کی کوششوں نے بہت جلد لکھنؤ کی فضا اور ادبی ماحول کو بدل دیا۔ معاملہ بندی اور ریختی گو شعراء کی دکانیں بند ہونے لگیں اور اصلاحی رجحانات کی پیروی کو ترجیح دی جانے لگی۔ ناسخ کے اصلاحی پہلو بہت خاص ہیں۔ ان کی چند لسانی اصلاحات پر غور کریں۔

۱) عروض وقافیہ کے اصول کے موافق شعر کا وزن درست ہونا چاہئے۔

۲) معانی وبیان اور فصاحت وبلاغت کے اصول کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

۳) قافیہ کے اصول سب برتنے چاہئیں

۴) بندش چست ہو اور غیر ضروری الفاظ شعر میں نہ آنے پائیں

۵) شعر میں دم اور ابتذال کا پہلو نہ نکلنے پائے وغیرہ وغیرہ اصول مرتب کئے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو ادب کی تاریخ میں ناسخ کی اصل اہمیت صرف ایک شاعر کے طور پر نہیں ہے۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں ایک لسانی مصلح کا اہم کردار انجام دیا تھا۔ ان کی کوششوں سے اردو زبان اصلاحات کے ایک طویل عمل سے گزری تھی۔ اس اعتبار سے ہمیں ان کی شعری تحریک کا جائزہ لینا چاہئے۔''[۱۴]

جہاں تک ان کی شاعری کا سوال ہے تو یہ عرض کرتی چلوں کہ ناسخ ایک غزل گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ دلی جذبات وکیفیات، فطری ذوق سے عاری ہیں۔ ان کی شاعری دیگر شعرا کی شاعری سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ وہ تصنع اور صنعتوں کا

استعمال کثرت سے کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری دلی وابستگی پیدا کرنے کے بجائے روکھی اور پھیکی نظر آتی ہے۔اس بات سے انکارنہیں کہ ان کی شاعری زبان بندی، اصلاح لسان، شعری پیکر تراشی سے خوب لبریز ہے۔وہ زبان کے ایک بہت بڑے عالم ہیں۔فن شاعری کے ماہر ہیں لیکن ان کی شاعری میں جذبے، خیال، فکر، وجدان، اندرونی کیفیات، داخلی اور خارجی احوال ناپید ہیں جس سے ان کی شاعری اختراعی شاعری تصور کی گئی۔عبدالسلام ندوی ان کی شاعری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''ناسخ کا شاعرانہ جرم بھی یہی ہے کہ انہوں نے قدما کی سادہ روش کو چھوڑ کر معانی ہائے تازہ کی طرف توجہ کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوگئیں اور کلام بے کیف واثر ہوکر رہ گیا۔''۱۵

ناسخ کے کلام میں خامیاں ضرور ہیں لیکن ان کے دیوان میں اچھی غزلیں بھی ہیں۔اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں کوئی نقص نہ ہوتے ہوئے بھی بے آہ ورنگ سی معلوم ہوتی ہیں۔آیئے چند اشعار دیکھیں:

ہے بہ رنگِ گل سراپا وہ بتِ خون خوار سرخ
کیوں نہ ہوجائے رگِ گل کی روش زنار سرخ

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اُسے ہم یاد کرتے ہیں

لاغری سے یاں نہیں ہے جسم لیکن جان ہے
جس طرح سے جسم تصویروں کا ہے اور جاں نہیں

لکھنؤ کی نئی شمع روشن کرنے والوں میں دوسرا اہم نام خواجہ حیدرعلی آتش (۱۸۴۷۔۱۷۷۸ء) کا ہے۔بچپن میں ان کے والد فیض آباد میں انتقال کر گئے جس سے ان کی

زندگی آزاد گزرنے لگی۔فوجی چھاؤنی میں اپنے ہم عمرلڑکوں کے ساتھ تلوار بازی، گھوڑسواری، تیراور بھالے چلانا سیکھا۔ان کی زیادہ تعلیم نہ ہونے کے باعث تلوار بازی میں خوب مہارت حاصل کی اور بعد میں نوابوں کے صاحبزادوں کو تلوار چلانا سیکھانے کے لئے نوکر ہو گئے۔پھر کچھ عرصے بعد لکھنؤ آ گئے جہاں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔انشا اور مصحفی کا دور دورہ تھا۔مصحفی کو اپنا استاد تسلیم کیا لیکن بہت جلد ان سے قطع تعلق کر لیا اور بذات خود اشعار وضع کرنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے آتش محفلوں اور مشاعروں کی زینت بننے لگے۔لوگوں کو ان کا کلام پسند آنے لگا۔ان کی زندگی درباروں اور امیروں کی حویلیوں کے لئے نہیں بنی تھی بلکہ وہ ان سب سے الگ تھلگ رہنا پسند کرتے تھے۔کیونکہ آتش کے مزاج میں سادگی، استقامت اور قناعت تھی۔

آتش کی شاعری میں لفظی مرصع سازی کے ساتھ ساتھ نئ شعری جہت کا عنصر پایا جاتا ہے۔لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت غالب ہوگئی تھی اور داخلیت سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔لیکن آتش نے پوری توانائی کے ساتھ داخلی عناصر کو اپنے کلام میں پیش کیا جس سے داخلی اور خارجی دونوں عناصر کو یکجا کر کے نئ شعری تجربہ کی داغ بیل ڈالی۔انہوں نے اپنی شاعری میں خالص شاعری کا تصور پیش کیا۔ایک طرف ناسخ اصلاح لسان کی جنگ لڑ رہے تھے تو دوسری طرف آتش ادبی کج روی کو دور کرنے میں مصروف تھے۔ان کی شاعری میں تہذیبی، جمالیاتی روح میں حسن و جمال کی متوقع کیفیات خوب پائی جاتی ہے۔

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے　　　دل کو نہ توڑیے کے خدا کا مقام ہے

دل کی کدورتیں اگر انسان سے دور ہوں　　　سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں

آتش نے کس حسن و خوبی کے ساتھ اپنی شاعری میں جنسی حساسیت کی تمثالیں دی ہیں۔یہ اشعار دیکھیں:

وصل کی شب عیش و عشرت کا یہ سامان کیجیے
خود بھی عریاں ہوجئے اس کو بھی عریاں کیجیے

یا پھر:

شادی وصل میں ہوں جامے سے باہر دونوں
خود بھی عریاں ہوئیے اس کو عریاں کیجیے

آتش نے جذبات کے موضوع کو بھی چنا اور اس میں نئے ذائقے کو محسوس کرنے کا طریقہ سکھایا۔ کیونکہ ان کی زندگی شراب کے بنا ہی تھی لیکن تصوف کی دنیا کی لے کی لہر نے ان کے اندر رندانہ مستی پیدا کر دی تھی۔ یہ شعر دیکھیں:

بحرِ غم سے پار اتارے گی ہمیں کشتیِ مے | بادباں ابر اور ساقی ناخدا ہو جائے گا
وہ بادہ کش ہوں میری آواز پا کو سن کر | شیشوں نے سر حضور ساغر جھکا دیے ہیں

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آتش کی شاعری میں فن شاعری کے تمام لوازمات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے پوری کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری اس وقت اور حالات کے اعتبار سے درس عبرت بھی ہو اور ان کے کلام کی تعریف و تحسین بھی ہو۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں لفظ و معنی کا آہنگ، دلی جذبات و کیفیات رنج و غم، داخلی اور خارجی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ دیا شنکر نسیم (۱۸۴۵۔۱۸۱۱ء) نے گلزارِ نسیم ۱۸۳۸ء میں تصنیف کی۔ ان کی یہ شاہکار تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے لکھنؤ کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور لکھنوی طرز زندگی کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ واجد علی شاہ نے ''رہس'' امانت نے ''اندر سبھا'' جیسی شاہکار ڈرامے لکھے اور لکھنوی ادب میں امر ہو گئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارہ سو ستاون سے قبل اردو کی خدمات خوب ہو رہی تھی اور ملک کے کونے کونے میں ادباء شعرا اس زبان کے ذریعے اپنے ضمیر کی آواز کو اجاگر کر رہے تھے۔ شعرا حضرات غزل گوئی اور دیگر اصناف میں بھرپور طبع آزمائی کر رہے تھے۔ لکھنؤ کی سرزمین مرثیے کی سرزمین بن گئی۔ وہاں پر شاعروں نے قصیدے، مثنوی اور دیگر اصناف کو کم ہاتھ لگایا اس کے برخلاف مرثیہ وہاں کی خاص پہچان بن گئی۔ کیونکہ لکھنؤ میں شیعوں کی بہت بڑی تعداد رہتی ہے۔ محرم کے مہینے میں مجلسیں لگتی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد اس میں شرکت کرتی ہے۔ جس میں مرثیے بڑے زور و شور سے پڑھے جاتے ہیں۔ اردو میں مرثیے خوب لکھے گئے ہیں۔ لکھنوی تہذیب کی پہچان مرثیوں کے حوالے سے کافی اہم ہے۔ مرثیہ نگاروں میں سب سے بڑا نام میر انیس اور مرزا دبیر کا ہے۔ ان دونوں کے بغیر مرثیے کی تاریخ نامکمل ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی

مرثیہ نگار مونس، انس، نفیس، اوج، رشید، عارف، وحید عشق وغیرہ ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

دبستان لکھنؤ کی مختصر تاریخ کے بعد اب ذرا نظیر اکبر آبادی (۱۸۳۰۔۱۷۳۵ء) کی عوامی شاعری کا سرسری جائزہ لینا چاہوں گی۔ اٹھارہویں صدی کا اختتام اور انیسویں صدی کی ابتداء میں اردو نے خوب ترقی کر لی تھی۔ اردو عوامی بول چال کی زبان تھی۔ ادب میں داخل ہونے کے بعد اس کے اوزان اور ناپ تول کے پیمانے مقرر ہوئے۔ جس کے تحت ادیب و شاعر نے عوامی زبان متروک کر کے ادب کے پیرائے میں ادب کی خدمت کرنے لگے۔ لیکن انہی میں سے ایک ایسا فرد واحد جس نے ادبی زبان کا انتخاب نہ کر کے عوامی بول چال کی زبان میں عوام کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور ان کے درمیان گزرے ہوئے لمحات کو بڑی دل لگی کے ساتھ روایات اور اقدار کے بندھنوں کو توڑ کر شاعری میں بیان کیا۔ اس شاعر کا نام نظیر اکبر آبادی ہے جو دہلی میں پیدا ہوئے اور پوری زندگی آگرہ میں گزاری۔ نظیر کی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ جوانی میں عیش و آرام، تفریح اور مذاق، کھیل کود، تیراکی، کشتی، کبوتر بازی الغرض ہر کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ، بھائی چارگی، ہولی، دیوالی اور عید و بقرعید سب دھوم دھام سے مناتے تھے۔

نظیر عوامی شاعر تھے لیکن کچھ نقادوں نے انہیں ''بازارو'' شاعر سمجھ کر نظر انداز کیا جو میری سمجھ سے ان نقادوں نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق ثابت ہوئے۔ نظیر اکبر آبادی تخلیقی قوت کے مالک تھے اسی وجہ سے انہوں نے روایت سے انحراف کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو کائنات کے مناظر کے احساسات اور تاثرات کو موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں فطری مناظر، تہواروں، میلوں ٹھیلوں، موسموں، بازاروں، گلی کوچوں کے ذریعے عوامی زندگی کے روزمرہ کے حالات، بڑی فنی مہارت کے ساتھ بیان ملتا ہے۔ ان کی نظموں کے نام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے آدمی، روٹی، بنجارہ، پیسہ، ہولی، دیوالی، عید، بقرعید، گلی ڈنڈا، ریچھ کا بچہ، کوا، ہرن، گلہری، گرمی، برسات وغیرہ جیسے ان گنت موضوعات پر قلم اٹھائے ہیں جو انسانی زندگی کی حقیقت اور اس کے آئے دن کی روداد کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے

اپنی شاعری میں بیان کیا اور جس انداز سے بیان کیا اس سے قبل کسی نے بھی اس طریقہ کار کو نہیں اپنایا ۔ بہت بعد میں اقبالؔ، فیضؔ وغیرہ یا دیگر شعراء نے فطرت کے مناظر کو موضوع بنایا۔ جبکہ نظیرؔ نے بہت پہلے ہی ان تمام مناظر کو نظموں کے ذریعے پیش کر دیا تھا۔ لیکن ہمارے نقادوں نے ان کی شاعری کو گردانںے سے انکار کر دیا اور بازاری شاعر کہہ کر پلہ جھاڑ لیا۔ آج ان کی شاعری کو مثل آدم قرار دیتے ہیں ۔ان کی نظموں کے کچھ نمونے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں

دنیا میں باوشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی   اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ)

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی   کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی   ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی

جس جا پہ ہانڈی، چولہا، توا اور تنور ہے   خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولہے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے   جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

(روٹی)

نظیرؔ اکبر آبادی نے مختلف موضوعات کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا وہیں انہوں نے آگرہ کے زوال آمادہ معاشرہ اور اقتصادی گراوٹ کو موضوع بناتے ہوئے ''شہر آشوب'' لکھا جس میں آگرہ کے تباہی و بربادی، زرعی نظام کے انحطاط، سماجی زندگی میں کوڑھ پن کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ نظیر کی عشقیہ شاعری جس میں نظیر نے عشق مجازی کے بجائے انسانی رشتوں کے مابین عشق، رکھ رکھاؤ اور ان کے درمیان میل ملاپ، شوخی، بانکپن، جنسی آرزومندی اور شباب ونشاط کی کیفیتوں کو بیان کیا ہے۔ اس طرح نظیرؔ اپنے آپ میں بے نظیر ثابت ہوئے اور آج بھی ان کی نظیر نہیں ملتی۔

نظیر اکبر آبادی کے بعد اب میں اٹھارہ سوستاون سے قبل دلّی کی آخری بہار پر قلم اٹھانا چاہتی ہوں جو ہندوستانی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ جہاں مغل حکمراں لا تعداد میں آئے اور برسہا برس حکومت کرتے رہے۔ کبھی اچھی حکومت رہی تو کبھی بری حکومت۔ ان حکومتوں کے زیر اثر کبھی خوشحالی رہی تو کبھی بدحالی۔ اندرونی ملک اور بیرون ملک سے حملہ آوروں نے خوب دہلی پر حملہ کیا۔ یہاں کا خزانہ بار بار لوٹا گیا۔ یہ دلّی نہ جانے کتنی بار اجڑی اور بسی۔ میرؔ کا یہ شعر جو ہر ایک کی زبان زد ہے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے		یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

لیکن یہ دلّی ہی تھی جو لوٹتے لوٹتے پھر بس جاتی تھی اور اس کی رونقیں عود آتی تھیں۔ میرؔ، دردؔ، سوداؔ کے بعد دلّی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، وہیں لکھنؤ کی لو تیز ہو رہی تھی۔ ہر شاعر وادیب اودھ کی جانب کوچ کر رہا تھا۔ لیکن اب اودھ کی لو مدھم ہو رہی تھی اور دلّی کا چراغ پھر اپنے شباب پر لوٹ رہا تھا۔ یہاں کی ادبی محفلیں رونق بکھیر رہی تھیں۔ ادبی محفلوں میں شاعروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ الغرض ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء تک کا عہد تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے پھل پھول رہا تھا، شاعرانہ عہد پھر لوٹ آیا تھا۔ اس عہد کو ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شاہ نصیرؔ اور شیفتہؔ سنبھل رہے تھے۔ پھر وہی ادبی ماحول لوٹ آیا تھا جو کسی عہد میں میر، درد، سودا کا دور دورہ تھا۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (۱۸۵۴۔۱۷۸۹ء) کا شمار سوداؔ کے بعد اردو زبان کے سب سے بڑے قصیدہ نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ ذوق بچپن ہی سے شعر کہنے کی مشق کر رہے تھے۔ ان کی اس ادا سے شاہ نصیر جو ان دنوں دہلی میں ان کا ہی بول بالا تھا ان کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور خوب مشق کرائی لیکن بعد میں ان کی شہرت پھیلنے لگی تو شاہ نصیرؔ ان سے کترانے لگے۔ اپنی ریاضت اور کہنہ مشق سے ذوقؔ کی دربار تک رسائی ہوئی اور بہادر شاہ ظفرؔ جو ان دنوں ولی عہد تھے ان کو اپنا استاد تسلیم کر لیا۔ یہ قابل استعجاب ہے کہ ذوق کی عمر ان دنوں بیس سال تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں ولی عہد کی استادی غیر معمولی بات تھی۔ انہوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایسا قصیدہ لکھا کہ بادشاہ نے انہیں خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اور جب بہادر شاہ ظفر تخت شاہی پر متمکن ہوئے تو ذوق کو ملک الشعراء بنا دیا۔ ہندوستان کے مختلف کونوں سے ذوقؔ کا بلاوا آیا۔ یہاں تک کہ

دکن کے مہاراجہ چندولال شاداں نے بھی ان کو حیدرآباد مدعو کیا۔ مگر انہیں دلّی کی گلیاں چھوڑ کر کہیں اور جانا پسند نہیں تھا۔ ان کا یہ شعر دیکھیں:

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جاوے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

ذوقؔ کی شاعری میں زیادہ تر غزلیں اور قصیدے ملتے ہیں۔ ان کا ایک اردو دیوان ملتا ہے۔ قصیدے کے بہت اچھے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے قصیدوں کے روح الامین بادشاہوں کی مداحی ہے۔ مذہبی قصائد نہ کے برابر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک قصیدہ میں اٹھارہ علوم کا استعمال کیا ہے۔ ذوق زبان دانی کے ماہر تھے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کا برمحل لانا وغیرہ ان کی ذہانت کی دلیل تھی۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی کا سوال ہے تو وہ اپنی غزلوں میں سماجی احوال وکوائف اور اپنے عہد کی داستان کو بیان کرنے سے کتراتے نہیں ہیں اور عوامی لب ولہجہ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو ''عوامی غزل گو'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ بذات خود معتدل انسان تھے۔ عالم تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اعتدال میں رہنے کی تلقین کرتے تھے لیکن ان کی یہ اعتدال پسندی غزل کے لئے موزوں نہ تھی۔ اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں اکتا دینے والے عناصر موجود ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کی طبیعت، شرافت کی تمام چیزیں جھلکتی ہیں۔ ان ہی تمام چیزوں کی وجہ سے ان کی غزل میں محتاط، سہا سہا اور بے کیف کا سارنگ نظر آتا ہے۔ یہ شعر دیکھیں:

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ — پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا بڑا چاند — لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

دریائے عشق میں دمِ تحریر حال دل — کشتی کی طرح میرا قلم دان بہہ گیا

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذوقؔ کی شاعری میں جو اہمیت ان کے قصیدے کو ملی ہے وہ غزل میں ناپید ہے۔ قصیدہ زبان کی سجاوٹ چاہتا ہے لیکن غزل جذبات اور دلی کیفیات چاہتی ہے جو ذوق کی شاعری میں نہیں ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو زبان پر بڑی قدرت

حاصل تھی۔فن شعر کے ماہر تھے۔کچھ اچھی غزلیں بھی ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں غالبؔ اور مومنؔ بڑے شاعر تھے مگر اپنی لیاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ذوق تمام شعراء کو اپنے نیچے ہی رکھتے تھے۔چند اشعار دیکھیں:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی — ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

مومن خاں مومنؔ (۱۸۵۲۔۱۸۰۰ء) دہلی کے اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔طبابت ان کو ورثے میں ملی تھی۔علم نجوم، ریاضی، موسیقی اور شطرنج کے ماہر تھے۔مومن کی پیدائش ایسے وقت میں ہوئی جب ہندوستان کی سیاست میں کافی اتھل پتھل ہونے والا تھا۔مومن کی پیدائش سے قبل انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مرد مجاہد شہید ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا گیا تھا۔دلّی کا بادشاہ شاہ عالم ثانی کی حکومت برائے نام تھی۔اس کی جگہ مرہٹہ سردار دولت راؤ سندھیا کی عمل داری تھی۔وہ اپنی فوجی طاقت کے ساتھ آگرہ سے دہلی تک حاکم وقت بنا بیٹھا تھا۔لارڈ ولزلی نے شاہ عالم ثانی کو سندھیا کی عملداری سے نکال کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام برطانوی حکومت کی پناہ میں لے لیا اور ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلّی پر قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کو لال قلعہ کے حصار میں محفوظ کر دیا۔حصار کے تین سال بعد ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی کی وفات ہوگئی۔

مومن نے تقریباً سارے اصناف سخن میں طبع کی لیکن ان کو غزل ہی نے وہ مقام عطا کیا جس پر وہ آج بھی متمکن ہیں۔مومن نے غزل کی روایات کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا اور بہت ہی دل کش انداز میں اس کے خدوخال کو سنوارا ہے۔مومن ایک عاشق مزاج انسان تھے۔انہوں نے نو سال کی عمر میں عشق کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔اسی عشق کے بندھن میں حصول تعلیم جاتی رہی۔عشق کی سواری نے ان کی غزل گوئی کو چار چاند لگا دیئے۔اسی وجہ سے ان کی شاعری میں فکر وفن کا حسین امتزاج ملتا ہے جو اب تک بہت کم شاعروں میں دیکھنے کو ملا ہے۔مومن کی غزلوں کا موضوع حسن و عشق ہے۔ان کا تجربہ غزلوں میں جدت اور ہمہ گیری پیدا کر دیتا ہے۔

غیروں کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

محفل میں مرے نام کے آتے ہی اٹھے وہ بدنامیٔ عشاق کا اعجاز دیکھو

مومن کی غزلوں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی خصلت، خلوص وصداقت ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے وہ اس عالم رنگ و بو کا حصہ ہے۔ مومن ہمیشہ اپنی غزلوں میں براہ راست گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں کچھ کہنا معیوب سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔

وصل کی شب شام سے میں سو گیا جاگنا ہجراں کا بلا ہوگیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

لال قلعہ پر ذوقؔ کا قبضہ تھا۔ ان دنوں ادبی ماحول میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ذوق کے سادہ اور عام فہم محاورے وغیرہ ہر ایک کی زبان زد عام تھے۔ ایسے وقت میں مومن کی شاعری کو جو پروان چڑھنا تھا وہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوگئی مومن زمانے سے بڑے شاکی تھے کہ ان کی قدر لوگوں نے نہیں کی۔ مومنؔ کی زبان فارسی آمیز تھی۔ صنائع بدائع کا استعمال کثرت سے کرتے تھے اسی لئے ان کی شاعری میں کہیں کہیں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے جو سمجھنے سے قاصر ہے۔

سحر سے شام تک تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے
نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

مومنؔ اپنے کلام میں طنز کا پہلو بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں البیلا پن پایا جاتا ہے جو نرمی اور کسک پیدا کرتا ہے۔ مومنؔ کے اسلوب کو نکھارنے کے لئے

ان کی زبان دانی کا برمحل استعمال ہے جس میں نئی نئی ترکیبیں، اصطلاحات اور محاورے کو بڑی آسانی کے ساتھ پیوند کردیتے ہیں۔ ان کی غزلیں اردو شاعری کا بہترین نمونہ ہیں لیکن ان کی غزلوں کے موضوعات بہت محدود ہیں۔ ان تمام چیزوں کے باوجود مومنؔ کی شاعری اپنے آپ میں بہت بلند ہے۔

۱۸۵۷ء کے امین مرزا اسداللہ خاں غالبؔ (۱۸۶۹۔۱۷۹۷ء) ہر دل عزیز شاعر ہیں۔ انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل حالات کو دیکھا اور غدر کے بعد کی زندگی تباہ حالی اور کسمپرسی کے عالم میں گزاری۔ تاریخ کے بھرپور مشاہدہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ کے یہاں دو بیٹوں کی پیدائش ہوئی۔ مرزا عبداللہ بیگ اور دوسرے نصر اللہ بیگ۔ مرزا عبداللہ بیگ سے اسداللہ آگرے میں پیدا ہوئے۔ مرزا عبداللہ بیگ فوجی خدمات کے تحت شہر سے دور رہا کرتے تھے۔ اسداللہ اپنی زندگی کے پانچ سال کی دہلیز پر تھے کہ والد کے انتقال کی خبر سنی۔ یہ صدمہ ان کے لئے بہت گہرا تھا۔ والد کی موت کے چار سال بعد ان کے مشفق اور مربی چچا نصر اللہ خاں بھی ہاتھی سے گرنے کے باعث انتقال کر گئے۔ اسداللہ خاں غالبؔ کے لئے یہ سانحہ عظیم تھا۔ آگرے کے بعد ۱۸۱۳ء میں دہلی آگئے۔ شعری ذوق بچپن ہی سے تھا۔ دہلی آنے کے بعد ادبی اور تہذیبی روایتوں کے پاسدار ہوئے۔ اس وقت دہلی کی سلطنت پر اکبر شاہ ثانی برائے نام بادشاہ تھا۔ ۱۸۰۳ء میں برطانوی حاکم لارڈ لیک نے دلّی کو فتح کر کے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور ہندوستان کا بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار بن چکا تھا۔ لیکن دہلی اور لال قلعہ کے اندر کا ماحول وہی تھا جو مغل شہنشاہوں کے دور میں تھا۔ غالبؔ نے اپنی جوانی کے دور کو بڑے پُر لطف انداز میں گزارا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ۱۳؍سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

غالب کی شاعرانہ زندگی بڑے پیچ و تاب کی تھی۔ انہوں نے شاعری کی ابتدا فارسی میں کی تھی۔ فارسی زبان کو ادب کی زبان قرار دیتے تھے اور اردو زبان کو وہ ہمیشہ ''بے رنگ من است'' قرار دیتے تھے۔ انہوں نے بیدل کی شاگردی یا ان کی ذہنی رفاقت کو قبول کیا۔ ان کے زیر اثر ان کی شاعری دن بدن نکھرتی چلی گئی۔ ۱۸۲۱ء میں غالب اپنی عمر کے چوبیس سال پار کر چکے تھے۔ اسی درمیان ان کا شعری مجموعہ ''نسخہ حمیدیہ'' منظر عام پر آیا۔ ان کا یہ شعری مجموعہ بہت ہی مشکل اور بھاری بھرکم الفاظ، معنی و مفاہیم کی سمجھ سے بالاتر وغیرہ چیزوں سے مزین تھا۔ دلّی کے شعرا اور ادبی ماحول

نے ان کی شاعری کو ادق اور مشکل قرار دے کر غیر مانوسیت کا اظہار کیا۔ غالب کے لئے یہ مشکل گھڑی تھی۔ اسی درمیان ان کو کلکتہ جانا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔ ان کے چچا نصر اللہ خاں کی پینشن کا کچھ حصہ ان کے حق میں بھی آیا تھا لیکن وہ بھی ان کو نہ ملا۔ اسی پینشن کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا۔ کلکتہ کے راستے میں لکھنؤ اور بنارس کے علمی ماحول سے فیض یاب ہوتے ہوئے کلکتہ کے علمی سفر نامے میں بھی شریک ہوئے اور وہاں کے شعرا اور ادبا سے خوب فیض حاصل کیا اور اپنا فیض بھی عطا کیا۔ اس سفر نے زندگی کے کئی تجربے ان کو دیئے۔ کلکتے سے واپسی کے بعد ۱۸۲۹ء میں مکمل طور پر فارسیت کے دلدادہ ہوگئے اور اردو زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور خود کو سبھوں میں ممتاز اور بے مثال قرار دینے لگے۔ جس کی وجہ سے ان کو ان کی تخلیقی انانیت کے باعث کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ دور ۱۸۲۹ سے ۱۸۴۹ء کے درمیان کا ہے۔ شعرا ان کو بے معنی شاعر گردانتے لگے۔ جبکہ متوسط شعرا قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس ادبی ماحول نے غالبؔ کی ذہنی تکالیف کو اور بڑھا دیا تھا۔ محدود سلطنت کے دربار سے منسلک ہونے کے آرزومند تھے۔ اس درمیان انہوں نے فارسی کے عظیم شعرا انوریؔ، خاقانیؔ، ظہوریؔ وغیرہ کے کلام سے خوب استفادہ کیا اور انہیں کے رنگ میں اپنی شاعری کی بنا ڈالی۔

۱۸۵۰ء کے قریب قلعہ معلّٰی سے رشتہ استوار ہوا اور مغل خاندان کی تاریخ فارسی میں مرتب کرنے کا حکم ہوا۔ ''مہر نیم روز'' کے نام سے یہ تاریخ ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی تھی۔ دربار کے مشاعرے میں شرکت اب لازمی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ملک الشعرا ذوق تھے اور بادشاہ کے استاد بھی تھے۔ اس لئے غالبؔ کی حیثیت ان کی موجودگی میں کچھ نہ تھی۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنا استاد مقرر کیا۔ لیکن دو سال بعد ۱۸۵۷ء کا عظیم سانحہ پیش آ گیا اور انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر نے غالب کو پھر بے چین کر دیا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ایسی کشمکش کی حالت میں غالب کہاں جاتے۔ گھر کی چار دیواری میں قید و بند کی زندگی گزارتے ہوئے فارسی میں ''دستنبو'' نام کی ڈائری تحریر کر دی۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے حالات اور دہلی کی تباہی و بربادی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں رام پور کے دربار سے وابستہ ہوئے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ بڑی پہلودار ہے۔اس میں نئے اور پرانے پن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔انہوں نے شاعری کو نکھارنے کے لئے قدیم شعری روایات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ان کی شاعری کا محور حسن وعشق ہے۔حسن کے ذریعے مختلف کیفیتوں اور عشق کے ذریعے محبت کی واردات کو داخلیت اور خارجیت کی مدد سے لازوال بنا دیتی ہے۔غالب کی شاعری میں ابتداء سے ہی حزن وملال، یاس ومحرومی، رنج وعلم ،تنہائی وغیرہ کا کہر مستقل چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرنیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

زندگی اپنی کچھ اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کے دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالبؔ کی شاعری روداد زندگی ہے۔ان کے عہد کی تاریخ ہے۔بہت ساری باتیں جو کتابوں میں نہیں ملتی وہ ان کی شاعری میں مل جاتی ہیں۔کیونکہ ان کی شاعری اسی دنیا کی ہے جہاں وہ زندگی گذر بسر کرتے تھے۔غم روزگار کا احساس بہت ہی زورشور سے کرتے ہیں۔غالب نے اپنی شاعری کے ذریعے غیر صحتمند رومانیت،لفظی بازیگری،خواب وخیال کی باتوں سے انحراف کرتے ہوئے سچی شاعری پیش کی جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑی مجھ پر کہ آساں ہوگئیں
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ اردو شاعری کے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ان کی شاعری کا محور اپنے عہد کے

شعرا سے ہٹ کر تھا۔ تصوف کے مسائل پر بہت سے شعرا نے لکھا لیکن غالب کا انداز بیان ہی کچھ اور تھا گرچہ وہ تصوف کے مرد میدان نہیں تھے اس کے باوجود مسائل تصوف کو بڑے فن کارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ کی شاعری میں تخیل، فکر اور فلسفے کی جدت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہ خیالات مشکل ضرور ہوتے ہیں لیکن قاری اور سامع کے دل پر تیر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ نئے نئے وسیلے تلاش کر کے نئی وسعتیں پیدا کیں۔ زبان و بیان میں اجتہادی شان تخلیق کی ہے۔ ان کی کلیات بہت مختصر ہیں کیونکہ احباب کی رائے میں جو فرسودہ کلام تھا اس کو نکال دیا، اور اس کلام کو بھی خارج کر دیا جو مشکل اور فارسی زدہ تھا۔ ان کے دیوان میں قصیدے بھی ہیں، فارسی میں زیادہ قصیدے لکھے ہیں مگر اردو میں ان کے چار قصیدے، بہادر شاہ ظفر اور نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی مدح میں ہے۔ غالبؔ ہمیشہ تنگ دستی کا شکار رہے۔ ان کی زندگی محرومیٔ قسمت کا شکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں جگہ بجگہ قسمت کو دوش دیتے نظر آتے ہیں۔ غالب کی زندگی بڑی اتار چڑھاؤ والی زندگی تھی۔ خدا پر یقین تھا پر نماز روزہ سے عاری تھے۔ شراب کی لت آخر زمانے تک رہی۔ ان کا دل فراخ تھا۔ ہر کسی سے بھائی چارے سے ملتے اور ایک بار جو ملتا پھر دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا۔ انسانی رشتوں کے جذبات کی وہ قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی کمزوریوں پر کبھی پردہ نہیں ڈالا۔ اپنی زندگی کی ہر چیز کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کر دیا۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز اور اجتہادی شان ہے۔ جو بھی پڑھتا ہے اسے محسوس کرتا ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

قید و حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا   اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالبؔ شاعری کے ذریعے اوج کمال تک پہنچے تو نثر کی دنیا میں بھی خوب نام کمایا۔ ان کی اردو نثر کی تاریخ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نثر ان کے خطوط کی شکل میں دستیاب ہیں۔ جس میں سادہ زبان، شگفتہ لب ولہجہ اور مراسلوں کو مکالمے کی صورت میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ ان کے خطوط کے مجموعوں میں ''عود ہندی'' ''اردو معلیٰ'' ''خطوط غالب'' نادرات غالب'' وغیرہ اہم مجموعے ہیں۔

ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے علاوہ اس دور میں شعری بصیرت رکھنے والوں میں بہت سارے شعراء ہیں لیکن ان میں بھی خاص مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ اور شیفتہؔ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان مذکورہ نام کے شعرا کے علاوہ اس دور ابتداء میں ایک اہم نام شاہ نصیرؔ کا بھی ہے جنہوں نے دہلی کی شاعری اور اس کی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے لئے راہیں ہموار کیں۔ شاہ نصیر کی زبان مشکل اور طرز ادا میں بناوٹی لہر پائی جاتی ہے۔ تشبیہ اور تمثیل کی بہتات ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں وہ رنگ نظر نہیں آتا جو دیگر شعراء کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ وہ اپنے عہد اور اپنے وقت کے بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ لیکن آج جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتی ہوں تو اس میں گہرائی اور جذبے کا فقدان نظر آتا ہے۔

ہے یہ تمنا میرے جی میں، یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر بر میں مینا، سر پر طرّہ ہار گلے میں

چرائی چادر مہتاب شب میکش نے جیحون پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

جہاں تک بہادر شاہ ظفرؔ (۱۸۸۲۔۱۷۷۵ء) کی بات ہے تو وہ مغل حکمرانوں میں آخری حکمراں تھے۔ راقمہ کے نزدیک وہ حاکم وقت کم اور شاعر کی حیثیت سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ

ان کی حکومت سمٹ کر لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھی اور شاعری کی دنیا میں اپنی شعری بصیرت اور تخلیقی وجدان سے شعراء کے درمیان اور عوام کے مابین بھی اپنی شاعری کی ساحری سے لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے تھے۔ ابتدائے شاعری سے ہی ان کو اچھے استاد ملتے چلے گئے۔ شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ کی شاگردی میں ان کی شاعری نکھر گئی۔ ان کے حوالے سے یہ بات غلط پھیلی ہوئی ہے کہ وہ ذوق سے شاعری لکھوایا کرتے تھے۔ ان کی اپنی سمجھ بوجھ تھی۔ حاکم وقت تھے شاعری کی دنیا میں بھی اپنی تخلیقیت پیش کی۔ ان کے چار دیوان منظر عام پر آئے۔ ان دیوانوں کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں دکھ، درد، رنج و الم، حاکم وقت ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہونا۔ زمانے کی کسمپرسی، قلعہ کے اندر محصور کی زندگی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی سے جوجھ رہے تھے۔ ان کی پینشن پر زندگی کٹ رہی تھی۔ ان تمام چیزوں کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ ظفر بنیادی طور پر رومانوی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں عشق، معشوق، باغ، باغیچے، دشت صحرا، سوز و گداز، یاس و محرومی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں جمالیاتی پہلو کا بھی دخل ہے۔ اس طرح ظفرؔ کی شاعری میں مختلف امتزاجی رنگوں کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے زبان و بیان، دلّی بول چال کی زبان تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں وعظ و نصیحت اور ترک دنیا کا جذبہ بھی پیش کیا ہے۔ چند شعر دیکھیں:

ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ

نہ کسی کا حبیب ہوں نہ کسی کا رقیب ہوں بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں، نہ مے خواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں گنہہ گاروں میں ہوں

مختصر یہ کہ یہاں طوالت سے کام نہ لیتے ہوئے ۱۸۵۷ء تک کے شعراء و ادبا کے کلام و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں بہت سے متروک بھی ہو چکے ہیں۔ مقالے کی طوالت کے باعث ہمیں مجبوراً یہیں چھوڑنا پڑا ہے۔

۱۸۵۷ اور اردو صحافت:

صحافت انسانی نفسیات کے تحت ہر نئی بات کا جاننا جو وہ نہیں جانتے ہیں اور اس کے لئے بے چین رہنا۔ صحافت کے ذریعے رائے عامہ کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ صحافت کے ذریعے معاشرے کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ امن اور تحفظ میں بھرپور معاون ثابت ہوتا ہے اور عوامی حقوق کی حفاظت

بھی کرتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ صحافت سماج کی ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ وہ سماج کو تباہ و برباد کر سکتی ہے اور اچھے دھارے پر بھی چلا سکتی ہے کیونکہ اخبار کے صحافی ایڈیٹر اور اس کے عملہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ خبروں کو شائع کرے ورنہ قوم و ملک تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ اس لئے صحافی کو بہت سوجھ بوجھ سے حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی کرنے اور حکمرانوں کے اہم فیصلوں کی صحیح جانکاری عوام کو دے۔ پریس کا کام ہے سچ بولنا اور سچ بولنے کی چھوٹ حکومت وقت کی جانب سے ملنا پریس کی آزادی ہے۔

ہندوستانی اردو صحافت کی تاریخ بیان کرنے سے قبل یہ بتاتی چلوں کے برطانوی دور حکومت میں ہندوستانی اخبارات کو آزادی حاصل نہیں تھی۔ ۱۷۹۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے پہلا قانون بنایا تھا لیکن ہندوستانی اخبار نویسوں نے اس قانون کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس بیچ کافی اتار چڑھاؤ آئے۔ بلا آخر ہندوستان کے گورنر جنرل ایڈم نے چارج لیا تو ۴/اپریل ۱۸۲۳ء میں کتابوں، چھاپہ خانوں اور اخباروں کے خلاف کاروائی کرنے اور بغیر لائسنس اخبار چلانے، چھاپہ خانہ یا کتاب چھاپے پر پابندی کا مسودہ تیار کرکے سپریم کورٹ کی منظوری لینے کے لئے پیش کیا اور سپریم کورٹ نے ۱۸۲۳ء میں اس کی منظوری دے دی اور دسمبر ۱۸۲۳ء میں آرڈیننس کی شکل میں اسے نافذ کردیا۔ جبکہ راجہ رام موہن رائے اور ''کلکتہ جنرل'' کے ایڈیٹر نے اس کے خلاف سپریم کورٹ اور ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں اپیل دائر کی لیکن سب خارج ہوگئیں۔ اس کے بعد جتنے بھی اخبار وغیرہ شائع ہوتے تھے اس آرڈیننس کے مطابق ہوتے تھے۔

جہاں تک اردو صحافت کی ابتدا کی بات ہے تو ''جام جہاں نما'' ۲۷/مارچ ۱۸۲۳ء کو اردو کا پہلا اخبار ہر ہری ہردت نے جاری کیا۔ یہ اخبار زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ یہ عہد مغلوں کا تھا۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ سرکاری کام کاج کے لئے فارسی زبان ہی استعمال کی جاتی تھی اور اردو نظر بد کا شکار رہی اور اردو کا یہ پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۳/جنوری ۱۸۲۸ء میں بند ہوگیا لیکن فارسی میں اسی نام سے جاری رہا۔ ''جام جہاں نما'' ہفتہ وار اخبار تھا۔ اردو میں جاری ہونے سے پہلے یہ اخبار فارسی ہی میں ۱۸۲۲ء سے نکلتا آرہا تھا بعد میں ہردت نے اردو میں چار صفحے کا ضمیمہ کے ساتھ شائع کیا جو بعد میں بند ہو کر فارسی ہی میں رہ گیا تھا۔

۱۸۲۳ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اردو میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ۱۲۲ کی تھی۔ اس بیچ فارسی اخبارات کافی تعداد میں چھپنے لگے تھے جن میں ''ماہ عالم فروز'' ''مہر نیم'' ''آئینہ سکندر، سلطان الاخبار وغیرہ تھے۔ یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ ۱۸۳۵ء میں برٹش کمپنی کے تحت ملک کی سرکاری زبان کا سہارا لے کر اپنا کام کر رہے تھے۔ لیکن اب زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ ''جام جہاں نما'' کے بعد اردو کا دوسرا اخبار ۱۸۳۷ء میں بنارس سے ''خیر خواہ ہند'' نکلا۔ اس کے بعد ۱۸۳۸ء میں اردو اخبار ''سید الاخبار'' سید محمد خاں نے جاری کیا۔ اس کے بعد اخباروں کی ان گنت نکلنے شروع ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مخزن الادویہ، صدر الاخبار'' آگرہ، گلدستہ بنارس، احمدی لکھنؤ، مالوہ اخبار اندور وغیرہ سے نکلا۔ ۱۸۳۸ء میں فوائد الناضرین اور قران السعدین بھی جاری ہوئے۔ ''ہندوستانی'' یہ اخبار کلکتہ پریس میں شائع ہوتا تھا۔ جلالی ایک مذہبی رسالہ تھا اس کے ایڈیٹر حسن علی محشر نے یہ رسالہ ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ سے ''خیالی'' اور آگرہ سے ''صدر الاخبار'' اور ''گلدستہ'' جاری ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں ''السعد الاخبار'' آگرہ سے اور کلکتہ سے ''مراۃ الاخبار'' کا اجرا ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں بنارس سے ''گلدستہ'' نامی اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں بمبئی سے ''صالحہ'' پنجاب سے ''کوہ نور'' اور گلزار پنجاب اس کے ایڈیٹر ہر سکھ رائے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دہلی سے سید محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے جاری کیا اور محمد حسین آزاد نے لدھیانہ سے ''نور علی نور'' نکالا۔ محمد حسین آزاد کے والد کا یہ اخبار ''دہلی اردو اخبار'' اپنے وقت اور حالات کے پیش نظر بہت عمدہ اور تمام اخباروں میں بہتر اخبار تھا۔ دہلی اردو اخبار با اثر اخبار تھا۔ اس کے حوالے انگلش، ہندی اور بنگالی اخبار بھی لیا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے عوام کے اعتماد کو کتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے حالات خراب ہونے سے پہلے یہ اخبار ''امن پسندانہ'' تھا۔ خبریں بڑی سیدھی سادی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جب انگریز دشمنی کی بو آنے لگی تو اس اخبار کے تیور سخت ہو گئے۔ مولوی محمد باقر نے بڑی ایمانداری سے اخبار کو اس مقام تک پہنچایا تھا کہ لوگ اس اخبار کی خبروں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''جوں جوں دن گزرتے گئے اخباروں کی روش تیز سے تیز ہوتی رہی

> اور انگریزوں کے خلاف نفرت وعداوت پیدا کرنے کی نئی نئی راہیں
> نکالتے رہے۔''[۱۶]

۱۸۵۷ء کے مئی کے مہینے میں میرٹھ سے جو چنگاری پھوٹی تھی پورا ملک اس شدت کو محسوس کرر ہا تھا اور انگریزوں کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے موقع پر دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار کے ذریعے لوگوں میں جوش وولولہ پیدا کر دیا۔ اور انگریزوں کے حیلے اور حربے کو ناکام بنانے کے لئے یوں لکھا:

> ''اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈ آف انڈیا۔ اور وہ لنترانیاں، حکمت، حکومت داناؤں کی انگلستان کی۔ اب دیکھیں کہ شہرو دیہات کے ہندوستانیوں نے بے جرأتوں اور نادانوں نے اور بے عزموں اور بے بند وبستوں نے انگریزوں کے اہل حکمت و اہل جرأت صاحبان عزم وانتظام کو کس نوبت کو پہنچایا۔''[۱۷]

جب دہلی پر ۱۸۵۷ء کے بعد دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوا تو مولوی محمد باقر حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دہلی اردو اخبار کے بعد ۱۸۵۲ء میں ''چشمۂ فیض'' لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے علاوہ مطبع الاخبار آگرہ، اخبار الحقائی قطب الاخبار، سراج الاخبار جو دہلی سے نکلتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں ''صادق الاخبار'' نور مغربی اور ۱۸۵۴ء میں آگرہ سے ''نور الاخبار'' ''آفتاب ہند'' وغیرہ اخبار نکلتے تھے۔ ان اخباروں میں زیادہ تر اخبار غیر مسلم ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور اس وقت اردو ایک ایسی زبان بن چکی تھی جو ہر ہندوستانی کی زبان تھی۔ ہر ایک نے اس زبان کو اپنی تحریر کا ذریعہ بنایا اور خوب سے خوب تر بنایا۔ ہر ایک نے اپنے خیالات کا اظہار اسی زبان میں کیا ہے۔ ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اگر یوں کہا جائے کہ ہندو کے اخبار اردو میں سب سے زیادہ تھے اور ان کے مذہبی اخبار بھی اردو میں ہی چھپتے تھے۔ آج بھی ہند سماچار، پرتاپ ، ملاپ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، دہلی، گلشن نو بہار کلکتہ، سلطان الاخبار کلکتہ، حبیب الاخبار بدایوں، عمدۃ الاخبار بریلی صادق الاخبار، سراج الاخبار وغیرہ۔ اخباروں نے انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان ہی بیان نہیں کی بلکہ لوگوں کے ضمیر کو جگانا، بیداری لانا، دل اور دماغ کو جھنجھوڑنا وغیرہ۔ توانائی فراہم کرنے کا ذریعہ بنا۔ مودود احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ء

''سلطان الاخبار، کلکتہ .... ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی خبریں شائع کرنے پر اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزا کے طور پر پریس ضبط کیا گیا۔ گلشن نو بہار، کلکتہ......اس اخبار میں جہادیوں کی خبریں نمایاں طور پر شائع کی جاتی تھیں۔ آزادی کے حق میں آواز بلند کرنے پر پریس پر چھاپا مارا گیا اور ر پریس ضبط کیا گیا۔....

صادق الاخبار، دہلی ... یہ اخبار تندوتیز اور انگریز دشمن تھا۔ اس کے مدیر سید جمیل الدین تھے۔ اس اخبار کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ ایک سرکاری گواہ چنّی لال کے بیان کے مطابق ... یہ دہلی کا منہ زور اخبار تھا اور شہر کے تمام طبقوں میں مقبول تھا۔ مولوی ذکا اللہ کے بیان کے مطابق بغاوت پھیلانے کے الزام میں سید جمیل الدین کو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

''دہلی اردو اخبار۔۔۔مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اس اخبار کا اجرا کیا۔ پہلی جنگ آزادی کے آغاز تک اس کا انداز امن پسندانہ تھا۔ بغاوت کے دو ماہ بعد اس کا نام بدل کر ''اخبار الظفر'' رکھ دیا گیا۔ مولانا محمد باقر ایک آزاد خیال، خود دار اور حق گو صحافی تھے۔ صحافت کا جو اعلیٰ معیار انہوں نے قائم کیا وہ اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ یہ اخبار پولیس حکام اور ریاستوں کی بدنظمی پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس میں لال قلعہ کی خبروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔''۱۸

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ملک پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کی زیر سرپرستی یہ ملک چل رہا تھا۔ پہلی جنگ آزادی میں جن اخباروں نے حصہ لیا تھا ان کو بند کرا دیا گیا اور ان کے اصولوں پر چلنے والی تحریریں اخباروں، رسالوں کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ اردو کی خدمت بدستور جاری تھی۔ لیکن ملک کے حالات دگرگوں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جتنے بھی اخبارات نکلے سب اردو میں نکل رہے تھے کیونکہ اردو زبان پورے ملک میں ہر ایک کی زبان تھی۔ ملکی پیمانے پر اردو خوب پھیلی اور بڑھی۔ غدر کے بعد نکلنے والے اخباروں میں ''اردو گائیڈ'' 'اودھ اخبار، شمس الاخبار، امین الاخبار، وکٹوریہ گزٹ، ہندوستان، عمدۃ الاخبار، ریاض الاخبار، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، آئینہ عالم، تہذیب

الاخلاق، سعد الاخبار، اودھ پنچ، شگوفہ، زمیندار، فخر صادق، شمشیر اور پیشوا وغیرہ اخباروں نے قوم و ملت کی خدمت کی اور آنے والے خطرات سے ان اخبارو ں نے خوب آ گاہ کیا اور ملک کو آزاد کرانے میں ہندوستانی اخباروں نے بھر پور تعاون دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو کی صورت حال:

۱۸۵۷ء کی لڑائی سیاسی اور تاریخی واقعہ پر مبنی ہے۔اس کے پیچھے بہت سارے اسباب و علل ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں بے ترتیبی اور بدنظمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جگہ جگہ لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ سیاسی مجاہدین کی جماعت الگ تھی۔لٹیروں کی ٹولی الگ تھی۔اعتدال پسند جماعت الگ تھی۔الگ الگ جگہوں پر الگ انداز میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔معزول بادشاہ کی جانب سے الگ لڑائی کی کوشش ہو رہی تھی اور رجواڑوں کا جتھا الگ تھا۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگ مذہبی امور پر لڑی گئی کیونکہ ہندو اور مسلمانوں کے عقیدے کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا تھا۔ یہ بات سچ ہے کہ لڑائی کی ابتدا فوج کی جانب سے ہندوستانی دستوں کی نافرمانی سے میرٹھ میں ہوئی۔ کیونکہ انہیں سؤر اور گائے کی چربی کا استعمال کارتوس میں ہونے پر اعتراض تھا۔ساتھ ہی ساتھ انگریز سپاہیوں کی بالادستی کی شکایت تھی۔دیسی سپاہیوں پر ظلم و زیادتی کا قہر تھا۔اس طرح دیکھا جائے تو کوئی خاص طبقہ پر نشانہ نہ تھا بلکہ ہر ہندوستانی اس کی لپیٹ میں تھا۔ یہاں تک کہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس غدر کے شر سے بچ نہ سکا۔۱۸۵۷ء میں دہلی سلطنت ختم ہوگئی۔دہلی کی گلیاں خون کی ہولی سے لالہ زار تھیں۔ادیب و شاعر گھروں میں قید و بند ہو گئے۔جب کچھ دیکھا اسے شاعری میں بیان کر دیا اور کسی نے نثر میں نکتہ چینی کی۔اس لڑائی نے ادیبوں کو بھی جھنجھوڑ دیا تھا۔یہ بات سچ ہے کہ جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا گیا تھا اس کا پھل ۱۹۴۷ء میں ملک کو ملا۔ڈاکٹر خلیق احمد نظامی مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔قدیم اور جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔[۱۹]

غدر کا دور قدامت اور جدیدیت کے مابین ایک کڑی ہے۔ اور انتھک کوشش کے ایک صدی کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد مدارس و مکاتب میں قدیم تعلیمی نصاب کے زیر اثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی تعلیم اس عہد میں زوروں پر تھی۔ کسی بھی علم کے پیچھے مذہبی علم کارفرما ضرور ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انگریز کی آمد کے بعد فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، انگلش انسٹی ٹیوٹ اور ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی وغیرہ کے قیام کے بعد علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی علوم کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھ رہا تھا اور نئی نسل مغربی علوم اور سائنس کی دنیا میں دلچسپی لینے لگی تھی ورنہ ہندوستان کے مختلف مدارس میں مذہبی تعلیم کے ساتھ فلسفہ، منطق، اخلاق الٰہیات، طب اور دوسرے موضوعات کے زیر اہتمام ان کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ حاؔلی کے نزدیک دہلی کا یہ دور بغداد اور قرطبہ سے کم نہ تھا۔ یہی علوم وفنون، علم حدیث، علم دین ہی نہیں بلکہ شعر و ادب میں بھی کمال پیدا کروایا جاتا تھا۔ ذوق کا ایک قصیدہ جو ''سر بستہ خواب راحت'' ہے اس میں انہوں نے اٹھارہ علوم گنوائے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عہد اپنے اعتبار سے بہت ممتاز تھا اور غالب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اس طرح دیکھا جائے تو یہ قدیم دور جس میں مشرقی علوم اپنے نقطۂ عروج پر تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس دور کا خاتمہ ہو گیا۔ حاؔلی دہلی کے شاندار دور کا ماتم کرتے ہیں اور ایک نئی امید کی کرن کے ساتھ حاؔلی، شبؔلی، آزاد اور سرسید وغیرہ ابھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اسلاف کے طور طریقے، ان کی خدمات، سوانحی عمریاں وغیرہ ان ادیبوں نے نئے مذاق سخن کے ساتھ خوب لکھا۔ آزاد نے بزرگوں کی یادوں کو محفوظ کیا تو شبلی نے سوانح عمریاں لکھیں اور سرسید تواریخ اور علوم د دینیہ کے ساتھ ساتھ نئی تعلیمی مشن کو لے کر ابھرے اور اپنے رفقائے کریم سے نئے نئے موضوعات پر خوب مضمون لکھوائے۔

۱۸۵۷ء کا غدر نے سرسید (۱۸۹۸۔۱۸۱۷ء) کے انداز فکر ہی کو بدل دیا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دہلی کے تاج کو تاراج ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ بجنور اور مرادآباد کو مٹتے ہوئے دیکھا

تو ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' جیسی تاریخی کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے ہندوستانیوں کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ انگریز حکمرانوں کے خلاف بھی آواز بلند کی اور انہیں مشورہ دیا کہ اپنے حکمران کی غلطیوں کو تسلیم کرلیں۔ سرسید نے تاریخ کی اور کتابیں بھی لکھی ہیں ان میں ''جام جم'' ۱۸۴۰ء میں لکھی جس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے مغل حکمراں کی مختصر تاریخ ہے۔ ''آثارالصنادید'' تاریخ کے میدان میں ان کا اہم کارنامہ ہے جس میں انہوں نے دہلی کے آثار قدیمہ کے مطالعہ کے بعد ڈیڑھ سو سالہ تاریخ پر محیط دلّی کی قدیم عمارتیں، مندر و مسجد، لال قلعہ، حویلیوں اور باولیوں وغیرہ کے احوال کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سو بیس دہلی کے مشائخ، علما و حفاظ، شعرا وَ ادبا، مصوروں اور موسیقی کاروں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اپنے بھائی کے اخبار ''سیدالاخبار'' میں بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری، تزک جہانگیری وغیرہ تاریخ لکھ کر اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سرسید ایک بڑے صحافی تھے۔ اپنے بھائی سید محمد کے اخبار ''سیدالاخبار'' جو ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا تھا۔ سرسید کے مضامین اکثر و بیشتر اس میں شائع ہوتے تھے۔ صحافتی میدان میں ان کا دوسرا کارنامہ سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا ہے۔ اسی میدان میں ان کی صحافتی خدمات کا ایک ستون ''تہذیب الاخلاق'' بھی ہے جو ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۵ء میں مسلمانوں کے اندر تعلیمی وتہذیبی فقدان کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اندر تعلیمی روح پھونکنے کی غرض سے جاری کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جدید اردو صحافت کی بنیاد سرسید نے رکھی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

سیرت کے حوالے سے سرسید نے دو کتابیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں ''سیرت فریدیہ'' اور ''خطبات احمدیہ'' ہے۔ ''خطبات احمدیہ'' سرسید کے علمی کارناموں میں سب سے اہم ہے کیونکہ سرسید نے سر ولیم کی کتاب ''دی لائف آف محمدؐ'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ سرسید ایک خاص اسلوب نگارش کے مالک تھے۔ وہ ہر بات کو بڑے سیدھے سادھے انداز میں لکھتے ہیں۔ سرسید کی بدولت اردو کا ایک بڑا طبقہ فیض یاب ہوا ہے۔ بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دور رہ کر ان کی تحریروں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اس حوالہ سے علامہ شبلی اپنے ایک مضمون ''سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ملک میں آج بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔''[20]

اردو نثر کے ارتقا میں سرسید نے بھرپور تعاون دیا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ جدید نثر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کا تعلیمی مشن میں ایک اہم مشن لندن سے واپسی کے بعد مدرستہ العلوم کے نام سے اسکول کھولا۔ ۱۸۷۸ء میں اسے کالج کا درجہ حاصل ہوا اور بعد میں اس کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ آج کروڑوں کی تعداد میں طلباء و طالبات ملک و بیرون ملک میں موجود ہیں جنہوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ سرسید تحریک سے جڑنے والوں میں حالؔی، شبلؔی، آزاد اور نذیر احمد وغیرہ رفقائے کار نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۹۱۴۔۱۸۳۷ء) پانی پت کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزاری علمی شوق نے شادی کے بعد گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا اور دہلی میں مدرسہ حسین بخش میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے پانی پت جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی زمانے میں حالی نے مشرقی علوم وفنون کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ غدر کے بعد حالی تلاش معاش میں پھر دہلی آئے۔ حالی نے شیفتہ اور غالب سے صحبت حاصل کی۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد حالی لاہور پہنچے اور وہاں محمد حسین آزاد کی مدد سے پنجاب بکڈ پو میں ملازمت کی۔ اس درمیان مشرقی علوم سے خوب دلچسپی پیدا ہوگئی۔ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھے اور سرسید کے افکار سے کافی متاثر ہوئے۔ حالی نے نثر ونظم میں خوب نام کمایا۔ اردو نثر کے ارتقا اور جدید نثر کے حوالے سے خاص طور پر تنقید، سوانح نگاری میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان کی چار کتابیں حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید کے علاوہ تنقید کی اہم کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' ہے۔ اس کے

علاوہ انہوں نے مقالات اور خطوط کے مجموعے بھی تحریر کیے ہیں۔مقدمہ شعر و شاعری ان کا شعری مجموعہ کا مقدمہ ہے۔ یہ دراصل تنقید کی کتاب ہے جس میں انہوں نے بڑے انہماک سے معروضی اصول اور فن شاعری کی پرکھ کی ہے۔تنقید اور سوانح نگاری کے علاوہ حالی نے نظم نگاری میں بھی خوب قدم جمایا ہے۔قدیم اور فرسودہ روایات سے ہٹ کر حالی نے نئی روایت اور اصلاحی شاعری کی بنیاد ڈالی اور علی گڑھ تحریک کے اہم رکن کی حیثیت سے نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴۔۱۸۵۷ء) اردو کے ممتاز شخصیات میں سے ایک ہیں اور سرسید کے رفقاء میں اہم تھے۔اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ان کی ولادت ایسے موقع پر ہوئی جب پورا ملک انحطاط کے دور سے گذر رہا تھا۔سرسید ان انقلابی حالات سے ناخوش تھے جس میں انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔سرسید مسلمانوں کے خیر خواہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان سیاسی میدان میں نہ آئیں بلکہ تعلیمی میدان میں آئیں اور نئی نسل کو تعلیم سے آراستہ کریں۔ شبلی بھی اسی نئی نسل میں سے تھے۔انہوں نے اپنے آپ کو بھرپور تیار کیا اور مشرقی علوم وفنون میں خوب مہارت حاصل کی۔۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ یہ عرصہ ان کے لئے کافی اہم تھا۔یہاں پر سرسید، حالی اور پروفیسر آرنلڈ سے ان کی ملاقات ہوئی۔سرسید نے علی گڑھ میں اپنی لائبریری سے شبلی کو خوب استفادہ کا موقع دیا اور سرسید نے ان کو بڑی شخصیات کی سوانح عمری لکھنے پر آمادہ کیا۔شبلی نے بڑے انہماک کے ساتھ اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ان کی تحریر کردہ سوانح عمریاں الفاروق،الغزالی،سیرۃ النبی،المامون،سیرت النبی وغیرہ اہم کتابیں تحریر کی ہیں۔تنقید میں شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر کافی اہم کتابیں ہیں۔اس کے علاوہ ان کی اہم کتابوں میں علم الکلام اور الکلام بھی کافی اہم ہیں۔ان تمام چیزوں کے علاوہ شبلی ایک شاعر بھی تھے۔انہوں نے نظم نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور کئی اہم مثنوی تحریر کیں۔شبلی نے ستاون سال کی عمر پائی تھی۔اس اعتبار سے دیکھیں تو ان کی تخلیقات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔علی گڑھ تحریک میں سرسید کے ساتھ رہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دے کر اعظم گڑھ چلے آئے اور یہاں پر انہوں نے نیشنل اسکول قائم کیا۔پھر حیدرآباد تصنیف و تالیف کے لئے چلے گئے۔پھر وہاں سے ندوۃ العلماء چلے آئے اور ندوے کے تعلیمی معیار کو خوب سے خوب تر بنانے کی

ہر ممکن کوشش کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی ان کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کے لئے ندوہ کے حالات سازگار نہ ہوئے تو بلا تاخیر اعظم گڑھ آ گئے اور ۱۹۰۷ء میں اچانک گولی لگنے سے پاؤں بیکار ہو گیا۔ اس درمیان وہ اعظم گڑھ میں دار المصنفین کا قیام عمل میں لا چکے تھے جو ابھی تک یہ ادارہ قائم ہے۔

سر سید کے رفقاء میں ایک اہم نام محمد حسین آزاد (۱۹۱۰۔۱۸۳۳ء) کا بھی ہے جنہوں نے اردو نثر کو ایک اہم مقام عطا کیا اور خاص طور پر اردو نظم جو نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے والد مولوی محمد باقر سے خوب علمی استفادہ کرنے کے بعد ذوق سے مختلف علوم وفنون کا درس لیا اور دلّی کالج میں داخلہ لے کر جدید علمی میدان میں قدم رکھا۔ یہاں ان کے احباب میں ذکاء اللہ، پیارے لال اور نذیر احمد وغیرہ تھے۔ آزاد اپنے طالب علمی ہی کے زمانے سے نثر اور شعر وشاعری کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ والد کے اوپر غدر کے دنوں میں ایک انگریز جنرل کی حفاظت نہ کرنے کی پاداش میں سزائے موت ہوئی۔ آزاد دربدری کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی لکھنؤ، حیدرآباد اور اخیر میں لاہور پہنچے وہاں ان کو ۱۸۶۴ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انہوں نے اردو اور فارسی میں کچھ ادبی اور نصابی کتابیں لکھیں۔ بعض انگریز بھی ان کی علمی لیاقت کے معترف ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کو لاہور کی انجمن پنجاب کی ذمہ داری دی گئی اور اس انجمن کے تحت کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے طرحی مشاعرہ کے انعقاد کا حکم دیا گیا۔ یہیں سے اردو نظم نے کروٹ لی اور نئے طرز کی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اس کے علاوہ ان کی ادبی تحریروں سے وہ چمک اٹھے اور بہت جلد گورنمنٹ لاہور کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی تحریروں میں ادب، فلسفہ اور مذہبی کتب کے علاوہ شاعری میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد کی تصانیف میں ''آب حیات''، ''نیرنگ خیال''، ''دربار اکبری''، سخندان فارس، دیوان ذوق اور مجموعہ کلام آزاد کافی اہم ہیں۔ ان کی تصنیف ''آب حیات'' اردو شاعری کی پہلی تاریخ ہے۔ یہ کتاب تاریخی، سماجی، سیاسی اور ادبی شعور کے ساتھ ساتھ شعراء وغیرہ کے تذکرے شامل ہیں۔ ''دربار اکبری'' ان کی ایسی تاریخی کتاب ہے جو اکبر کے عہد کے دلچسپ حالات اور واقعات اور اس تہذیب کی جس میں ہندو اور مسلم مل جل کر رہا کرتے تھے۔ ایسی ہی ان کی اہم کتاب نیرنگ خیال ہے جس میں پہلی بار آزاد نے انگریزی سے ترجمہ کر کے رمزیہ مضامین کے خاکے کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ کئی زبانوں کے ماہر

تھے۔ ہندی اور انگریزی سے بھی خوب اچھی طرح واقف تھے۔ آزاد کا شمار اردو کے اہم مصنفوں میں ہوتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد (۱۹۱۲۔۱۸۳۳ء) کا شمار ایک ایسے ادیب کے طور پر ہوتا ہے جس نے اردو ادب میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ بجنور میں پیدا ہوئے بچپن میں ہی دہلی آ گئے تھے۔ یہیں سے انہوں نے ابتدائی تعلیم مسجد سے کی، اردو پڑھتے پڑھتے دلّی کالج پہنچ گئے۔ کالج میں ان کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا۔ اچھے طالب علموں میں شمار ہوتا تھا کیونکہ ابتدا زمانے سے ہی غربت وافلاس کی زندگی تھی۔ محنت ان کی گھٹی میں تھی۔ کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد روزگار کی تلاش میں تھے کہ غدر کا واقعہ پیش آیا۔ غدر میں بہت زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ بہت جلد وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ خود کی محنت سے انگریزی زبان سیکھی اور قانون کی کتابوں کا ترجمہ بہت ہی سلیس اردو زبان میں کیا۔ اسی درمیان ان کی نوکری تحصیل میں ہوگئی اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر بنے۔ ان کی صلاحیت سے متاثر ہو کر نظام حیدر آباد نے ان کی ۱۸۷۷ء میں ان کی خدمات حاصل کیں۔ مدت تکمیل کے بعد پنشن لے کر دہلی آئے اور تصنیف و تالیف میں اپنی باقی زندگی صرف کر دی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک اچھے مذہبی عالم دین تھے۔ رطب اللسان اور بے باک خطیب و مقرر تھے۔ سرسید کے مشن تعلیم سے بہت متاثر تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے احباب میں شامل ہو گئے اور ان کے حکم کی تعمیل میں متعدد اچھے مضامین لکھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے بچوں کی اصلاح اور متوسط طبقے کی بھلائی کے لئے چند دلچسپ اصلاحی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ لیکن بعد میں ان کی کہانیاں مغربی روایت کے تحت ناول قرار پائیں۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ تنقید نگاروں نے ان کے اس ناول کو اردو زبان کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ گرچہ اس میں خامیاں ہیں اور یہ ناول کے اجزائے ترکیبی کے اصول پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کے باوجود یہ کتاب اپنی ابتدائی دور کی کوشش سے ناول کے پیرائے کے تحت اسے ناول مانا گیا۔ اس کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے چھ ناول تحریر کئے ان میں ''بنات النعش'' جو لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیتا ہے تا کہ پڑھ لکھ کر ان کی زندگی سنور جائے۔ ان کا تیسرا ناول ''توبتہ النصوح'' ہے۔ اس ناول کے ذریعے دلی کے مسلم گھرانوں کی تہذیبی وسماجی پس منظر کو پیش کرتا ہے

اور بچوں کی تربیت کے بغیر ان کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔''ابن الوقت''ان کا ایک ایسا ناول ہے جو ۱۸۵۷ء کے حالات کے اردگرد کے واقعات کو پیش کرتا ہے۔ یہ ناول بہت ہی خاص ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ناول کے کردار میں سرسید ہیں، جو وقت کے مطابق مغلوں کی سلطنت کے زوال کے وقت ان کے ہمدرد ہونے کے بجائے وہ انگریزوں کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں اور ان کے قریب رہ کر مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آگے چل کر مسلمانوں کو عظیم تحفہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے نوا.تے ہیں۔ یہ ناول انگریزی معاشرت اور ان کے طور طریقے کو اپنانے کی مذمت کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے وقت اور حالات کے پیش نظر کہانیوں کے ذریعے ان کی اصلاح کی گنجائش نکالی اور آج بھی ان کے ناولوں میں اصلاح کا پہلو تلاش کیا جاتا ہے۔

سرسید کے رفقاء میں محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، ذکاءاللہ، وحید الدین، سلیم وغیرہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مغربی علوم کا زمانہ تھا گرچہ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج سے ہی نئے علوم کی آمد شروع ہو چکی تھی لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد انگریزی زبان وادب کے عروج میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ انگریزی ادب میں مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، طنز ومزاح، ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری جیسی اصناف آ چکی تھیں۔ ان قوموں کے زیر اثر ہندوستان میں بھی بہت تیزی کے ساتھ مغربی زبان وادب کے اثرات زبان وادب خاص طور پر اردو ادب میں پڑ رہے تھے۔ مغربی اثرات نے اردو میں مختلف اصناف کو جنم دیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جو سرسید، حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد نے مختلف انداز میں اردو کی خدمت کی اور نئے اصناف کی جانب توجہ دی جو ہندوستانی ادب میں ان مایہ ناز افراد کی گراں قدر خدمات ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد اردو زبان وادب میں مغربی علوم وفنون کے تمام اصناف یکے بعد دیگرے آتے چلے گئے اور یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے ان تمام اصناف کو خوب برتا۔ آج اردو زبان وادب دنیا کے دیگر زبانوں کے ادب کے مقالے میں کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان آج کے دور میں پوری دنیا میں بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ یہ اردو ادب کے لئے فخر کی بات ہے۔

☆☆☆☆

حواشی

۱۔	تاریخ ادب اردو جلد اول	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی	ص۔۱۶
۲۔	اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۷۵ء تک	تبسم کاشمیری	ایم۔آر۔ پبلیکیشنز	ص۔۲۷۷
۳۔	ذکر سیر	مرتب نثار احمد فاروقی	ایم۔آر پبلیکیشنز	ص۔۱۷۷
۴۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی	ص۔۷۰
۵۔	ذکرِ میر	میر تقی میر		ص۔۶۳
۶۔	فورٹ ولیم کالج، مطالعات	نجم الاسلام		ص۔۷۱۔۶۸
۷	گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی		ص۔۳۵
۸۔	فورٹ ولیم کالج اور تاریخ (وقار عظیم)	مرتب معین الرحمٰن		ص۔۱۵۷
۹۔	ماسٹر رام چندر	مرتب صدیق الرحمٰن قدوائی		ص۔۴۰
۱۰۔	مرحوم دلّی کالج	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند	ص۔۱۸۲
۱۱۔	مرقع اودھ	محمد احد علی		ص۔۳۰
۱۲۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	ص۔۹۳
۱۳۔	شعرالہند	عبدالسلام ندوی		ص۔۱۰۵
۱۴۔	اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک	تبسم کاشمیری	ایم۔آر۔ پبلیکیشنز	ص۔۶۲۱
۱۵۔	مقالات عبدالسلام	عبدالسلام ندوی		ص۔۳۲۲
۱۶۔	ہندوستانی صحافت (مضامین عتیق صدیقی)	محمد ارشد		ص۔۱۱۷

۱۷۔	دہلی اردو اخبار جلد ۱۹، نمبر ۱۹	مولوی محمد باقر حسین	۱۰؍مئی ۱۸۵۷ء
۱۸۔	ماہنامہ ماہ نور، دہلی	مضمون مودود صدیقی	ص۔۱٦
۱۹۔	۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	ص۔۳
۲۰۔	سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر	علامہ شبلی نعمانی	ص۔٦۵

اسباب بغاوت ہند

۱۸۵۷ء میں ہونے والی بغاوت کے اسباب وعلل پر ہندوستانی اور مغربی مورخین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہت کچھ لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے حوالے سے یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا ہم اس جنگ کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی مانیں یا نہیں؟۔ مغربی نقطہ ءنظر سے اس سوال کا جواب اس انداز میں ملتا ہے کہ برطانوی افسران و حکام اور سرکاری وقائع نگاروں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کو''جنگ آزادی''تسلیم نہ کرتے ہوئے اسے فوجیوں کی''وقتی شورش''قرار دے کر اسے غدر کا نام دیا۔ وہیں ہندوستانی مورخین اور مصنفین نے ۱۸۵۷ء کی اس جنگ کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی قرار دیا کیونکہ انگریزوں کی سوچی سمجھی چال کے تحت ہندوستانی قومیت جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھی ۔ ملک و وطن کے خلاف اٹھنے والی آواز، مذہبی امور میں مداخلت، ہندو اور مسلمانوں کے مابین ٹکراؤ پیدا کرنے کی صورت میں ہر ہندوستانی کی مشترکہ طور پر ان کے خلاف جنگ تھی۔ راقمہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتی کہ انگریز مؤرخوں نے اس جنگ کو غلط انداز میں پیش کیا کیونکہ انہیں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینا تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے حریت، طوق غلامی کو اپنی گردنوں سے نکال پھینکنے کی کوشش کی۔ تاکہ تاریخ انہیں مجرم نہ گردانے۔ جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرسید احمد خاں جو اس جنگ کے اسباب وعلل کے عینی شاہد ہیں، انہوں نے جو کچھ دیکھا اور جن حالات کی بنا پر یہ جنگ ہوئی اس کے تمام محرکات کو اپنی کتاب''اسباب بغاوت ہند'' اور''تاریخ سرکشی ضلع بجنور''میں ۱۸۵۷ء کے احوال وکوائف کو بیان کیا ہے۔ اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ سرسید مصلحت پسند انسان تھے جو مغلیہ سلطنت کے زوال کو بھانپ چکے تھے اس لئے انہوں نے دربار سے جڑنا مناسب نہ سمجھا بلکہ انگریز حکمراں کی تابع داری

کرنے میں بھلائی سمجھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے اسباب کی تلاش کرنے سے قبل انگریزوں کی آمد، ان کی نقل وحرکت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ملک پر تسلط قائم کرنے کے احوال، ملک کے اندورنی حالات، اورنگ زیب کی وفات کے بعد سیاسی، سماجی اتھل پتھل، بدامنی، نفرت اور بغاوت وغیرہ کو بیان کرنا ازحد ضروری ہے تاکہ اسباب بغاوت ہند کے محرکات کو سمجھنے میں آسانی ہوسکے۔

زمانہ قدیم سے ہندوستان کے یورپی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ یوروپین، ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑے، مصالے وغیرہ ترکی کے راستے یورپ لے جاکر فروخت کرتے تھے۔ برّی راستے کے بعد بحری راستے سے یہ سلسلہ ۱۴۹۸ء میں شروع ہوا جو پرتیزی جہاز راں واسکوڈی گاما افریقہ کے راستے اسدالبحر نامی مسلمان کی رہنمائی میں کالی کٹ (کیرالہ) کے ساحلی سمندر میں اترا۔ ان کی محنت اور لگن نے کیرالہ کے تاجروں پر فوقیت حاصل کی اور ۱۵۷۰ء کے آس پاس ان لوگوں نے کالی کٹ میں تجارتی قلعے قائم کئے۔ کچھ عرصے بعد ہالینڈ کے تاجروں نے بھی ہندوستان میں قسمت آزمائی کی۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف ممالک کے تاجرں نے ہندوستان کا رخ کرنا شروع کردیا۔ ان میں جرمنی، فرانس، سوئڈن، ڈنمارک اور برطانیہ سے بڑی تعداد میں تاجروں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ان تمام ممالک کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کے تجار نے بھی تجارتی مقاصد سے ہندوستان کو مرکز بنا رکھا تھا۔ ایران، ترکی اور دیگر ممالک نے بھی ہندوستان کے ساتھ اچھے تعلقات کی بناپر ساز وسامان کی خرید وفروخت کا سلسلہ قائم کیا جو آج بھی جاری ہے۔

سولہویں صدی میں مغل دور حکومت میں بغرض تجارت انگریز کی آمد ہوئی۔ تجارت میں انگریز سب سے فائق رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگریز ہندوستان کے تجارتی مراکز پر چھا گئے۔ ۱۶۱۵ء میں برٹش گورنمنٹ کے گورنر جیمس اول نے پہلی مرتبہ کیپٹن ولیم ہاکنس کے زیر قیادت پہلا سفارتی خط اور قیمتی تحائف لے کر مغل بادشاہ جہانگیر کے پاس آیا۔ جہانگیر نے قبول کیا اور تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت دی۔ اس واقعہ سے قبل یہ بتاتی چلوں کہ یہی مغل بادشاہ جہانگیر سے ملنے کے لئے چند انگریز تجار بے چین وبے قرار تھے لیکن ان کو دو سال کے بعد ہی ملنے کی اجازت دی گئی۔ گورنر جیمس کے سفارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد انگریزوں نے سب سے پہلے سورت، احمد آباد اور

آگرہ میں تجارتی مراکز قائم کئے اس کے بعد مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں بھی اپنے تجارتی مراکز قائم کر لئے۔ اس طرح باہری ممالک سے آنے والے تجار میں انگریز ایک ایسی قوم نکلی جنھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے تجارتی مراکز قائم کرتے چلے گئے۔ اورنگ زیب کی وفات تک ان کی تین بڑی کمپنیاں قائم ہوچکی تھیں۔ یہ کمپنیاں شروع میں الگ الگ تھیں۔ ہر کمپنی کی اپنی الگ کارستانی تھی، لیکن ان کمپنیوں کے آپسی بغض وحسد کے سبب ایک دوسرے کے خلاف ناچاقی پیدا کی۔ اس لئے ملکہ برطانیہ نے تینوں کمپنیوں کو ایک ساتھ ضم کرنے کا حکم دیا اور ایک متحد کمپنی قائم کی جس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' رکھا گیا۔

مغل بادشاہ اورنگ زیب بہت ہی حساس دل رکھتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ان کی سلطنت دور تک پھیلتی چلی گئی۔ ہندوستانی سلطنت کے رقبے میں وسعت پیدا کی۔ یہاں تک کہ دکن کی سرزمین کو بھی فتح کرلیا لیکن مستقل ان کا ایک ٹھکانہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے اندر خلفشار، آپسی رنجش، علاقائیت، مختلف راجاؤں میں ایک دوسرے پر بالادستی، جاٹوں اور مرہٹوں کی یلغار نے دہلی کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انگریز بڑی خاموشی سے ان تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر جگہ بجگہ سورشی حملے کی تیاری کررہا تھا۔ اورنگ زیب نے ان کی نیت کو بھانپ لیا تھا اسی وجہ سے اورنگ زیب نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا تھا۔ لیکن پھر انگریز حکمراں نے درخواست اور منت وسماجت کی، جس کے بعد اورنگ زیب نے ۱۶۹۰ء میں انگریزوں کو تجارت کی غرض سے دوبارہ ہندوستان آنے کی اجازت دی۔ اس بار مکمل عزم وارادے کے ساتھ انگریز قوم نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس درمیان ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے زوال کا دور شروع ہوا۔ انگریز دن بدن اپنی طاقت کو بڑھاتے رہے اور سلطنت دہلی کے بادشاہوں کو نذرانہ بھیجتے رہے اور یہ بادشاہ عیاشی، شراب وشباب میں مگن رہے جس سے انگریز کو اور موقع مل گیا اور انہوں نے کلکتہ پر قبضہ کرلیا۔ وہاں فوجی قلعہ تعمیر کیا۔ مدراس کو تجارتی مرکز قرار دیا۔ پھر کلکتہ کو مرکزیت حاصل ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگریز ملک کے انتظامی امور میں دخل اندازی کرنے لگے۔ بادشاہوں کو اتنا مجبور و بےبس کردیا کہ وہ ان کی رائے اور مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے آہستہ آہستہ جنوب

میں کرناٹک، مشرق میں کلکتہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ مدراس پہلے ہی سے ان کے قبضے میں تھا۔ بنگال میں مرشدآباد کے حاکم سراج الدولہ نے ۱۷۵۷ء میں انگریزوں سے گھمسان کی جنگ لڑی لیکن ان کے وزیر میر جعفر کی غداری سے وہ پلاسی کی جنگ ہار گئے۔ اس جنگ میں انگریز سپاہی صرف تین ہزار تھے جبکہ سراج الدولہ کے پاس ستر ہزار سپاہی تھے۔ اس کے باوجود وہ یہ جنگ ہار گئے۔ میر جعفر کی وجہ سے انگریزوں کا پہلا قبضہ چوبیس پرگنا پر ہوگیا۔

۱۷۶۴ء میں مرشدآباد ہی کے حاکم وقت میر جعفر کے داماد میر قاسم دہلی کے بادشاہ شاہ عالم اور اودھ کے حاکم نواب شجاع الدولہ نے اپنی مشترکہ فوج کے ساتھ انگریزوں کے خلاف بکسر کے میدان میں ہزاروں فوج کے ساتھ جنگ لڑی لیکن یہاں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی شکست کے بعد شاہ عالم نے انگریزوں سے مصالحت کرلی اور ان کے وظیفہ خوار بن گئے جس سے انہوں نے بہار اور بنگال اور اڑیسہ کو اکیس لاکھ روپے سالانہ معاوضہ کی شکل میں ان کے حوالے کردیا۔ شجاع الدولہ نے بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ۱۷۷۲ء میں ہندوستان میں انگریز گورنر جنرل ہسنگر کا تقرر عمل میں آیا۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک سلطنت دہلی پر تقریباً اٹھارہ بادشاہوں کا تقرر ہوا۔ یہ وہ دور ہے جس میں بادشاہوں کی نااہلی، کم ظرفی، شہزادوں کے مابین سلطنت کے لئے قتل وغارت گری، عیاشی اور مے نوشی نے ان کو لے ڈوبی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے لئے ان کے دشمن چہار جانب سر اٹھا رہے تھے۔ کیونکہ اورنگ زیب کے بعد کے بادشاہوں میں وہ دم خم نہ تھا کہ وہ دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کے آپسی معاملات میں سلجھاؤ نہ ہونے کے کارن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش۔ حاکم اور رعایا میں کوئی تال میل نہیں، عوام صحیح رہنمائی کی تلاش میں سرگرداں، وقت کے ابھرتے مسائل میں جاٹ، مرہٹہ، سکھ وغیرہ کی یلغار نے ملک کو خوب نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر فوق کریمی ''اسباب بغاوت ہند'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''چاروں طرف بدامنی پھیل رہی تھی۔ شمالی ہند میں سکھوں کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ دوسری طرف جاٹ تھے۔ یہ لوگ صدیوں

سے جنوب میں آگرہ اور دہلی کے درمیان آباد تھے۔ یہ بڑے جری اور جفاکش تھے۔ متھرا اور دہلی کی سڑکوں پر ان کی ایک طرح عملداری تھی۔ شاہ جہاں اور عالم گیر کے عہد میں بھی ان لوگوں کی سرکشی کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے بظاہر جاٹوں کی سرکوبی ہوگئی تھی۔ لیکن اس فتنے کا پورا استحصال نہ ہو سکا۔ صرف جاٹوں کی طاقت فیصلہ کن نہیں تھی لیکن جب بہت سے عناصر ایک ہی مقصد کے لئے متحد ہوجائیں تو پھر سب کی متحدہ قوت یقیناً فیصلہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کا مقصد سلطنت مغلیہ کے ختم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے سامنے آتا رہا۔ ادھر سلطنت مغلیہ کے دعویدار آپس میں دست و گریباں تھے۔ سلاطین، امراء اور مخالفین سلطنت میں سازشیں ہوتیں اور طرح طرح کی اسکیمیں مغل حکمرانوں کو ختم کرنے کی چلائی جاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے انتقال کے وقت اس کی حکومت کابل سے دہانہ ہگلی تک اور سورت سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی اور سارا ہندوستان مغل حکومت کے زیر نگیں آچکا تھا لیکن ان کو موت کے چند سال بعد ہی ایک طرف جنوبی ہند دہلی سے کٹ گیا۔ دوسری طرف شمالی ہند کے حصے بکھرے ہونا شروع ہو چکے تھے۔ سکھ، مرہٹے اور جاٹ اپنی اپنی ریاستیں قائم کرنے کی فکر میں تھے۔"[1]

دوسری طرف انگریز ملک کے اندرونی حالات اور اس کی سازشوں کا بھرپور جائزہ لے رہے تھے اور اندر ہی اندر ملک کے کونے کونے پر ان کی نظر تھی۔ انہیں وقت اور حالات کا انتظار تھا۔ فرخ سیر کا دور حکومت سازشوں سے پر تھا۔ سادات بارہہ کی وجہ سے فرخ سیر کی حکومت تھی اور وہ تخت پر بیٹھا تھا لیکن سادات بارہہ ان کو مہرے کی طرح استعمال کرنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ سادات بارہہ میں سید حسین علی نے اقتدار سنبھالا لیکن زیادہ دنوں تک ان کی حکومت نہ رہ سکی کیونکہ فرخ سیر سے زیادہ بھیانک موت ان کے نصیب میں آئی۔ اس کے بعد محمد شاہ مغل حکومت کا جانشین بنا۔ ان کے دربار میں بدکردار اور ناعاقبت اندیش لوگوں کی بھرمار تھی۔ عیش وعشرت کی زندگی

میں رنگ رلیاں مناتے۔ حسین دوشیزاؤں کو اپنے اردگرد رکھتے، اسی وجہ سے ان کو رنگیلا بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں چوروں اور ڈاکوؤں کا غلبہ تھا۔ بالآخر ان کا بھی وقت آ گیا۔ سرکاری خزانے میں خرد برد کے الزام میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

اس درمیان ۱۸۳۸ء میں نادر شاہ دہلی پر حملہ کرنے کی غرض سے نکلا تھا۔ راستے میں افغانیوں کی مزاحمت کے بغیر ہی نادر شاہ پیشاور میں داخل ہوا۔ اس کے بعد لاہور میں پندرہ دن قیام کے بعد سلطنت دہلی پر یلغار کے لئے روانہ ہوا۔ اس وقت محمد شاہ رنگیلا خوابِ غفلت کی نیند سو رہا تھا گرچہ خبریں بہت پہلے مل چکی تھیں کہ نادر شاہ کا حملہ ہونے والا ہے اس کے باوجود اس کے حملے پر دھیان نہ دیا اور اپنی پینسٹھ ہزار فوج جس کے پاس صحیح ہتھیار بھی نہ تھے اس کے مدمقابل آیا۔ نادر شاہ کی فوج میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوجی تھے۔ پانی پت کے میدان میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مسلسل چار دن تک جنگ جاری رہی بلا آخر شکست خوردہ اوزار کے ساتھ کب تک جنگ جاری رہتی۔ محمد شاہ کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور محمد شاہ نے نادر شاہ کو صلح کا پیغام نظام الملک کے ذریعے بھیجا کہ پچاس لاکھ کا تاوان لے کر نادر شاہ لوٹ جائے۔ اس پر نادر شاہ تیار ہو گیا۔ لیکن عین نکلتے وقت سعادت خاں نے نادر شاہ کو ورغلایا کہ اگر آپ دہلی پر حملہ کرتے تو آپ کو بیس کروڑ روپیہ نقد اور بے شمار ہیرے جواہرات الگ ہاتھ لگ جاتے۔ نادر شاہ کا دماغ پھر گیا۔ وہ محمد شاہ کے ساتھ دہلی آ گیا۔ قیام دہلی کے دوران دہلی کی گلیوں میں اور نادر شاہ کے فوجیوں کو بتایا گیا کہ نادر شاہ کا قتل ہو گیا ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ اس میں نادر شاہ کی فوج کو کافی نقصان ہوا۔ ہزاروں فوجی قتل کر دیئے گئے کیونکہ دہلی کی گلیوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کا قتل لازمی تھا۔ نادر شاہ کو جب خبر ملی کہ ان کے قتل کے چرچے عام ہو چکے ہیں اور ان کی فوج گاجر مولی کی طرح کاٹی جا رہی ہے تو وہ صبح نکلا اور سنہری مسجد میں نیام سے تلوار نکال کر جنگ کرنے کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف تباہی مچ گئی۔ صبح نو بجے سے قتل کا سلسلہ شروع ہوا اور دوپہر دو بجے تک چلتا رہا۔ بلآخر محمد شاہ اور نظام الملک کی منت سماجت کے بعد قتل عام کو رکوایا گیا۔ اس طرح نادر شاہ دہلی میں دو مہینے کے قیام کے بعد سلطنت دہلی کے خزانے سے سترہ کروڑ روپے اور دس ہزار گھوڑے اور تین سو ہاتھی وغیرہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس وقت دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ اس کے بعد نادر شاہ کے مشیر خاص احمد

شاہ ابدالی نے بھی دہلی کی سلطنت پر گہری نظر رکھی تھی۔نادرشاہ کے مرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نو بار دہلی پر حملہ کیا جس سے ملک کے حالات ابتر ہو چکے تھے۔دہلی کے خزانے برباد ہو گئے۔حکومت کی بچی کچی ساکھ تھی وہ بھی ختم ہو گی۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲-۱۷۰۲ء) اوران کے ہمنوا علماء نے اپنے وقت اور حالات کے پیش نظر قوم وملت کی خوب خدمت کی۔ان کی نظر میں ملک کے اندر ہونے والے خطرات کا پیش خیمہ یہ تھا کہ دین کی کمی اور علوم دینیہ سے لاتعلقی اور بیزارگی کی وجہ سے ان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگ بے راہ روی اختیار نہ کریں بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں زندگی گذاریں۔انہوں نے ولی الٰہی تحریک کا آغاز کیا۔اس کے ذریعے انہوں نے انسان کے بنیادی حقوق کا منشور جاری کیا جس میں یہ چار چیزیں شامل تھیں۔

۱) انسان کی جان ومال کی حفاظت

۲) عقیدہ ورائے کی آزادی

۳) انسانی عزت وناموس کی حفاظت

۴) شہری حقوق کا بلا لحاظ رنگ ونسل تحفظ۔

ان تمام چیزوں کو جواس وقت ملک میں ہورہے تھے اس کو''حجتہ اللہ البالغہ''میں بیان کیا ہے۔نادرشاہ کے حملوں کے بعد دہلی کے باشندوں کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی۔ملک کے اندرونی اور خارجی حالات نے بدامنی پھیلا دی تو شاہ ولی اللہ برداشت نہ کرسکے۔ بلاآخرانہوں نے مصلحتاً احمد شاہ ابدالی کو ملک کے حالات سدھارنے کی غرض سے ہندوستان آنے کی دعوت دی اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ کہیں مغل حکمراں کی تساہلی اور بے روح وجسم والی حکومت پر انگریز سلطنت دہلی پر قابض نہ ہوجایں۔ان دنوں شاہ عالم ثانی انگریزوں کے زیرسایہ بہار میں وقت گذارر ہے تھے۔احمد شاہ ابدالی شاہ ولی اللہ کے بہت قدرداں تھے۔شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ شاہ عالم ثانی احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی حکومت کو استحکام بخشے اور انگریزوں کی سرپرستی سے باز رہے۔لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ملک میں ہورہی شورش کو روکنے کے لئے شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی۔یہ وہی احمد شاہ ابدالی ہیں جو نادرشاہ کے اعلیٰ اور معتبر فوجیوں میں شمار ہوتے تھے کیونکہ نادرشاہ،

احمد شاہ کی صلاحیتوں کا خوب معترف تھا اور کھل کر اس کی تعریف کرتا تھا۔ لہٰذا ۲۱ رجون ۱۷۴۷ء کو جب نادر شاہ اپنے کیمپ میں مارا گیا تو اس کے مرتے ہی سلطنت میں بد نظمی پھیل گئی۔ احمد شاہ نے اس اہم موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور افغانستان میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس دوران ان کی نظر ہندوستان پر بھی تھی۔ انہوں نے بہت ہی قریب سے ہندوستان کے حالات سے آگہی حاصل کی۔ تخت نشینی سے پہلے وہ کئی مرتبہ ہندوستان آچکا تھا۔ یہاں کی دولت، مغل حکومت کی کمزوری، شہزادوں کے درمیان آپسی رنجش اور سازشیں دہلی اور نواح دہلی کے ارد گرد سکھ، مرہٹہ، جاٹ وغیرہ کی یلغار جیسے فتنوں کا معائنہ کر چکا تھا۔ چنانچہ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک تقریباً نو مرتبہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ان حملوں کے طریقے مختلف تھے۔ بعض مرتبہ وہ خود آیا اور بعض مرتبہ اس نے اپنے دیگر حکمراں کو حملے کے لئے بھیجا۔ بالآخر انہوں نے ہندوستان پر ایسی چڑھائی کی کہ جس سے حکومت کی بچی کچی ساکھ بھی جاتی رہی اور وہ جنگ پانی پت کے میدان میں ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ ہی موڑ دیا۔ احمد شاہ ابدالی چاہتے تھے کہ مغل بادشاہ شاہ عالم جوان دنوں بہار میں تھے وہ آئیں اور اپنی حکومت کی باگ ڈور بلا کسی اشتراکیت یعنی انگریزوں کے ساتھ مل کر حکومت نہ چلائیں۔ اس کی کوشش کی لیکن دن بدن انگریزوں کا تسلط ملک کے مختلف حصوں میں بہت تیزی سے بڑھتا رہا۔ دوسری طرف جاٹ آگرے پر، مرہٹہ دکن کے اکثر حصے پر اور سکھوں نے پنجاب پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اور انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۹ء میں زبردست مقابلہ آرائی کے بعد شہید کر دیا۔ میسور میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ ان کے ناپاک ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے وقت کے تقاضے کے مطابق ان سے جنگ لازم تھی کیونکہ ان کی سلطنت پر بھی ان کی ناپاک نظر تھی۔ ٹیپو نے ان کے ساتھ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا جس سے ہندوستان کی باگ ڈور کمزور ہوتی چلی گئی۔ اسی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں دکن سے لے کر بنگال اور آسام تک انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کے مقدمے میں ڈاکٹر فوق کریمی لکھتے ہیں کہ:

> ''احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے حکومت کی رہی سہی ساکھ کو بھی ختم کر دیا۔ مرہٹوں کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دکن کے تمام حصے پر نظام

کے علاوہ مرہٹوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ دوسری جانب پنجاب میں
سکھوں کا زور بڑھ گیا۔ آگرہ کے قریب جاٹ خودمختار ہوگئے۔ انہوں
نے قلعے تعمیر کر لیے اور باقاعدہ اپنے پاس اسلحہ رکھنے لگے۔ دہلی سے
چند میل کے فاصلے سے لے کر آگرہ تک اور میوات کے حدود سے
فیروز آباد اور شکوہ آباد تک سورج مل قابض ہوگیا تھا کسی کی طاقت نہ تھی
کہ مذہبی عقائد کی تبلیغ آزادی کے ساتھ کرسکتا۔ ارکان سلطنت میں
سے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ سورج مل سے کسی قسم کی باز پرس کرے۔
اس کی سرکشی برابر بڑھتی رہی۔ بادشاہ اور امرا کے اختلافات اور غفلت
کی بنا پر کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔ شاہان مغلیہ کا تاج وقت کی تغیراتی لہروں
کی آغوش میں ہچکولے کھا رہا تھا اور ہر لحہ وقار سلطنت گر رہا تھا۔
انگریز، فرانسیسی اور ڈچ قوتیں ہندوستان کی سیاست پر اثر انداز ہوچکی
تھیں۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ نے بنگال میں انگریزوں کو حاکم
بنادیا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ اور کچھ عرصے کے بعد ۱۷۹۹ء
میں شہید ٹیپو سلطان کی شکست نے انگریزوں کے حوصلے بلند کردیئے
تھے۔ بنگال اور دکن پر وہ حکمران ہوچکے تھے۔ دہلی میں ایسٹ انڈیا
کمپنی نے شاہ عالم سے صوبہ بہار اور بنگال کی دیوانی اکیس لاکھ
روپے سالانہ معاوضہ دے کر حاصل کر لی تھی۔ جس کی رو سے بنگال
اور آسام کے آخری کنارے تک انگریزی تسلط تسلیم کرلیا گیا تھا۔ دکن
میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزی حکومت قائم ہوچکی تھی۔[۲]

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کی ہمت اور بڑھ گئی جس سے انہوں نے بنگال،
کرناٹک یعنی ریاست میسور، پنجاب، سندھ اور اودھ پر بھی قابض ہوگئے۔ سلطنت دہلی برائے نام
رہ گئی تھی کیونکہ انگریزوں کی پنشن پر بادشاہوں اور شہزادوں کی زندگی گذر بسر ہورہی تھی۔ ملک کے
اندرونی حالات بہت ہی خراب تھے۔ ہر جانب انگریزوں کے خلاف آواز اٹھ رہی تھی۔ علماء الگ
ان کے خلاف آواز بلند کررہے تھے۔ اور مختلف مقامات پر گھمسان کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ اُن میں
بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، سید احمد

شہید، مولانا جعفر تھانیسری، مولانا فضل الحق خیرآبادی، مولانا عبدالحئی، مولانا لیاقت علی وغیرہ نے ملک کی آزادی کی خاطر دل وجان سے انگریزوں کے خلاف صف اول میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے خلاف خوب جنگیں لڑیں۔ مزید اس وقت جب دہلی کے قریبی ریاست میں جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں نے ظلم وزیادتی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مذہبی امور میں مداخلت اور رخنہ ڈالنے کی پاداش میں علماء ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ اٹھارہ سوستاون سے قبل بہت سارے اسباب پیدا ہونے لگے تھے جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق تھا۔ سکھ قوم افغان خواتین کو زور زبردستی اپنی ملکیت میں رکھنا پسند کرتے۔ ان کی دشمنی مسلمانوں سے تھی۔ ان کی جان ومال کو نقصان پہنچانا ان کا مقصد تھا۔ مسلمانوں کو عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سید احمد شہید ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے اور ضرورت پڑنے پر ان کے خلاف اعلان جنگ بھی کرتے تھے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

> ''جب مولانا سید احمد رائے بریلوی وعظ وہدایت کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے تو وہاں کئی ولایتی افغان آئے اور انہوں نے ایک بڑا دردانگیز قصہ سید صاحب کے روبرو اس طرح بیان کیا کہ ہم اپنے اثنائے راہ ملک پنجاب میں ایک کنویں پر پانی پینے کو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ چند سکھنیاں یعنی سکھوں کی عورتیں اس کنویں پر پانی بھر رہی تھیں۔ ہم لوگ دیسی زبان نہیں جانتے تھے، ہم نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو اشاروں سے بتایا کہ ہم پیاسے ہیں۔ پانی پلاؤ۔ تب عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان جیسا ہم سے کہا کہ ہم مسلمان افغان زادیاں فلاں ملک اور بستی کی رہنے والیاں ہیں اور یہ سکھ لوگ ہمیں زبردستی پکڑ لائے اور سکھنیاں بنا کر اپنی جوروئیں کرلیا ہے .... تب سید صاحب نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا۔'' [۳۲]

علمائے دین سماج میں ہورہی برائیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اور مذہبی امور میں مداخلت تو قطعی برداشت سے باہر تھی۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر اپنے وقت کے بہت بڑے

فقیہہ تھے۔سکھوں کے خلاف انہوں نے آواز بلند کی کیونکہ پنجاب میں جمہوریت اور مذہبی امور کے خلاف غلط حرکتیں ہو رہی تھیں ۔ مذہبی آزادی کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔مسلمانوں پر خوب ظلم ڈھا رہے تھے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسجدوں کو اصطبل بنایا جا رہا تھا، اورانہیں دفتروں میں تبدیل کروایا جا رہا تھا۔سید اسمٰعیل شہید نے پنجاب کا دورہ کیا اور دیکھا کہ مسلمانوں کے خلاف پورے منظّم انداز میں تحریک چل رہی ہے۔ انہوں نے سید احمد شہید سے تذکرہ کیا اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی اور ان کے ہمراہ پنجاب جا کر ۱۸۲۶ء میں ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ نے (سید احمد شہید) سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کی اور مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحیُ کو اطراف ہندوستان میں اس مقصد کے لئے تبلیغ کرنے کو بھیجا جب آپ کی تیاری مکمل ہوگئی تو عام مسلمانوں کو جہاد کے متعلق ایک اطلاع نامہ بھیجا گیا جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد سے مولانا کا مقصد ملک گیری یا دوسری قسم کی بے انصافی نہیں تھا بلکہ اس عام مذہبی آزادی کا حصول تھا جو تمام مذہب ملکوں میں ہر ایک کو حاصل ہے۔''[۴]

اس طرح ۱۸۵۷ء سے قبل علماء کرام نے بھی جنگ آزادی میں بھر پور حصہ لیا۔ ملک کے اندرونی حالات اور خلفشار کے باعث علماء اکٹھے ہوئے اور پنجاب کے حکمراں رنجیت سنگھ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جب جب ملک و مذہب کے خلاف آواز اٹھی اس میں علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان علماء کی نظر سے دیکھیں تو صرف سیاسی آزادی پر زور نہیں تھا بلکہ ہمہ پہلو مضمر تھا۔ ہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انگریز اور مجاہدین کے درمیان اصل جنگ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک جاری رہی ۔ اس کے بعد بھی ۱۸۷۰ء تک ان علماء کی جنگ ان کے خلاف تھی۔ ان میں فضل حق خیرآبادی، رشید احمد گنگوہی، قاسم نانوتوی وغیرہ اہم ہیں۔جن کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے نزدیک یہ علماء سب سے زیادہ معتوب ہوئے اور اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء تک اور اس کے بعد ہزاروں علما کرام کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا۔تاریخ شاہد ہے۔

مغلیہ سلطنت کے بادشاہ کی حکومت لال قلعہ تک محدود ہو چکی تھی۔ انگریز حکمراں نے اعلان کر دیا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد اب ہم کسی اور شہزادے کو تخت پر نہیں بٹھائیں گے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد کسی کو بھی بادشاہ نہیں بنایا جائے گا اور ہر شخص برطانوی حکومت کے زیر اقتدار ہوگا۔ ملک کے اکثر و بیشتر حصے پر انگریز غالب آ چکے تھے۔ ہر ہندوستانی کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے ظلم و زیادتی نے ہر ہندوستانی کے دل میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ جو لوگ کمزور تھے وہ ان حالات کو سہن کرتے رہے اور جس کے دل میں انگریزوں سے بدلہ لینے کی تڑپ تھی وہ نفرت اور انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ فوق کریم ''اسباب بغاوت ہند'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مغلوں سے انگریزوں نے جو عہد کئے تھے ان کی روشنی میں انگریزوں کو جو مراعات ملی تھیں ان میں شہنشاہ دہلی کی شہنشاہیت بہر نوع تسلیم کی گئی تھی اور اس کی رسمیں آخر زمانے تک ادا ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریزوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد شہنشاہیت ختم ہو جائے گی اور بادشاہ کے متعلقین، متوسلین کو قلعہ معلیٰ سے باہر نکل کر شہر میں سکونت اختیار کرنا پڑے گی۔''[۵]

انگریز قوم بہت چالاک تھی۔ ان کی فطرت میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ابتدائی دور ہی سے ملک کے اندرونی حالات پر بہت گہری نظر تھی اور یہاں کی کمزوری ان کے ہاتھ میں تھی۔ اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کے جذبات، ان کے تقدس اور ان کی آبرو کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ دونوں کو آپس میں خوب لڑوانے کی تیاری کی۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ ہندوؤں میں ایسے بہت لوگ تھے جو انگریزی کلچر کے دلدادہ تھے وہ ان کے حامی تھے اور مسلمانوں میں بھی بہت سارے ایسے تھے جو مغربی کلچر کو پسند کرتے اور ان کے علوم اور طور طریقوں سے شغف رکھتے تھے اور ان کی ہمدردیاں بٹورنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ لیکن اکثریت دونوں مسلم اور ہندو انگریزی سامراج کے خلاف تھی کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت پیدا کرنے لگے اور بہت سارے امور میں ردو بدل کرنے لگے۔

ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے ہی ''ستی'' کا رواج تھا۔ان کے نزدیک ستی کا معاملہ مذہبی تقدس کی حیثیت رکھتا تھا۔انگریزوں نے سختی سے اسے ممنوع قرار دیا جس سے ہندوؤں کے جذبات بھڑک اٹھے اور مذہبی امور میں زبردستی مداخلت تصور کیا۔انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں ستی کے خلاف قانون بنایا اوراس سے بیوہ عورتوں کے حقوق فراہم کئے (گرچہ ان کا یہ عمل بہتر تھا) لیکن ہندوؤں نے اس عمل کو بیوہ عورتوں کی بلادستی اور مردوں کی ہتک آمیزی پرمحمول کیا۔ساتھ ہی ساتھ ۱۸۵۵ء میں اس پر بھی انگریزوں نے روک لگا دی کہ اب ہندو حضرات بچوں کو گود نہ لیں جو کہ ان کے نزدیک قدیم رواج کے مطابق یہ سلسلہ چلا آرہا تھا۔اس پر بھی انگریزوں نے کاری ضرب لگائی ۔اس طرح انگریزوں نے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جس سے بغاوت کے اسباب مہیا ہونے لگے۔

عیسائی مبلغین کے وعظہ وتقریر سننے کے لئے انگریز حاکم ہر ہندوستانی خاص طور پر دیسی ماتحتوں کو مجبور کرتے تھے۔ پادری حضرات دوران وعظ ونصیحت کے اپنی عیسائی مذہب کی جانب راغب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے اور دیگر مذاہب کی کتابوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ ان کے اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں کو عیسائی عقائد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ چرچ میں ان کے برابر شریک ہونے کی تاکید تھی۔جس سے ہر ہندوستانی بدظن ہونے لگے۔رسم ورواج اور مذہب کے امور میں مداخلت سے بے چینی پھیلنے لگی۔ ہندوستانی فوج کے اصول مرتب کئے گئے۔ یہ وہی ہندوستانی فوج کی روایت تھی جیسے ۱۸۵۷ء میں اس کی بنیاد ڈالی گئی۔انگریزوں نے ہندوستانی فوج کے ساتھ مل کر بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ان کی خوب مدد لی،لیکن انہیں سراہا تک نہیں بلکہ ان کے حقوق کی حق تلفی بھی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔۱۷۶۴ء کی بات ہے کہ نواب میر جعفر نے بنگال میں انگریز حاکم کے ماتحت گورے سپاہیوں کے لئے رقم بھیجی اس میں ہر گورے نے چالیس روپے اپنے لئے مختص کئے اور دیسی سپاہیوں کے لئے چھ روپے دے کر ان کا حق ان کے ہی ملک میں چھین لیا۔ان میں سے چند سپاہیوں نے فوجی عدالت کا رخ کیا لیکن ان چوبیس سپاہیوں میں سے بیس کو توپ سے اُڑانے کا حکم ہوا اور چار کو دوسرے کیمپ میں لے جا کر انہیں بھی توپ سے اُڑا دیا گیا تا کہ دوسرے دیسی سپاہی ایسی حرکت نہ کریں ورنہ ان کا انجام بھی یہی ہوگا۔دیسی فوجیوں کے لئے برٹش گورنمنٹ کے حاکم نے مدراس میں یہ حکم صادر کیا کہ:

۱) دیسی سپاہی جب فوجی لباس میں ہوں تو ماتھے پر تلک نہ لگائیں اور نہ ان کے کانوں میں بالیاں ہوں

۲) سپاہیوں کو چاہئے کہ اپنی ڈاڑھیاں منڈوایا کریں۔

۳) پگڑی کی جگہ ٹوپی کا استعمال کریں۔

اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم ڈھانے کی سازش کی۔ ان احکام سے ہندو مسلم سپاہیوں کے جذبات مجروح ہوئے تھے۔ ان کے رسم ورواج پر ضرب پڑی۔ ڈاڑھی منڈوانا یا مونچھ منڈوانا ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک توہین کی بات تھی اور اس عمل کو وہ ناپسند کرتے تھے۔

۱۸۴۲ء میں بنگال کی چار رجمنٹوں نے جنہیں سندھ جانے کا فرمان صادر ہوا تھا ان لوگوں نے بغاوت کردی۔ مدراس کی ایک رجمنٹ نے انگریزوں کے حکم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس رجمنٹ سے گورنر نے مراعات کا وعدہ کیا تھا، لیکن بعد میں یہ مراعات دینے سے منع کردیا۔ اس طرح مختلف انداز میں چھوٹے چھوٹے سطح کے حربے ہوتے رہے اور یہ بغاوت جگہ بجگہ کبھی سخت ہوتی تو کبھی نرمی کے ساتھ معاملہ نپٹ جاتا تھا۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کے دل ٹوٹ چکے تھے۔ ہر جگہ ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ یہاں تک کہ خود لارڈ ڈلہوزی نے بھی ۱۸۴۹ء میں ہندوستانی سپاہیوں کو برما جانے کا حکم دیا لیکن ان لوگوں نے سختی سے منع کردیا۔ ان سپاہیوں کو احساس ہو چکا تھا کہ ان کے ساتھ انگریز غلط کر رہے ہیں اور ان کا خوب استحصال کر رہے ہیں۔ تنخواہیں کم دی جارہی ہیں۔ کام زیادہ لیا جارہا ہے۔ انگریزوں کے لئے تلواریں خوب اٹھالیں اب اپنے ہم وطنوں اور وطن کی محبت سے سرشار فوجیوں نے ملک کے لئے تلوار اٹھانا مناسب سمجھا۔ ان کے اندر کا جذبہ اچھال مار رہا تھا۔ یہی جذبہ ۱۸۵۷ء تک شدت اختیار کرگیا۔

اسباب بغاوت ہند کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو ابتدائی دور سے ہی اس کے محرک ہے۔ کیونکہ جب سے انگریزوں کے وہم وخیال میں ہندوستان پر حکومت کرنے کا نشہ طاری ہوا۔ اس کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو نشانہ بنایا۔ ان پر ظلم وزیادتیاں کیں اور نفرت کے بیج بوئے جس سے یہاں کے باشندے ایک دوسرے سے نفرت، بغض وحسد کرنے لگے اور ایک دوسرے پر تلواریں تاننی شروع کردیں۔ انگریزوں کا مقابلہ مختلف جگہوں پر مختلف طبقوں کے

ساتھ تھا۔ پنجاب میں سکھوں کونشانہ بنایا اور برما کو بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔اور بعض علاقے راجا، مہاراجہ وغیرہ نے ''الحاق'' کی صورت پیدا کی تا کہ انگریزوں سے جنگ نہ کرنی پڑے۔اس لئے ان راجاؤں نے مصالحت سے کام لیتے ہوئے چندسالوں کا عہد و پیمان کیا اور انگریز کے جال میں پھنس گئے۔انگریزوں نے بڑی آسانی سے ان کی مانگ پوری کی اور بعد میں ان علاقوں کو طاقت اور دھمکی کے زور پر اپنی ملکیت میں شامل کرلیا۔لارڈ ڈلہوزی کو الحاق کا طریقہ خوب پسند آیا۔باقی علاقوں کے لئے اس راستے کو اختیار کیا کیونکہ انگریزوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسے جائز موقعہ سے فائدہ اٹھائے جس سے اس کی مملکت یا دولت میں اضافہ ہوتا رہے۔سوال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا اور جس نے سوال کیا اسے موت کی نیند سلا دیا گیا۔الحاق کی صورت میں جیت پور، سنبھل، ناگپور، جھانسی، نظام کا برار وغیرہ بھی ان کے قبضے میں آچکا تھا۔

بغاوت:

دہلی اور نواح دہلی میں بغاوت کی چنگاری زور پکڑ رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان جو یہاں کی مشترکہ تہذیب کے امان تھے ان کے مذہبی امور میں مداخلت اور ان کے جسم و جان سے کھلواڑ کرنا شروع کردیا تھا۔۱۸۵۳ء میں برطانوی حکومت نے خاص ہندو اور مسلمان فوجیوں کے لئے خاص قسم کے کارتوس تیار کروا کر انگلستان سے منگوائے تھے۔ان کارتوسوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی گئی تھی۔جسے منہ میں لگا کر دانت سے کھولنے کا سسٹم رکھا تھا۔ان کارتوسوں کے استعمال کی ٹریننگ کے لئے انبالہ، دم دم، اور سیالکوٹ خاص مراکز تھے۔ ہندوستانی سپاہیوں میں یہ بات پھیل گئی کہ کارتوس میں سؤر اور گائے کی چربی کا استعمال کیا گیا ہے تو ان لوگوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے سختی سے منع کردیا۔اس ہلچل نے پوری قوم کو بیدار کردیا۔ان کارتوسوں کی وجہ سے ملک کے کونے کونے میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پروفیسر ظہورالدین اپنے مضمون میں ایک اخبار کے حوالہ سے ان کارتوسوں پر حکم نامہ کو رقم کرتے ہیں:

> ''جنرل اور ڈرنواب گورنر جنرل بہادر سے واضح ہوتا ہے کہ جرم رجمنٹ ۱۹ کا یہ تھا کہ ۲۲ /تاریخ فروری کو حکم پریڈ کا واسطے قواعد کے ہوا اور فی نفر پانچ کارتوس ملے۔لیکن انہوں نے لینے سے بہ ایں

> اظہار انکار کیا کہ اُن میں چربی خوک اور گائے کی لگی ہوئی ہے۔ اور ہر چند میجر جنرل کمان آفسر نے انہیں بہت فہمائش کی اور دھمکی بھی دی لیکن انہوں نے نہ مانا اور سلاح اولٹا کے از راہ سرکشی واسطے مقابلہ اور بلوہ کے آمادہ ہوئے اور بعد اس کے کہ رجمنٹ سواروں کی اور توپخانہ ان کے سامنے کیا گیا اور فہمائش بھی عمل میں آئی۔ انہوں نے سلاح رکھ دیئے اور لین میں چلے گئے لیکن نظر بر عدولِ حکمی اور سرکشی اس رجمنٹ کے نواب گورنر جنرل بہادر اُن پر مطلق اعتبار نہیں رکھتے اور اس لئے حکم ان کی موقوفی کا صادر فرماتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ تنخواہ ان کی مل جائے اور روبرو تمام سپاہ کے چھاؤنی سے نکال دیے جاویں اور یہ اوڈر ہر ایک رجمنت اور ٹروپ اور کمپنی ملازم سرکار کو سنایا جاوے۔ اس جگہ ختم ہوا خلاصہ جنرل اورڈر کا۔“[۶]

گائے اور سور کی چربی کے استعمال سے بنے کارتوسوں کا اصلی مقصد ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کو خراب کرنا تھا کیونکہ اس میں جنگ کے دوران سپاہیوں کے لئے یہ شرط رکھ دی گئی تھی کہ ان کارتوسوں کو دانت سے ہی کھولیں گے۔ دوسری جانب انگریزوں نے شک وشبہات دور کرنے کے بجائے زیادہ سختی سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۹ / مارچ ۱۸۵۷ء کو ان کارتوسوں کا پہلا شعلہ پوری آب و تاب کے ساتھ بھڑک اٹھا۔ جب منگل پانڈے نے دیگر سپاہیوں مثلاً سارجنت اور جوائنٹ لیفٹنٹ پر گولی چلا دی تو ایک انگریز نے بندوق کے کندے سے منگل پانڈے کے سر پر وار کیا تو سپاہیوں نے کہا کہ خبردار منگل پانڈے کو ہاتھ مت لگانا، مگر اسی دوران جب کرنل ویلز بھی موقع پر پہنچ گیا تو اس نے بھی سپاہیوں کو حکم دیا کے منگل پانڈے کو گرفتار کرلو تو دیسی سپاہیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ منگل پانڈے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے کیونکہ منگل پانڈے تو برہمن ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد جب جنرل ہیرس وہاں آدھمکا تو منگل پانڈے کو لگا کہ اب مجھے گرفتار کرلیں گے۔ اسی کشمکش کے دوران منگل پانڈے نے خود اپنے ہتھیار سے اپنے او پر وار کرنا چاہا جس کے نتیجے میں وہ موت کی آغوش میں تو نہیں گیا لیکن زخمی ضرور ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے منگل پانڈے پر مقدمہ چلایا گیا۔ جس میں دیسی افسران پر مشتمل ایک فوجی

عدالت قائم کی گئی۔ یہ فوجی افسر انگریزوں کے اشاروں پر عمل کرنے والا تھا۔ چنانچہ ۶/اپریل ۱۸۵۷ء کو مقدمہ کا آغاز ہوا۔ اس دوران منگل پانڈے پر دو الزامات لگائے گئے، جن میں اول یہ تھا کہ اس نے ملک ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی، دوسرا الزام یہ تھا کہ اس نے انگریز افسروں کے خلاف تشدد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے اس پہلے باغی منگل پانڈے کو ۸/اپریل ۱۸۵۷ء کو بارک پور میں ۲۶ سال کی عمر میں پھانسی دے دی گئی۔ انگریزوں کے خلاف اپنے ہی افراد کا اپنی فوج سے بغاوت کا یہ سلسلہ چل پڑا۔

منگل پانڈے کے ساتھ ساتھ دوسرے افسر ایشوری پانڈے کا خون بھی ناحق کیا گیا اور یہ چنگاری جو بارک پور میں شروع ہوئی تھی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ رفتہ رفتہ شعلہ بن کر میرٹھ پہنچ گئی۔ اور پھر میرٹھ کو بھی جنگ کا نشانہ قرار دے دیا گیا جس میں جنرل اسمتھ کا خاصا اہم رول رہا ہے۔

بلآخر ہندوستانی فوجی سپاہیوں کی غیرت نے ایک اور پُر جوش فیصلہ لیا کہ اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لئے فوری کاروائی کا عمل کیا جائے۔ چنانچہ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کو فوجیوں کو جیل سے چھڑانے کا فیصلہ لیا گیا جو کہ جنگ آزادی کا پہلا اعلان تھا۔ ۱۰/مئی کی شام کو جوں ہی قیدی جیل سے رہا ہوئے تو اس بات کی بھنک جیسے ہی انگریزی افسران کو لگی تو انہوں نے پھر سے مقابلے کی تیاری کی ابتداء کر دی لیکن اس وقت ہندوستانی سپاہی ادھر اُدھر ہو چکے تھے اور میرٹھ چھوڑ کر دہلی کا رخ اختیار کر چکے تھے۔ لیکن اسی وقت میرٹھ میں قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ انگریزوں کے بنگلوں کو آگ کے حوالے کر دیا گیا اور جیسے جیسے فوج کی بغاوت کی خبر پھیلتی چلی گئی تو انگریزی افسران جنگ کے لئے نکل پڑے جس سے بہت سارے گھروں کو جنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا۔ ایسے تباہ کن حالات میں جنگ نے اور مضبوطی اختیار کر لی۔ عوام ایک دوسرے کے جانی دشمن بن چکے تھے۔ لہذا ایسے حالات کے پیش نظر سبھوں نے اپنا گہوارہ دہلی کو متعین کیا۔ اس وقت ہندو اور مسلمان فوجیوں میں بڑا اتحاد تھا۔ ان لوگوں نے سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما تسلیم کیا۔ کیونکہ اس دوران عوام کا ایک بڑا طبقہ بہادر شاہ ظفر سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ اس جنگ میں سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ قریب قریب سبھی اقوام کی عوام شامل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے حالات رونما ہونے کے بعد بھی ۱۸ ماہ دہلی اور ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ ان

حالات کو دیکھتے ہوئے علمائے کرام نے بغاوت کو جہاد کا نام دیا جس میں علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ڈاکٹر فوق کریمی سر سید احمد خاں کی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''علمائے کرام نے بغاوت کو جہاد کا نعرہ دیا۔ حضرت مولانا فضل الحق خیر آبادی جمعہ کے دن جامع مسجد میں جہاد کے فتوے پر علمائے کرام کے دستخط کراتے ہیں۔ سہارنپور میں مولانا قاسم، مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۳؍مئی ۱۸۵۷ء کو جو دربار ہوتا ہے اس میں شریک ہونے والے بھی اکثر و بیشتر مسلمان ہوتے ہیں اور بہادر شاہ کی طرف سے ان کو خطابات اور خلعت دیئے جاتے ہیں۔''[۷]

اس دوران جنرل بخت خاں کو بھی پوری فوج کا کمانڈر بنا دیا گیا اور جب سب سے پہلے میرٹھ میں انقلاب کا شعلہ بھڑکا تو ۸۵ سپاہیوں میں مسلمانوں کی تعداد ۴۹ تھی جبکہ ۳۶ سپاہی غیر مسلم تھے۔ ان سپاہیوں کے جرم کا فیصلہ کرنے کے لئے جو عدالت قائم کی گئی اس میں نو افراد ہندو اور چھ مسلمان تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انگریز مسلمانوں کو ہی اس بغاوت کا محرک تصور کرتا تھا۔ انگریزوں کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ بغاوت کو بڑھاوا دینے والے اصل مجرم مسلمان ہیں۔ ان کے خلاف انگریزی افسران کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے جہاد کرنا لازمی ہے۔ الغرض ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے جنگ غدر کے ساتھ ساتھ جہاد کا نام بھی اختیار کر لیا۔ رفتہ رفتہ یہ جنگ غدر سے جہاد کی شکل اختیار کر لی جس میں مسلمان اور انگریزوں کا مقابلہ سخت ہوا۔ اس کا تذکرہ ڈاکٹر فوق کریمی اسباب بغاوت ہند کے مقدمے میں یوں کرتے ہیں کہ:

> ''۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کسی تنظیم کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ انگریزوں کی جاگیرداروں کے ساتھ بدعہدی، دیسی سپاہیوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک و امتیاز اور ملک میں ایک عام بدحالی کے پیش نظر سامنے آیا اور جو علمائے کرام انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر چکے تھے ان کی نظر ملک کی ان داخلی قوتوں کی طرف نہ تھی۔ جو اندرون ملک

انگریزوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ دوسرے مغل حکومت کے زوال
اور اس کے امراء سلاطین کی آپس کی سازشوں اور ذاتی اقتدار کی لڑائی
نے ملک کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ سیاسی اعتبار سے پھر ملک پر مغل
حکمراں اپن وقار قائم کر لیں۔ دوسرے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ
۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اگر کامیاب بھی ہو جاتا تو یہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا
تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مغل حکومت یا ہندوستانی پھر
ہندوستان کے حکمراں ہو سکتے ہیں۔"[۸]

۱۸۵۷ء کے حملے میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام اور علماء کرام اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ملک پر ان کا کسی بھی طرح کا کوئی اختیار نہیں رہا۔

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں جو بغاوت شروع ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ بغاوت کے چند ہفتے کے بعد شمالی ہند میں ہر چہار جانب سے انگریزوں کے خلاف یلغار شروع ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت جلد انگریزوں کے قدم ڈگمگا جائیں گے لیکن حالات اس کے برعکس ہوئے۔ میرٹھ کے باغیوں نے دہلی کا رخ کیا۔ کسی مزاحمت کے بغیر دہلی دروازے سے داخل ہوئے۔ آخری تاجدار سلطنت بہادر شاہ ظفر کا گھیراؤ کرتے ہوئے اسے ہندوستان کا شہنشاہ قرار دیا۔ لیکن دوسری جانب اودھ کی حکومت اپنے ہلاکت کے آخری دہانے پر تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت انگریزوں کا تسلط گنگا اور جمنا سے سیراب ہونے والوں سے لے کر بنگال تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر آ چکے تھے اور ان کی نیند اور سکون دونوں غارت تھی۔

کانپور میں باغیوں کی حمایت نانا صاحب کر رہے تھے۔ نانا کے ہمراہ دیہاتی، مرہٹہ، پنڈتوں نے خوب ساتھ دیا۔ پٹنہ میں وہابیوں نے پرچم بلند کر رکھا تھا۔ جھانسی میں لکشمی بائی نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی۔ الہ آباد ایک ایسی جگہ تھی جہاں انگریزوں کے غلے اور خورد ونوش کے تمام ساز وسامان موجود رہتے تھے اس پر باغیوں نے خوب حربے استعمال کئے۔ ملک کے کسی کونے میں فوجی بغاوت ہوتی تو ہر صوبے کے گاؤں اور دیہات میں شورش شروع ہو جاتی۔ کئی جگہ ایسے حالات رونما ہوئے کہ انگریز سپاہیوں کی یلغار سے پہلے ہی دیسی باغیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان کے گودام، اسلحہ، سرکاری خزانہ ہر چیز کو سمیٹ لیتے تھے۔ بیرکوں کے دروازے کھول دیتے اور

انگریزوں کے عالی شان عمارتوں کو آگ کے حوالے کر دیتے تھے۔

باغیوں نے پنجاب کا بھی رخ کیا تا کہ وہاں انگریزوں کی حکومت ابھی چند سال یعنی آٹھ سال ہی ہوئے تھے۔عوام کی بیزاری اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں ان کو دقت اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس امید سے پنجاب کا رخ کیا کہ وہ تمام لوگ ابھی بھی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہاں پہنچے لیکن صورت حال کچھ اور ہی تھی کیونکہ پنجابیوں کے دل ودماغ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور حسد تھا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ دوبارہ اگر مغل سلطنت بحال ہوگئی تو پھر ان کو کچل دیا جائے گا اور ان کے خلاف خوب محاذ آرائی ہوگی۔اور پوربی سپاہیوں نے ان سکھوں کو نیچ ذات سے پکارا تھا جس سے ان کو کافی تکلیف ہوئی۔دوسری طرف پنجابی سکھوں کی ہمدردی انگریز حکمراں سرہنری لارنس کے ساتھ تھی کیونکہ ابھی تک لارنس نے ان کے ساتھ ہمدردی اور اچھے سلوک کا برتاؤ کیا تھا۔انگریزوں کے نزدیک ملک کے تمام صوبوں میں پنجاب ہی راس آیا اور یہ لوگ بذات خود مسلمانوں کے کٹر دشمن تھے اس سے انگریزوں کو خوب فائدملا، اسی وجہ سے صوبے پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ پی۔سی۔جوشی لکھتے ہیں کہ:

> ''باغیوں کو پنجاب سے عملی امداد کی توقع تھی۔ان کی دلیل یہ تھی کہ چوں کہ انگریزوں نے اسے صرف آٹھ سال پہلے ہی فتح کیا تھا اس لئے وہ لوگوں کے دلوں کو نہ جیت سکے ہوں گے اور نہ ہی ان کی وفاداری انہیں حاصل ہوگی۔انگریزوں کی قسمت کا مدار صرف پنجاب کی حمایت یا مخالفت پر تھا۔تھارن بل تسلیم کرتا ہے کہ ''اگر پنجاب نے بغاوت کر دی تو ہماری حالت خطرناک ہو جائے گی۔ ہم مقابلے کی تاب نہ لاسکیں گے۔ جب تک انگلستان سے کمک پہنچے'' لیکن پنجاب مجموعی طور پر وفادار رہا بلکہ اس صوبے سے انگریز تمام فرقوں، مذہبوں اور بولیوں کے انتالیس ہزار جوان فوج میں بھرتی کرنے کے قابل ہو گئے۔''[۹]

اس طرح سکھوں نے باغیوں کا ساتھ دینے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا کیونکہ ان کو خدشہ تھا کہ کہیں پھر وہ ہماری مذہبی امور میں مداخلت، نویں گرو تیغ بہادر خالصہ کی شہادت کی طرح

کسی اور گروپر ان کی نظر نہ ہو۔اس لئے دوبارہ قتل عام سے بچنے کے لئے ان لوگوں نے انگریزوں کو ان کے مقابلے ترجیح دی۔ دوسری طرف پنجابی مسلمان بھی اس میں ان کے برابر کے شریک تھے۔ کیونکہ انگریزوں نے ان کو سکھوں کے حربے سے بچایا تھا۔اس سے پنجابی مسلمانوں نے بھی موقعہ سمجھ کر قدم اٹھایا۔

۱۱رمئی ۱۸۵۷ءکوانگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ میں بھر پور کامیابی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو سلطنت کا تاجدار قرار دیا لیکن اگلے ہی مہینے ان کی تاجداری برائے نام رہ گئی۔ایک ایسی سیاسی تنظیم قائم ہوئی جو مجلس عاملہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔اس مجلس کے ذریعہ حکومت کا انتظام کرنا،امن وامان ،ٹیکس یعنی جزیہ وصول کرنا اور ملک کی حفاظت کرنا اور ضرورت پڑنے پر جنگ کرنا وغیرہ ان کے اصول تھے۔اس کے اجلاس دوطرح کے ہوتے تھے۔ایک اجلاس روزانہ پانچ گھنٹے کے لئے لال قلعہ میں ہوتا تھا۔ اور دوسرا اجلاس کبھی بھی کسی وقت بھی بلایا جاسکتا تھا۔اس کی مجلس کے ذریعہ انقلابیوں نے جو دستور بنایا تھا وہ ناقص تھا۔اس وقت تمام شہزادوں کی حالت بہت خراب تھی۔ان کا کوئی اثر ورسوخ نہ تھا۔۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں تین گروہ بہت فعال تھے۔ایک خود انقلابیوں کا، دوسرا انقلابیوں کی مخالفت میں۔سامراجی طاقتیں نمایاں تھیں اور تیسرا گروہ جو بہادر شاہ ظفر کے رہے سہے وقار کو بچانے میں کوشاں تھا۔لیکن ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔بہادر شاہ ظفر برطانوی حکومت کی خواہشات کے اسیر تھے۔لال قلعے کے باہر ان کی حکومت کا کوئی وجود نہ تھا۔ البتہ بہادر شاہ ظفر پہلی جنگ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی مزاحمت کی علامت بن گئے کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں ذہنی اعتبار سے بہادر شاہ ظفر کو قبول کرنے لگے گرچہ بہادر شاہ ظفر جسمانی اور معاشی دونوں اعتبارے کمزور ہو چکے تھے۔اس کی آڑ میں ملک کے عوام بھی کمزوری اور محتاجی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کے بیٹے، پوتے وغیرہ جن میں مرزا مغل،مرزا عبداللہ،مرزا خضر،مرزا قوشیں،مرزا ابوبکر وغیرہ قتل کر دیئے گئے۔اس عہد کے بڑے بڑے علما وصلحا کو شہید کر دیا گیا۔ان میں امام بخش صہبائی،مولوی لیاقت علی،احمد شیر شاہ، مولوی محمد باقر،حاجی محمد سمیع اللہ،سید نذیر حسین،مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ ہیں۔ان میں کچھ کو قید کیا گیا تو کچھ کو شہید کر دیا گیا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔واجد علی شاہ اختر

کوٹھیا برج میں قید کیا گیا۔منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات کو غالب اپنے ایک خط جو ہرگوپال تفتہ کو دہلی اور اپنے دوستوں کے احوال کا لکھتے ہیں:

''تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر ومحبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھی اور منشی نبی بخش ان کا نام تھا اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب چھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منتقی ہرگوپال و تخلص تفتہ ہو۔ آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنوز البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نریندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبان عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی۔ یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمین قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگامے میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں

شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر
کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی
مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل
نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور اپنی نظر بے گناہی پر
شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری
طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی
نہیں گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے
ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے
مکان بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں
جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں
ہے کون جو آوے۔ گھر گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے
جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یاز دہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنج
دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم
بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا
ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔
تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیئے مسلمانوں کی آبادی کا
حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا
دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک
کے ہرکارے کو دیا۔ شنبہ دسمبر ۱۸۵۷ء اسداللہ۔'' [۱۰]

انگریز بڑی راز داری کے ساتھ سازشیں کرتے رہے اور ان تمام سازشوں کی کڑیوں کو پوشیدہ رکھ کر متعلقہ لوگوں کو صرف ضروری ہدایات کی اطلاع پہنچائی گئی جس سے دیسی عوام دھوکہ میں رہے اور ان کے خلاف پوری تیاری کر لی۔ اسی وجہ سے برطانوی اقتدار کے خلاف ملک کے ہر کونے سے آواز اٹھی اور دیسی قوموں کی بغاوت زوروں پر پھیلی۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ لکھنؤ میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا جس سے اودھ کی جدوجہد میں پہلی جنگ آزادی کارفرما تھی۔ دہلی کی سلطنت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ انگریزوں کے نزدیک یہ فوجی غدر تھا جبکہ

ہندوستانیوں کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگ ایک قومی جذبہ تھا۔ برطانوی حکمراں کے نزدیک غدر کے نمایاں ملزم مسلمان تھے۔ جس کے باعث ان کو اس جنگ کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ انگریزوں کی آمد سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ان کی دشمنی خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ برابر رہی۔ غدر کے ایام میں ان پر خوب مظالم توڑے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان کی تاریخ بہت ہی کرب ناک اور عبرت ناک ہے۔ لارڈ رابرٹس دہلی کی تباہی کا نظارہ دیکھ کر دہل گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مردوں کا شہر نظر آتا تھا۔ کوئی آواز سوا ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی ہمیں نظر نہ آیا۔ ہر طرف مردوں کا بچھونہ بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت نزع و جانکنی میں مبتلا تھے۔ ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے۔ خوف تھا کہ ہماری آواز سے مردے نہ چونک پڑیں۔ اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے ہیں اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع ہیں جو ان کے گوشت کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھتے ہیں۔ ہم کو بڑی عبرت ہوتی تھی اور ہمارا دل رنجور ہو جاتا تھا۔ بہت سے مردے ایسے پڑے تھے گویا وہ زندہ ہیں۔ بعض مردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔
غرض ان مردوں کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ جیسے کہ ہم کو ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ مردوں کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ ان کے تعفن سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔''[۱۱]

اس طرح ۱۸۵۷ء میں ہمارے اکابرین اور آبا و اجداد نے جانیں دے کر اس ملک کی حفاظت کی اور کروڑوں ہندوستانیوں نے ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اور پھر جنگ آزادی کے لئے ۱۹۴۷ء تک کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے انقلابی افراد

۱۸۵۷ء کے حالات کے پیش نظر برطانوی اقتدار اورفوجی منتظمین کے آگے اچھی طرح منظّم نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ان میں اتحاد و اتفاق تھا۔ حالانکہ منظّم طریقہ کار افراد کی کمی تھی۔ اس میں رہبر و رہنما کا فقدان نظر آیا کیونکہ ملک کے ہر کونے میں بغاوت کی چنگاری پھوٹی۔ صحیح ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے انقلابی منتشر ہو گئے۔ اسی وجہ سے بہت سارے مورخین یہ کہتے ہیں کہ یہ قومی بغاوت نہیں تھی بلکہ دہلی کی شہنشاہیت کے قیام کے لئے جدوجہد تھی یا پھر جھانسی اور مرہٹوں کی طرف دیکھتے ہیں تو انہوں نے اپنے رہبر و پیشوا کی طاقت کو بحال کرنے کے لئے نانا صاحب کے زیر اثر اس بغاوت میں حصہ لیا۔ البتہ اودھ میں انگریزوں کے ساتھ ہونے والی جنگ کو آزادی کی جنگ قرار دیا۔ یہ وہ اسباب تھے جو جنگ کی صورت اختیار کر گئے اور ملک کے ہر حصہ میں بھیانک چنگاری پھوٹی اور دہلی، میرٹھ، انبالہ، الہ آباد، کانپور، عظیم آباد، اودھ، جھانسی، کلکتہ وغیرہ میں خون کی ہولیاں کھیلی گئیں۔ بلا وجہ لوگوں کو فرضی مقدمات میں پھنسایا گیا اور انہیں قتل کروا دیا گیا۔ لوگوں کو اذیت ناک سزائیں دیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلم علما کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ملک کے نظام تعلیم، عدلیہ، معیشت اور انتظامیہ وغیرہ میں بھرپور تبدیلی کی گئی۔ مسلمانوں کی ملکیتیں اور جائیداد ضبط کر لی گئیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور معاشی اعتبار سے کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ان کے خلاف طرح طرح کی تدبیریں کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

اس طرح جنگ کے دوران ہی برطانوی غلبہ اور تسلط ہندوستان کے ہر گوشے میں ہو چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر ملک پر قابض ہوئے اسوقت پورے ملک میں اس کمپنی کے تین بڑے مراکز تھے اور تینوں کی اہمیت مسلم تھی۔ ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ تینوں مراکز اپنی حکومت قائم نہ کر لیں اس سے پہلے ان مراکز کو حلول کر دیا گیا اور ملکہ برطانیہ نے ہندوستان کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے اقتدار کے دور حکومت میں بھی حریت کی چنگاری موجود رہی۔ جگہ جگہ شورشیں ہوتی رہیں۔ جنرل بخت خاں اور احمد اللہ شاہ نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا مگر بعض کمزوریوں، اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور بہتر قیادت کے فقدان کے باعث مختلف جنگوں میں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک عالمی سطح پر یورپ میں بھیانک جنگ عظیم ہوئی۔اس میں متعدد ممالک نے حصہ لیا۔ایک طرف جرمنی، آسٹریا اور ترکی تھے تو دوسری طرف برطانیہ، فرانس، اٹلی، روس اور امریکہ تھے۔اس جنگ عظیم میں جرمنی اور اس کے ساتھی ممالک کو شکست ہوئی۔اسی طرح دوسری بار ۱۹۳۹ء میں عالمی سطح پر دوبارہ جنگ شروع ہوئی اس جنگ کو جنگ عظیم ثانی قرار دیا گیا۔ ایک طرف جرمنی کا ساتھ دینے والوں میں جاپان اور اٹلی تھا تو دوسری جانب انگریزوں کے ساتھ روس، فرانس اور امریکہ تھا۔اس جنگ عظیم ثانی میں انگریزوں نے ہندوستان کو بھی شامل کرلیا تھا۔ جس سے ہندوستان کے عوام ناراض ہو گئے۔اس کے خلاف سول نافرمانی کی عوامی تحریک شروع ہوئی۔ ہندوستانیوں میں ہر فرقے کے لوگوں نے انگریزوں کا ہر محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔کیونکہ انگریزوں نے ہر ہندوستانی پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، قتل وغارت گری کی۔جس سے ہر ہندوستانی انگریزوں سے بدظن ہوگیا۔ اور ملک چھوڑو کے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ اس دورن تحریک خلافت، ترک موالات، بھارت چھوڑو آندولن وغیرہ تحریکوں نے انگریزوں کے ناک میں دم کردیا تھا۔ اس طرح ۹۰ سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ہندوستانیوں کو ان سے آزادی ملی۔

۱۸۵۷ء میں ناکامی کے اسباب:

مذکورہ مباحث سے ہٹ کر اب راقمہ ۱۸۵۷ء کے جنگی احوال کے زیر بحث میں ان امور کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے جن میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست کا سامنا کیوں کرنا پڑا۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنگ آزادی یعنی غدر کی جنگ کا محاسبہ کریں۔ دراصل ۱۸۵۷ء کی جنگ کی تاریخی حیثیت اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب مغل حکومت کی چیرہ دستیوں اور مدافعانہ دست درازیوں کے ساتھ ساتھ جنگ کے اسباب وعلل، فتح وشکست پر روشنی ڈالی جائے۔اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا از حد ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے اسباب وعلل پر بہت ساری باتیں ہوئیں اور ان کے احوال وآثار کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔اب ذرا اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بہت سارے اسباب ہیں جن سے ہندوستانی عوام، ہندوستانی علماء، ہندوستانی فوج اور ان کے محافظ وغیرہ کی کوتاہیوں کے

باعث انگریزوں کے مدمقابل نہ ٹھہر سکے اور انگریزوں نے ہندومسلم کے مابین تنازع پیدا کرکے نفرت اور پھوٹ ڈال کر حکومت کی باگ ڈور پر اپنا تسلط قائم کرنے کی سعی کی۔ ناکامی کے اسباب پر غور کریں تو ان اسباب کو عبدالرحیم خاں اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''۱) ہندوستانی ریاستوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ نہ دیا۔ (۲) جنگی رقبوں کی عام سول آبادی نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ (۳) انگریزوں کے خلاف عام طبقہ میں کوئی پراپیگنڈا نہیں کیا گیا اور نہ ہی عام سطح پر جنگ آزادی کی کوئی تحریک تھی۔ (۴) جدید اسلحہ اور سامان جنگ سے ہندوستانی مسلح نہیں تھے۔ (۵) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کی دولت پر قبضہ کرکے اس کو کنگال کر دیا تھا (۶) جنگو ہندوستانیوں کی جماعت میں ایسے بااثر لوگ بھی موجود تھے جو اپنی اغراض کے ماتحت انگریزوں کے ساتھ درپردہ ساز باز کر چکے تھے۔ (۷) ہندوستان کی برّی اور بحری حدود میں امن تھا اور انگریز مکمل طور پر وہاں قابض تھے۔ صرف پیشاور میں دوسو فوجیوں کو بغاوت کے الزام میں سخت سزائیں دی گئی تھیں لیکن اس سے عام سول آبادی میں کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہوا تھا (۸) عام لوگ اس وقت شخصی حکومتوں سے تنگ آ چکے تھے اور ان کے سامنے اس قسم کا کوئی ایسا پروگرام نہیں رکھا گیا تھا جس کی رو سے یہ اطمینان ہوتا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لینے کے بعد کوئی ایسی حکومت قائم کی جائیگی جو ہندوستان کے مشترکہ مفاد کی محافظت اور عام طبقہ کی صحیح نمائندگی کر سکے گی۔ (۹) ملک کے اندر پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے خطرناک ریشہ دوانیاں کام کر رہی تھیں اسی وجہ سے ہندوستانیوں میں فرقہ ارانہ حقوق ومفاد اور فوجی جھگڑوں نے افسوسناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ (۱۰) ذرائع نقل وحمل اور سلسلہ خبر رسانی پر انگریزوں کا کامل قبضہ تھا اور اس کے ساتھ پریس پر بھی پورا اقتدار تھا۔ (۱۱) اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اکیس چھاونیاں جنگ کی نذر ہو چکی تھیں، مگر وہ اس قدر بکھری ہوئی

تھیں کہ ان میں مطلقاً کسی قسم کی باہم شیرازہ بندی نہیں تھی۔ دوسرے سوائے میرٹھ کے کہیں بھی ہندوستانی معقول تعداد میں جنگ میں شریک نہیں تھے۔ اور اگر کہیں تھے بھی تو ان کا مرکزوں کے ساتھ کوئی تال میل نہیں تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے مراکز محفوظ اور مربوط تھے۔ (۱۲) ہندوستان میں تازہ دم انگریزی فوج انگلستان سے اس وقت پہنچ چکی تھی جبکہ ہندوستانی فوج کے سربرآوردہ اور محرک قائدین جنگ میں کام آچکے تھے۔ (۱۳) وفد خارجہ کے سامنے ہندوستان کی مظلومیت اور جنگ کے حقیقی اغراض کا کوئی خاکہ موجود نہیں تھا بلکہ اس کے برخلاف غلط پروپیگنڈا کے ذریعے سے بغاوت اور سرکشی کا الزام ذہن نشین کرایا گیا تھا۔ (۱۴) نئے نظام حکومت قائم کرنے اور ہندوستانیوں کے ملکی و مذہبی مفاد کی حفاظت کرنے کے متعلق حکومت نے خوشنما وعدوں سے عوام کو لٹو بنا دیا تھا۔'' [۱۲]

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب وعلل کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی از حد ضروری ہے کہ اس جنگ کے تاریخی حقاق اور تجربات و مشاہدات کے عینی شاہد ہیں اور بذات نفسِ نفیس اس میں شریک رہے اور اس جنگ کے دوران سرسید کا قیام ضلع بجنور میں تھا۔ سرسید ایک ایسے مصلحت پسند انسان تھے جو وقت اور حالات کے اعتبار سے کام کرتے تھے۔ سرسید انگریز کے حامی اور مددگار تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مغلوں کے دربار سے وابستگی اختیار نہی کی جبکہ ان کے باپ، دادا وغیرہ مغل دور میں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے باوجود سرسید نے انگریزوں کی سرپرستی اختیار کی، کیونکہ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت انگریز ملک کے مختلف حصوں پر قابض ہو چکے تھے اور پورے ملک پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش جاری تھی۔ سرسید نے تعلیمی استعداد پیدا کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں سب سے پہلے ۱۸۳۸ء میں دہلی کے صدر امین کا عہدہ سنبھالا اور عارضی سررشتہ مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی مقرر کئے گئے۔ اس دوران انہوں نے فارسی زبان میں جام جم نامی کتاب جو امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ ۱۸۴۷ء میں دہلی کی عمارتوں کی

حالت اور دہلی کے علماء وحکماء، شاعر و ادیب وغیرہ کا تذکرہ ''آثار الصنادید'' نامی کتاب میں کیا ہے۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۵ء میں بجنور میں صدر امین کے عہدے پر فائز ہوئے اور مئی ۱۸۵۷ء تک بجنور میں قیام کیا۔ قیام بجنور کے دوران انگریزوں کے خلاف جو جنگ چھڑی تھی اس کی لپیٹ میں بجنور بھی آیا۔ سید محمد احمد اپنے ایک مضمون ''سر سید احمد خاں سفر نامہ زندگی کے جستہ جستہ حالات'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بجنور کے قیام کے دوران غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو مسلح جدوجہد شروع ہوئی تھی اس کی لپیٹ میں بجنور بھی آیا اور جب انگریز افسران ضلع خالی کر کے چلے گئے تب ان کی عدم موجودگی میں اپنے ساتھیوں رحمت یار خاں، امرو خاں وغیرہ کے ساتھ ضلع کا انتظام کیا۔ مگر جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو انگریزوں کی ایما پر بجنور کا انتظام نواب محمود خاں کے سپرد کر کے دہلی روانہ ہو گئے اور جب انقلابیوں کی آپسی پھوٹ کے نتیجے میں وہ ناکام اور انگریز کامیاب ہوئے تو پھر واپس بجنور آ گئے۔ سید احمد نے بجنور میں جس طرح کام کیا اس کی نسبت ڈپٹی نذیر احمد نے جن کا وطن خود بجنور تھا، تحریر کیا ہے ''عمدہ تسلّط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سر سید کی مٹھی میں تھی۔ اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کے ہوتے تو بجنور کے حصے میں قیامت آ گئی ہوتی۔ سید احمد کی بدولت بجنور ہی ایسا ضلع تھا جو عواقب بغاوت غدر سے محفوظ رہا۔'' [۱۳]

۱۸۵۷ء کے جنگی احوال کے دوران سر سید نے بجنور اور دہلی دونوں مقام کا بخوبی جائزہ لیا اور عینی شاہد ٹھہرے۔ ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی سے بغاوت کی لہر شروع ہوئی اور باغی سپاہیوں نے ۱۱ر مئی کو دہلی پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کو (جنکی حکومت لال قلعہ کے اندر تک محدود تھی) ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینے کی استدعا کی۔ ۱۲ر مئی کو بغاوت کی چنگاری بجنور تک پہنچ گئی تھی۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا۔ بجنور میں موجود انگریز خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے مکانات کو چھوڑ کر ضلع کلکٹر مسٹر شیکشپئر کے بنگلے میں جمع ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً بیس تھی۔ باغیوں کی ٹولی بھی بجنور پہنچ چکی تھی۔ ۱۳ر مئی تک بجنور کے اردگرد اضلاع بریلی، مرادآباد، شاہ جہاں پور، پیلی بھیت وغیرہ پر

باغیوں نے حملہ بول دیا تھا جس میں بعض انگریز افسران بھاگ نکلے اور بعض قتل کر دیئے گئے۔ بجنور میں سر سید اور نواب محمود خاں کی کوششوں سے ان انگریز حکمراں اور ان کے بال بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچایا اور ان کو قتل ہونے سے بچایا۔ سر سید کی حکمت عملی نے انگریزوں کو محفوظ رکھا اور اپنے وقار کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ کیونکہ سر سید ان کی ملازمت کر رہے تھے۔ ان کی جان بچانا ان کا فرض تھا اور انہوں نے وہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' نامی کتاب مرادآباد میں صدرالصدور کے عہدے پر فائض ہونے پر اپریل ۱۸۵۸ء میں تحریر کی۔ اور ان کی دوسری کتاب جو ۱۸۵۷ء کے مجموعی صورتحال اور جنگی احوال کے اسباب وعلل انگریزوں کے ان کمیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''اسباب بغاوتِ ہند'' اپریل ۱۸۵۹ء میں کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سر سید نے انگریزوں کو ان کے جرم اور جنگ غدر کا آئینہ دکھایا ہے۔ سر سید خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مگر ان فسادات کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہ اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں، اس لئے مجھ پر واجب ہے کہ گو ان کا علاج بخوبی ہو گیا ہو پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں ان کو بھی ظاہر کر دوں۔ سچ ہے کہ بہت بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو، بہتر ہے کہ ایسے شخص کی بھی ایک رائے رہے۔''[۱۴]

اس طرح سر سید نے مسلمانوں کی تباہی کو بیان کیا اور انگریز جو مسلمانوں سے چن چن کر بدلہ لے رہے تھے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ مسلمان تھے۔ اس کتاب کے ذریعے سر سید نے بغاوت کے اسباب لکھے اور اس کا تجزیہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ بغاوت کی تمام ذمہ داری انگریز حکومت اور ان کی غلط پالیسی پر ڈال دی ہے۔ اسباب بغاوت ہند جب لکھی گئی تو اس وقت ملک میں امن وامان کا کوئی گمان نہ تھا اور لوگوں کے دلوں میں انگریز حاکم اور ان کے پروردہ افراد کے غم وغصہ کا قہر جاری تھا اور جنگ وجدال پر آمادہ تھا۔ سر سید کا اہم کام ہندوستان میں عوام کو یکجا اور ایک پلیٹ فارم پر لانا تھا۔ وہ اپنی قوم اور ملک کو بڑے بڑے خطروں سے بچانا چاہتے تھے کیونکہ

سرسید احمد خاں نے غدر کی خوفناک صورت حال خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس لئے ان سب حالات کو دیکھ کر سرسید احمد خاں کو خاصی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تو ایسے تباہ کن حالات میں انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن ان کی انا نے ان کی آنکھیں کھولیں اور ان کے ضمیر نے ان کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا کہ ''سرسید تم بزدل ہو'' ان کے ضمیر نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ تم ملک کا ساتھ دینے کے بجائے بزدل کی طرح حالات سے بھاگ رہے ہو۔ چنانچہ سرسید کی جب آنکھ کھلی تو ان کا ارادہ بدل گیا۔

بقول مولانا حالیؔ غدر کے بعد وہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے بہت پریشان و افسردہ تھے اور ان کی حالت ایک ایسے آدمی کی تھی جس کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور بقیہ حصے کو بچانے میں ہمہ تن مصروف ہو۔

غدر کے دوران سرسید احمد خاں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ جو تحریک انگریز چلا رہے ہیں وہ مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اس تحریک میں کوئی جان نہیں۔ جہاں تحریک بے جان ہے وہیں مغل حکومت بھی اپنی قوت کھو چکی ہے۔ دوسری جانب مسلمان بھی خاصی خستہ حالی میں ملوث ہیں۔ ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو اس بات پر یقین ہوگیا کہ اگر انگریزی عوام کو ہندستان سے باہر نکال کر الگ کر دیا جائے تو پھر بھی مسلمان قوم ہندوستان پر اپنا قبضہ نہیں کرسکتی کیونکہ اس دوران مختلف ومتعدد قومیں مثلاً جاٹ، سکھ، مرہٹے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے جس سے کہ مسلمان کسی حالت میں بھی ان طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

تیسری جانب سرسید کو یہ بھی خطرہ تھا کہ جو جاٹ، سکھ اور مرہٹوں سے زیادہ طاقتور قوم تھی جس کو ڈچ اور فرانسیسی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ ان کا ہی قبضہ کہیں ہندوستان پر نہ ہو جائے کیونکہ یہ غیر مہذب قوم انگریزوں سے زیادہ طاقتور تھی۔ یہ تمام باتیں سرسید کو پریشان کر رہی تھیں تو ان سبھی تباہ کن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سرسید احمد خاں نے یہ فیصلہ لیا کہ مسلمانوں کو اس غدر کی لڑائی میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ اگر ان کو اس غدر میں شامل کیا جائے تو انگریزوں سے دوستی کر لینی چاہیئے۔ لہذا جب غدر کا آغاز ہوا تو اس دوران سرسید احمد خاں بجنور میں تھے تو اس دوران بجنور میں نواب محمود علی خاں کا راج تھا اور محمود علی خاں اس بات کے بالکل قائل نہ تھے کہ سرسید انگریزوں کی مدد

کریں۔اس دوران سرسید انگریزوں کی دل و جان سے حفاظت کرنے میں مصروف تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ اگر ہمیں کسی سے کوئی مطلب نکالنا ہے تو وہ پیار اور محبت کی بنا پر ہی نکال سکتے ہیں۔جہاں ایک جانب نواب محمود علی خاں سوچتے کہ انگریزوں کو مار دیا جائے وہیں دوسری جانب سرسید انگریزوں کی حفاظت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اس لئے نواب صاحب اوران کے چند رفقاء سرسید احمد خاں کی جان کے دشمن ہو گئے لیکن ان حالات کا سامنا کرنے کے بعد بھی سرسید اپنے ارادوں پر قائم رہے۔سرسید کا مقصد انگریز قوم کو ہندوستان میں حکومت کرانا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کو ان کا حق دلانا تھا۔جس بات کا تذکرہ ہم سرسید احمد خاں کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' مرتب ڈاکٹر فوق کریمی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ملاحظہ ہو درج ذیل اقتباس:

> ''سرسید قوم فروش اور وطن دشمن نہیں تھے ان کی قوم پروری اور حب الوطنی انگریز کے دور میں بھی اس درجہ پر خلوص اور پاک وصاف تھی کہ آج کے بعض قومی رہنماؤں کے خلوص اور حب الوطنی پر تو انگلی اٹھ سکتی ہے لیکن سرسید کے کردار پر حرف نہیں آتا۔انگریز کے جابرانہ دور میں بھی سرسید ابن الوقت،خوشامد پسند،مصلحت کوش ہوتے تو ان کا نام بھی ملک کے راجہ اور نوابوں کے ناموں کے ساتھ لیا جاتا۔۱۵

عوام کے دلوں میں یہ سوال بہت تیزی سے ابھرتا ہے کہ جہاں سرسید انگریزوں کے فرماں بردار بنے ہوئے تھے تو ان کو انعام و اکرام سے نوازتی تھی،مگر سرسید ان انعامات کو قبول کرنے سے انکار کردیتے تھے۔دوسری جانب سرسید اس بات سے خفا تھے کہ سرولیم میور نے رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کے حوالے سے ایک کتاب (Life of Mohammad) لکھی جس میں بہت ساری باتیں غلط لکھی تھیں اس کتاب کی تردید میں سرسید نے انگلستان کا سفر کیا اور اس کا جواب لندن میں بیٹھ کر'' خطابات احمدیہ'' کے نام سے دیا۔غرض کہ سرسید احمد خاں نے انگریزوں سے دوستی ہندوستان میں مغربی علوم لانے کے لئے کی تھی۔ان کا قیاس تھا کہ ہندوستانی اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ مغربی علوم سے روشناس نہیں ہو جاتے۔

سرسید احمد خاں نے بھی بغاوت ہند میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کا اصل مقصد ہندوستانی مسلم قوم کو یکجا کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانا اور آپس میں ایک دوسرے سے بھائی چارے کے ساتھ پیش آنا تھا۔سرسید کا اصل مقصد قومی اتحاد اور مغربی علوم کو عام مسلمان تک پہنچانا تھا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے ذریعے سرسید نے ۱۸۵۷ء کے حالات رونما ہونے کے اسباب اور اس کے محرکات کو بڑی خوش اسلوبی اور جرأت و ہمت کے ساتھ انگریزوں کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور ان کو ان حقائق سے آشنا کرایا جن کے بدولت ہندوستان میں بغاوت کے آثار رونما ہوئے اور لاکھوں انسانوں کی جانیں بے دریغ چلی گئیں۔ ہر طرف قتل و غارت گری سے ملک کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔سیاسی،معاشی،عدلی،اور سماجی حالات بہت خراب ہو گئے۔غم اور مایوسی کی گھٹائیں ہر طرف چھا گئیں۔ بہادر شاہ ظفر قید کر کے رنگون بھیج دیئے گئے اور ملک ۱۸۵۷ء کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ان ہی تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسباب بغاوت ہند وجود میں آئی۔

حواشی

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف		صفحہ نمبر
۱۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں / ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	۲۰
۲۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	۲۷۔۲۶
۳۔	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	ادبی دنیا، دہلی	۲۱
۴۔	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	ادبی دنیا، دہلی	۸۲۴
۵۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	۳۳
۶۔	۱۸۵۷ پہلی جنگ آزادی	مرتب ارتضٰی کریم	ترقی اردو بیورو، دہلی	۳۳
۷۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں / ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن تریق اردو دہلی	۳۷
۸۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں / ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	۳۸
۹	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی۔سی۔جوشی	ترقی اردو بیورو، دہلی	۴۱
۱۰۔	خطوط غالب	مرتبہ خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی	۶۸۔۲۶۷
۱۱۔	۱۸۵۷ پہلی جنگ آزادی واقعات اور حقائق	میاں محمد شفیع		۲۰۲

۱۲۔	انقلاب ۱۸۵۷ تصویر کا دوسرا رخ	مولانا عبدالرحیم خاں / مترجم حسام الدین	اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۶۔۱۵
۱۳۔	سرسید احمد خاں۔ ایک عہد ایک تحریک	مرتبہ پروفیسر محمد تلاوت علی	کتابی دنیا، دہلی
۱۴۔	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں / ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۷
۱۵۔	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں / ڈاکٹر فوق کریمی	کتب خانہ انجمن دہلی ۴۵

سیاسی کشمکش اورعوامی اضطراب

اٹھارہویں صدی کی پہلی دہائی میں مغلیہ سلطنت کے عظیم روح رواں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد ہندوستانی تخت وتاج اور ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ یہ صدی مغل حکمرانوں کے زوال کی صدی ہے۔اس کے ٹوٹنے اوربکھرنے کی لازوال داستانیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی سیاسی کشمکش اورعوامی اضطراب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اٹھارویں صدی میں ہونے والے سیاسی وسماجی احوال کا بغور جائزہ لیں اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اسباب و محرکات کا سیاسی تناظر میں ملکی وغیر ملکی طاقتوں کے زیر اثر ہونے والی سیاسی کشمکش کو سامنے لائیں۔

مغل سلطنت کے حکمرانوں میں ہمایوں، جلال الدین اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں وغیرہ نے بڑی شان وشوکت سے ملک کے اقتدار کو سنبھالا سنوارا اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔شاہ جہاں کے بعد ان کے بیٹوں میں تخت شاہی کے لئے خانۂ جنگی شروع ہوگئی جس میں اورنگزیب نے داراشکوہ اور شجاع کو شکست دی اور ملک کے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالی اور سیاسی مصلحت کے پیش نظر اپنے والد شاہ جہاں کو آگرہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اڑتالیس سالہ دور اقتدار میں انہوں نے ملک کے رقبے میں خوب اضافہ کیا۔ان کی حکومت کا دائرہ آسام سے سندھ اور کشمیر سے کیرالا تک پھیلا ہوا تھا۔چین کے بعد دوسری سب سے بڑی حکومت قائم کی تھی۔جس کی نظیر پوری تاریخ ہند میں اشوکا کے بعد کسی زمانے میں نہیں ملتی۔جس کا رقبہ کابل سے کنیا کماری تک چوبیس لاکھ کلومیٹر تھا۔اورنگ زیب ذی علم اور فہم وفراست کا مالک تھا۔ان کی ذاتی زندگی ایک نیک انسان کی شکل میں ابھرتی ہے۔انہوں نے پوری زندگی سادے

انداز میں گذاری ہے۔ بیت المال سے کبھی اپنے ذاتی خرچ کے لئے کوئی رقم نہیں لی۔ البتہ زندگی گذارنے کے لئے انہوں نے ٹوپیاں سی کر اور قرآن کریم کی کتابت کر کے اپنا گذارہ کیا۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ:

''اس کی ذاتی زندگی ایک نیک انسان کا نمونہ تھی وہ ان تمام برائیوں سے بری تھا جو ایشیا کے بادشاہوں اور شہزادوں میں عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ وہ سادگی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ زندگی کی ضروریات کا بھی تارک تھا۔ وہ کھانے پینے میں، لباس اور زندگی کی تمام ضروریات میں روکھے پھیکے موٹے بھدے پر قناعت کرتا تھا۔ بادشاہت کے نظم ونسق کے بھاری کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن کی نقل کرنے اور ٹوپیاں سینے کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔ اپنی آخری وصیت میں، اپنے تجہیز وتکفین کے اخراجات کے متعلق اس کی ہدایت یہ تھی کہ ''چار روپے اور دو آنے ٹوپیوں کی قیمت میں سے بچ رہے ہیں جو میری سی ہوئی آیا بیگ محلدار کے پاس ہیں اس کو لے لو اور اس بے کس مخلوق کے کفن پر خرچ کرو۔ تین سو پانچ روپے اس اجرت سے بچے ہیں جو قرآن کی نقل کرنے کے صلہ میں مجھ کو ملے ہیں وہ میرے ذاتی اخراجات کے لئے میرے بٹوے میں ہیں، اسے میری موت کے دن فقراء میں تقسیم کرو۔''[1]

اورنگ زیب نے بڑی محنت، جانفشانی اور دل لگی سے اس ملک کو سینچا تھا مگر ان کی سخت گیری اور اندرونِ خانہ پر کم توجہی کے باعث ملک کے حالات دگرگوں تھے اس کے باوجود بغاوت کی چنگاری پھوٹنے اور کسی بھی طاقت کو سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی لیکن ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد ملک کے حالات یکسر بدل گئے۔ اورنگ زیب کی وفات گویا مغلیہ سلطنت کا زوال تھا۔ یہیں سے مغل حکمرانوں پر نئی آزمائشیں شروع ہوئیں۔ اورنگ زیب کے بیٹوں میں معظم، اعظم اور کام بخش تینوں تخت کی وراثت کے لئے باہم لڑ پڑے۔ بالآخر معظم نے کامیابی حاصل کی اور ''بہادر شاہ'' کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا۔ ابھی چار سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کی

وفات ہوگئی اوران کے چار بیٹوں میں دو بیٹوں ''عظیم الشان'' اور'' جہاندار شاہ'' کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں جیت جہاندار شاہ جو کہ ایک عیاش قسم کا انسان تھا اس کی ہوئی۔اس کی بھی حکومت سال بھر رہی اوراس کے بھتیجے عظیم الشان کے لڑکے فرخ سیر نے ۱۷۱۲ء میں اقتدار اس کے ہاتھوں سے چھین لیا اور جہاندار شاہ کو قتل کروادیا گیا کیونکہ جہاندار شاہ ایک ناعاقبت اندیش،شراب و شباب کا رسیا حکمران تھا۔شہنشاہیت کی عظمت کو اس نے تار تار کردیا تھا۔فرخ سیر جو کہ بارہہ کے سیدوں کے زیرتوسط بادشاہ بنا لیکن یہ بھی ناکارہ ثابت ہوا اور سید برادران سے دشمنی مول لے لی۔ سید برادران جتنے وسائل فرخ سیر کو دیتے تھے اس کے عوض ان کو حکومت اور تقرریوں کے معاملات میں دخل اندازی اور فیصلے کا حق مانگ رہے تھے جس سے دونوں کے درمیان تلخی بڑھتی چلی گئی۔سازشوں کا انبار،حسین علی جو کہ شاہی افواج کا سردار تھا۔اسے قتل کروانے کے لئے جودھ پور کے باغی راجہ جیت سنگھ راٹھور کو مقرر کیا۔ان کی سازش ناکام ہوئی۔بلآخر حسین علی نے اپنی فوج کے ہمراہ دلّی کے لال قعلہ کا محاصرہ کرکے فرخ سیر کو جس نے عورتوں کے حجرے میں پناہ لے رکھی تھی۔ اسے قید کرلیا گیا اور اندھا بھی کردیا۔کال کوٹھری میں بند کرکے رکھا گیا اور زہر کے اثر سے اس کو قتل کروادیا گیا۔اس کے دور حکومت میں ہر طرف بدامنی پھیل چکی تھی۔قبائلی جماعتیں حکومت کی خلاف ورزی پر اتر آئی تھیں۔راہ گیروں کو لوٹنا ان کے عہد میں عام پیشہ بن گیا تھا جبکہ اورنگ زیب کے زمانہ میں تمام چیزوں پر سختی سے معاملات کا نپٹارا کیا جاتا تھا۔کسی کی مجال تھی کہ بدعہدی پر اتر آئے لیکن حالات بدل چکے تھے۔سید برادران زیادہ عرصے تک حکومت نہ کرسکے کیونکہ احمد شاہ کو لوگ ناپسند کرتے تھے۔

اورنگ زیب کی وفات تک مرہٹوں کی طاقت بکھر چکی تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد مرہٹوں کا طاقت دوبارہ بحال ہورہی تھی۔مرہٹہ قوم مہاراشٹر کے مغربی گھاٹ میں بسنے والی قوم ہے۔ان کا تعلق شودر طبقہ سے تھا اور یہ نسلاً دراوڑ تھے۔یہ لوگ عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں کی حکومت میں فوجی ملازم تھے۔سترہویں صدی کے آواخر میں ایک جوان مرد مرہٹوں کا سردار شیواجی بھونسلے نے اپنے طبقے کے افراد کو ایک آزاد مرہٹہ ریاست کے قیام کے لئے تیار کیا اور اپنی طاقت بڑھائی۔اورنگ زیب نے ان سے مقابلہ کے لئے صوبیدار شائستہ خاں ۱۶۶۵ء میں بھیجا تھا

لیکن ایک معاہدے کے بعد کئی علاقے جن پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا اورنگ زیب کے حوالے کر دیے لیکن بعد میں ان کی محنت اور جستجو کی وجہ سے ان کی حکومت ویلور اور میسور کے کچھ علاقوں پر تھی جسے اورنگ زیب نے تسلیم کیا۔ اس کے بعد ان کے بیٹے سنبھاجی بھونسلے نے مرہٹوں کی قیادت سنبھالی۔ پھر یہ اقتدار بالاجی باجی راؤ کے پاس آیا ان کا اقتدار ۱۷۲۰ء تک رہا۔ یہ مرہٹوں کے عروج کا دور کہلاتا ہے۔ مغل حکمرانوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں سے مقابلہ کر سکتے۔ دن بدن پہاڑی علاقوں سے اور سرنگوں میں چھپے باہر آنے لگے۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ان لوگوں کو جہاں چھپنے کا موقعہ ملا وہ چھپ گئے اور اب دوبارہ ان کی عسکری طاقت بڑھنے لگی تاکہ دوبارہ مرہٹہ ریاست قائم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مرہٹوں نے بہادر شاہ اول کے زمانے ۱۷۱۰ء میں بیجاپور، برہان پور اور اورنگ آباد پر حملے تیز کر دیئے اور ان کی زمینی مقبوضات بڑھنے لگیں۔ ۱۷۳۸ء میں محمد شاہ جو نا کارہ بادشاہ ثابت ہوا اس کے عہد میں مرہٹوں نے مالوہ اور بندھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا جس سے محمد شاہ کو بہت تکلیف ہوئی۔ اس کے بعد مرہٹوں کے دل ودماغ میں ہندوستان پر قابض ہونے کا بھوت سوار ہوا اور اس کے لئے تگ ودو بھی شروع کر دی۔ دربار میں سیاست کی کٹھپتلی کا کھیل کھیلنا شروع کیا۔ گروہ بندی کرنے کی کوشش کی۔ ملک کے کئی حصوں پر وہ قابض ہو چکے تھے۔ مغل سلطنت کے حکمراں اپنی عیاشی میں مصروف تھے جس سے ان کی حدود ارضی دن بدن سمٹتی جارہی تھی۔ مرہٹوں نے دہلی اور نواح دہلی کی آبادیوں کو خوب لوٹنا شروع کیا اور بار بار لوٹا۔ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے دلّی سے آگے بڑھ کر لاہور پر قبضہ کر لیا ساتھ ہی ساتھ ملتان اور پشاور بھی ان کے زیر اقتدار آ گیا۔ لاہور میں مرہٹہ سردار کو استقبالیہ دیا گیا۔ یہ سردار اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور آیا اور جون میں دہلی چلا گیا۔ اس درمیان شہر کے لوگوں کا جینا حرام کر دیا۔ ان کے ساتھ خوب ظلم و زیادتی کی گئی۔ اسی وجہ سے وہاں جو بھی برا حاکم آیا اسے ''تلنگے'' کا خطاب ملا۔ ۱۷۶۱ء تک آتے آتے مرہٹوں کا ظلم و جبر بڑھتا چلا گیا۔ بلآخر اسی سال ۱۷۶۱ء میں افغانستان کا حاکم احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اس کا مرہٹوں کے ساتھ پانی پت کے میدان میں معرکہ ہوا جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی اور دولاکھ سے زائد مرہٹے مارے گئے اور دہلی میں شاہ عالم ثانی کو حکومت کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ ملک کے حالات بہت خراب تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے پہاڑوں کے پیچھے

ملک کونجات دلانے کے راستے تلاش کر لیے تھے۔اسی وجہ سے انہوں نے خدا کا واسطہ دے کر احمد شاہ ابدالی کومرہٹوں سے نجاد دلانے کی درخواست کی بلا آخر احمد شاہ ابدالی آیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کوزبردست شکست دی۔سید غلام علی لکھتے ہیں کہ:

''اس روز میدان جنگ میں ایسا رن پڑرہا تھا جس کو الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہے۔ بانوں کی آوازیں بے شمار قہقہوں کی صدائیں بلند کرتی تھیں۔توپیں گرج رہی تھیں۔بندوقوں کی باڑ چل رہی تھیں۔تیر اڑ رہے تھے اور اس کثرت سے تیروں کی بارش تھی کہ میدان پر ایک گھٹا سی چھائی ہوئی تھی۔تلواریں چمک رہی تھیں اور لڑائی تلواروں سے،خنجروں سے،چھریوں سے اور کٹاروں سے شروع
ہوگئی تھی اور اس روز سرشام مرہٹہ لشکر کو تاریخ کی سب سے بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ابدالی کے متحدہ فوجی محاذ کو فتح حاصل ہوئی۔''[۲]

شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی سے ایک اور درخواست کی تھی کہ مسلمان کا مال نہ لوٹا جائے اور کسی مسلمان کی عزت میں فرق نہ آنے پائے۔ولی اللہ کی پہلی آرزو تو پوری ہوگئی لیکن دوسری آرزو جو کہ مال و دولت سے وابستہ تھی پوری نہ ہوئی اور ابدالی کی فوج نے پنجاب اور دلّی کی مالی اثاثوں کو نچوڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جو شاہ ولی اللہ کی تمناؤں کے خلاف تھا اور مغلوں کی بچی کچی دولت بھی اس طرح چلی گئی۔اس طرح یہاں سے مرہٹوں کے سیاسی زوال تو شروع ہوا لیکن شاہ عالم کے زمانے میں انگریزوں کے ساتھ مل کر دلّی پر قابض ہوئے اور لارڈ لیک کی فتح دلّی (۱۸۰۳ء) تک ان کے ساتھ رہے۔اور سب سے اہم بات یہ کہ شیر میسور ٹیپو سلطان کے ساتھ انگریزوں کی لڑائی میں مرہٹوں نے انگریزوں کا خوب ساتھ دیا جس سے ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا گیا۔

یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ انگریزوں کی آمد کے حوالے سے باب دوم میں طویل گفتگو ہوچکی ہے۔انگریز بغرض تجارت ہندوستان آیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنے تجارتی مراکز کو مضبوط کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تجارتی مراکز کو چلانے لگا۔اورنگ زیب کے زمانہ میں انگریزوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ فوجی قلعے تعمیر کروائے۔اورنگ زیب نے گورنروں کو حکم دیا کہ ان کے تجارتی

امور پر پابندی لگادی جائے۔جب شاہ انگلستان جیمس دوم کواس کی اطلاع ملی تو مشرقی بنگال کے بندرگاہ شہر چٹگام پرحملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ان کوشکست ہوئی اوران کی تجارت پر پابندی لگی، لیکن بعد میں ۱۶۹۰ء میں منت سماجت کے بعد دوبارہ اورنگ زیب نے تجارت کی اجازت دے دی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعدانگریز سیاسی بساط کو پھیلانے میں مصروف تھا۔مرہٹوں کی نقل وحرکت پران کی گہری نظرتھی ۔اپنی طاقت کوسیاسی ،فوجی ، مالی اور دیگرامور پر مکمل عبور حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔اسے اپنی تیاریوں پر یقین ہوگیا تواس کے بعدانتظامی امور میں دخل اندازی کرنے لگے۔مرہٹوں اور ہندوستانی حکمراں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کرناٹک اور بنگال کے مشرقی کلکتہ پر قبضہ جمالیا۔مدراس پران کی گرفت بہت پہلے ہی مضبوط تھی۔۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ جوکہ بنگال کے مرشدآباد کا حاکم وقت تھا پلاسی کے میدان میں انگریزوں سے گھمسان کی لڑائی لڑی لیکن ان کا ہی وزیر میر جعفر نے غداری کی اورانگریزوں کے ساتھ جا کرمل گیا۔جس سے سراج الدولہ کوشکست ہوئی ،جبکہ سراج الدولہ کے پاس ستر ہزارفوج تھی اورانگریزوں کے پاس محض تین ہزار سپاہی تھے۔ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے سراج الدولہ کوگرفتار کر کے قتل کردیا۔میر جعفر کے داماد میر قاسم ،شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی فوج نے مل کر بکسر کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں انگریزوں سے جنگ لڑی اس میں بھی مسلمانوں کوشکست ہوئی جبکہ ان کے پاس پچاس ہزارفوج تھی اورر انگریزوں کے پاس سات ہزارفوج ۔اس کے باوجود ہاران کا مقدرتھی۔شکست کے بعدشاہ عالم نے مصالحت کرلی اوران کا وظیفہ خوار بن گیا۔اس کے بدلے بہار، بنگال اوراڑیسہ کا پوراخطہ انگریزوں کے حوالے کردیا۔تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۷۶۰ء کے ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کے نقشہ پرنظر ڈالیےتو یہ معلوم ہوگا کہ مشرق میں بنگال کے کثیر حصے پر پلاسی کی جنگ کے نتیجہ میں عملی طور پر قابض ہو چکے تھے۔ جنوبی ہند کے مشرقی ساحلوں پر وزیگا پٹنم ،کٹک،ایلور،مدراس،ٹوٹا کارن اور مغربی ساحلوں پرسورت بمبئی اورکوچین ان کے مقبوضات میں شامل تھے۔

یہ وہ دور ہے کہ جب کلائیو (Clive) کی فتوحات کے بعد کمپنی ہندوستان میں اپنے پاؤں جما چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے مقبوضات کے ساتھ ساتھ بنگال جیسا خوش حال علاقہ ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔ چنانچہ اب وہ مشرقی ساحلوں کی تجارتی کوٹھیوں کے مالک ہی نہ تھے بنگال کے بھی مالک بن چکے تھے۔۱۷۸۴ء میں ہندوستان کے نقشہ پر کمپنی کے مقبوضات پر نظر دوڑائیے تو واضح طور پر ان مقبوضات کی وسعت میں کافی اضافہ نظر آتا ہے۔۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر (Battle of Buxur) کے نتیجہ میں شاہ عالم ثانی کی طرف سے وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے حقوق ۱۲؍اگست ۱۷۶۵ء کو الہ آباد میں حاصل کر چکے تھے، ہندوستان میں پہلی بار مشرقی حصے پر ان مقبوضات ایک جغرافیائی اکائی کی صورت اختیار کر گئے تھے جس سے وہ اس علاقے میں ایک طاقت کے طور پر نمودار ہونے والے تھے۔''۳؎

۱۷۷۲ء میں ہندوستان میں پہلے انگریز گورنر جنرل ہسٹنگ کا تقرر عمل میں آیا۔ اس کے آنے کے بعد ملک میں انگریزوں کے قدم اور مضبوط ہو گئے۔ فوجی طاقت میں بھرپور اضافہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوششیں تیز کر دی اور دونوں کو آپس میں لڑانے کے حربے خوب استعمال کئے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نظر آئے۔ انگریز حاکموں کی حکمت عملی یہ تھی کہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' اس بیج نے پورے ہندوستان کی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک دوسرے سے اختلافات منافرت کے کانٹے نمودار ہونے لگے۔ ریاست میسور کے حاکم حیدر علی کے قابل فرزند اور جانشین سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے باغیانہ تیور اور حکومتی سطح پر دخل اندازی کی چال کو سمجھ چکے تھے۔ اسی وجہ سے انگریزوں کو ابتدائی دنوں سے ہی ان کے خلاف تھے۔ ادھر انگریز ایک مضبوط ریاست یعنی میسور کو اپنے قبضے میں لینے کی تگ و دو میں تھا۔ کیونکہ شمالی ہند میں مغل حکمران اپنی نااہلی کے سبب ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر چکے تھے جس کی وجہ سے ۱۷۶۴ء میں شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی وغیرہ کو شکست ہوئی اور وہ انگریزوں کے تابع بن کر ان کے وظیفہ خوار ہو گئے۔ یہی سوچ لے کر انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے ساتھ جنگ کرنے کی کوشش

کی لیکن ٹیپو سلطان ایک مرد مجاہد،قومی جذبہ سے سرشار تھا۔ بڑی بہادری کے ساتھ انگریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اپنوں کی سازش نے ہمیشہ دھوکہ دیا میر صادق انگریزوں سے جا ملا ادھر مرہٹوں کا مقصد مسلمان حکومت کو نیست و نابود کرنا تھا اس طرح کئی طاقتیں ایک ساتھ مل کر سلطان ٹیپو پر حملہ آور ہوئیں جس سے انہیں شکست ہوئی اور انہیں ۱۷۹۹ء میں شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں کو ہمت و حوصلہ ملا اور ملک کے دیگر حصوں پر بھی یلغار شروع کر دی جس سے انہوں نے پنجاب، سندھ اور برما وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔

ہندوستان کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ ہر چہار جان سے ہر شخص اس پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ مغلوں کی حکومت برائے نام ہی سہی تھی ضرور، مرہٹوں کا الگ زور جس سے ہندوستان کے اکثر و بیشتر حصے پر طاقت آزمائی کر چکے تھے اور مرہٹہ ریاست کی خواہش کی تکمیل میں سرگرداں تھے۔ سکھوں نے الگ اپنی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ تیسری بڑی طاقت جاٹوں کی تھی ان کا حلقہ متھرا، آگرہ اور بھرت پور تک پھیلا ہوا تھا۔ مغل حکمراں سے اکثر ان علاقوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ جاٹوں کے ذریعے انسانی تباہی ہوئی۔ غریبوں اور بدحال لوگوں کو پریشان کرنا ان کا پیشہ تھا۔ اورنگ زیب دکن کی مہمات میں مصروف تھا تو اس وقت ان جاٹوں کو موقع ملا اور ان لوگوں نے مغل سرکار کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا اور مغل فوجیوں کو خوب روندا۔ شاہراہ پر مسافروں کو لوٹنا اور ان کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ ان کے رہنماؤں میں تلپٹ کے زمیندار گوکل، برج راج اور راجہ رام وغیرہ کے اہم نام ہیں جنہوں نے تباہی و بربادی اور عوامی قتل و غارت گری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ عبدالقادر بیدل اس عہد کے حالات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ جس میں عوامی اضطراب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

> ''جن دنوں عالم گیر بادشاہ تسخیر دکن میں مصروف تھا، بے کسی کی برق اطراف ہند پر گر رہی تھی۔ دہلی اور گرد نواح کے لوگ حکام کی نااہلی اور سستی کے سبب اطاعت و فرمان پذیری سے منھ موڑ چکے تھے اور جگہ جگہ اپنا قبضہ و تسلط اور حکومت بنانے کے لئے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا تھا۔ متھرا کے گرد و نواح کے اکثر پرگنے انہوں نے ظلم و ستم

سے ہتھیا لئے، راستوں اور گزرگاہوں پر لوٹ مار کر کے وہ خودسری اور
بے باکی کا علم بلند کر رہے تھے۔ شرفا کی عزت و ناموس، اسیری و بے
حرمتی کی رسوائیوں کا شکار ہو رہی تھی۔ بڑے بڑوں کی آبرو ذلت و
خواری کی خاک میں مل رہی تھی۔''۴۴

ملک کے طول وعرض میں کہیں نہ کہیں جنگ وجدال کا ماحول، لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت گری کا بازار گرم رہتا تھا جس سے ملک کے باشندوں کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ کب ملک کے حالات، شہر کا ماحول بگڑ جائے ہر لمحہ بے چینی کے عالم میں گزر رہا تھا۔ سربراہان مملکت نے دہلی کے تخت وتاج کو تہہ وبالا کر دیا تھا۔ ان کی عیاشی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ انگریز ان پر مسلط تھے۔ جاٹ اور مرہٹہ اپنے اپنے علاقوں میں مصروف قبضیت میں سرگرداں تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے شورش تیز کر دی تھی۔ مغل اور سکھوں کے درمیان لڑائی جہانگیر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی۔ مذہبی گرو ارجن سنگھ لاہور کے تشدد میں مارا گیا۔ اس کے بعد سکھوں کی عسکری تنظیم کرنے والے اہم گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کی روح میں انتقامی جذبہ بھر دیا اور ہر گھر سے مقابلہ کے لئے افراد کو تیار کروایا۔ مغل حکمراں جہانگیر کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو وہ سخت برہم ہوا اور ہرگوبند سنگھ کو قلعہ گوالیار میں بند کر دیا مگر کچھ برسوں کے بعد اسے رہا بھی کر دیا۔ اس طرح مستقل ہزار ہا بار مغلوں سے جھڑپیں ہوئیں۔ اس وقت پنجاب میں مغلوں کی حکومت تھی۔ لیکن پنجابیوں نے بڑی خاموشی سے اپنی تیاری اور مختلف طور طریقوں سے مغل حکمراں کے ساتھ معرکہ آرائی ہوئی۔ اورنگ زیب نے ان کے اہم مذہبی گرو تیغ بہادر کو جو فوجی جدوجہد میں مصروف اور پنجاب کو حاصل کرنے کے لئے بھرپور تگ و دو میں لگا رہتا تھا، ان کو دلّی میں مروا دیا۔ اس واقعہ نے سکھوں کے دلوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کر دی اور مغلیہ سلطنت کے خلاف ہر سکھ اٹھ کھڑا ہوا۔ گرو گوبند سنگھ نے اپنی قوم میں قومیت کا جذبہ اور اس کے تصور کو جگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس اہم حادثے کے بعد سکھوں نے اپنی شناخت اور انفرادیت کو تقویت بخشی۔ انہی کے زمانے سے ہر سکھ اپنے نام کے ساتھ سنگھ (جس کے معنی شیر کے ہیں) لگانا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس قوم نے جداگانہ شناخت اپنے لئے مختص کی۔ جس میں کرپان، کڑا، کچھا اور کنگھا وغیرہ اشیا ہیں۔ اسی دھرم گرو نے ان کو خالصہ لفظ عطا کیا۔ اس گرو

نے آنند پور، پھول گڑھ، سوہ گڑھ اور فتح گڑھ وغیرہ ضلع بنوائے۔اس کے بعد بندہ بیراگی سکھوں کا جانشین مقرر ہوا۔ان کی قیادت میں پنجاب کے سکھوں نے خاص طور پر کسانوں، زمینداروں اور نچلی ذات کے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔انہوں نے سکھوں کے دلوں کو مغل حکومت کے خلاف اور مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بلکہ اب سکھوں کی لڑائی مغلوں کے ساتھ سیاسی اور مذہبی تھی۔ اسی وجہ سے بندہ بیراگی نے پنجاب میں سمانہ پر حملہ کر کے دس ہزار مسلمانوں کو قتل کروادیا اور شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ بلآخر گورداسپور قلعہ کے محاصرے میں پکڑا گیا اور دلّی کے چبوترے کوتوالی پر قتل کروادیا گیا۔اس کے بعد سکھوں کی جانب سے جارحیت کم ہوگئی اور وہ زور شور نہ رہا۔ایک طویل عرصے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ ابھرا۔وہ ایک سپاہیانہ زندگی گذار چکا تھا۔وہ جنگ کا ماہر تھا۔ایک چھوٹی سی ریاست کا راجہ تھا۔ان کی ریاست میں پشاور، ملتان، کشمیر، کانگڑا اور کچھ پہاڑی حصوں پر مشتمل زیر اقتدار تھا۔اس کے علاوہ سندھ اور پنجاب پر بھی مکمل طور پر قابض ہو گیا تھا۔ان کی حکومت مذہبی حکومت نہ تھی بلکہ سیاسی حکومت تھی۔ اس میں ہندو، مسلم سکھ تمام لوگ بڑے عہدے پر تھے۔لیکن حالات نے کروٹ لی اور انگریزوں کا تسلط پنجاب میں بھی ہوگیا۔تارا چند لکھتے ہیں کہ:

> ''رنجیت سنگھ کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ اس نے نراج کی جگہ جو پنجاب میں پھیلا ہوا تھا ایک منظم حکومت کی عمارت کھڑی کر دی۔ بدقسمتی سے اس نے کمزور بنیادو پر یہ تعمیر کی۔ اس کی حکومت سکھوں کی مذہبی حکومت تصور نہی کی جاسکتی تھی۔ یہ عام سکھ فرقہ کے لوگوں کی رضامندانہ شمولیت پر مبنی نہ تھی کیونکہ ستلج کے اس پار کے سکھوں کے گروہ کو زبردستی شامل کیا گیا تھا اور ستلج کے اس پار کے سکھ گروہ نے ان کی طاقت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت برطانیہ کی سربراہی کو تسلیم کرلیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جن سکھوں نے ان کی ماتحتی قبول کی تھی ان کی وفاداری بھی صدق دل سے نہیں رہی۔۔۔۔۔۔اس کا پورا ثبوت اس وقت فراہم ہوا جب شیر پنجاب (مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے مرنے کے بعد انگریزوں اور سکھوں میں لڑائیاں ہوئیں۔چشم

زدن میں اس کا عظیم قصر مسمار ہو کر خاک میں مل گیا۔۵؎

اس طرح جب ہم اٹھارویں صدی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس عہد میں مختلف طبقات وجہات کی جانب سے بھرپور یورشیں ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ صدی مغلوں کے زوال کی صدی ہے۔اس صدی میں ملک کے حالات امن وسکون میں نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی الغرض ہر اعتبار سے انحطاط کے شکار نظر آتے ہیں کیونکہ مغل حکمراں اور امراو شرفا کے کردار میں گراوٹ، تعیش پسندی، اخلاقی پستی، حکام کی نااہلی وغیرہ جیسے امور ہیں۔ جس سے ملک کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور تاریخ میں یہ چیزیں سماتی چلی گئیں۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ اورنگ زیب کی طویل مدتی حکومت قابل ستائش ہے مگر ہندوستان کی سلطنت میں وسعت اور اس کی تگ ودو میں اورنگ زیب کا دکن کی جانب کوچ کرنا اور ایک طویل مدت تک جنوب میں قیام کرنے کے باعث شمال میں عسکری نظام، دہلی سلطنت، عوام ورعایا کے مابین اضطرابی کیفیت کا طاری ہونا لازمی حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جاٹوں، سکھوں اور مرہٹوں یا مغل حکمراں میں آپسی خانہ جنگی وغیرہ جیسے مسائل کا درپیش ہونا لازمی تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملہ نے پنجاب کی زرخیزی اور دہلی کو نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہر طرف بدامنی اور تباہی کی آماجگاہ بنا دیا۔ اٹھارویں صدی کا اختتام انگریزوں اور مرہٹوں کی شراکت داری کی بنا پر جنوب میں ریاست میسور کے عظیم مرد مجاہد اور قومی جذبہ سے سرار سلطان ٹیپو کی شہادت (۴؍مئی ۱۷۹۹ء) اور قوم وملت کی خاطر ان کی قربانی سے ہوئی۔ یہ وہی ٹیپو سلطان ہے جس سے انگریز خوف کھاتے تھے۔ ان کے والد حیدر علی جو ریاست میسور کے عظیم رہنما تھے۔ انگریزوں کے خلاف کئی معرکہ سر کئے اور اپنی آخری سانس تک دشمنان وطن سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ اس جنگ کو ان کے بیٹے ٹیپو سلطان نے بھی جاری رکھا۔ انگریزوں کے ساتھ خوب لڑائیاں لڑیں۔ جذبہ وطن سے سرشار ٹیپو سلطان نے کرنل بیلی آئر کوٹ، بریتھوڑ اور کرنل ہمیرسٹن جیسے بہادر اور سپہ سالاروں کو شکست دی۔ مستقل شکست پر شکست سے انگریز افسران بوکھلا گئے جس سے فورٹ ولیم بنگال کی پریزیڈنسی کے تحت کام کرنے والے حاکم لارڈ ویلزلی نے نئی حکمت عملی کے تحت مقامی حکمراں کی مدد کر کے ان کے ذریعے دوسرے حکمراں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی

اور اس کے عوض کچھ علاقے دے کر باقی اپنے قبضے میں رکھنے کی ترکیب سوچی۔اس حکمت عملی نے مثبت نتائج دیئے جس سے انگریزوں نے ملک کے طول وعرض کے الگ الگ ریاستوں میں اس حکمت عملی کو اپنایا۔اس میں بھرپور کامیابی ملی۔ٹیپو سطان کے ساتھ بھی انہوں نے یہی کیا۔ان کی شکست اور شہادت سے انگریزوں کے اعتماد اور حوصلے بلند ہوئے۔ملک کے باشندوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی غرض سے خاص طور پر مسلمانوں پر ظلم وستم ،کسانوں کے ساتھ زیادتی ،کھیتوں کی آمدنی سے زیادہ لگان لینا وغیرہ سے پریشان کیا۔ٹیپو سلطان کی شہادت نے انگریزی اقتدار کے لئے راستے کھول دیئے۔ریاست میسور کے سرنگا پٹنم کو خوب لوٹا اور اس ریاست کے مختلف حصے کر کے کچھ نظام دکن کو، کچھ راجہ میسور کو اور کچھ حصہ مرہٹہ کو دے کر سبھوں کو خوش کر دیا لیکن ۱۸۰۰ء میں جو حصہ نظام کو دیا تھا۔انگریزوں نے پھر سے واپس لے لیا کیونکہ ان کی خود کی جدوجہد سے نظام دکن کی حدود دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔یہاں تک کہ ساحل سمندر پر نظام کی حکومت تھی۔اس کے علاوہ مرہٹوں کے سردار نانا فرنویس کا بھی انتقال ہو گیا تو ان کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی اس سے انگریز فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے قبضے میں لے لیا۔باجی راؤ نے بھی انگریزوں کی ماتحتی قبول کرتے ہوئے ۳۱/دسمبر ۱۸۰۲ء کو معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں نے جگہ بجگہ قبضے کرنا شروع کر دیے جن میں قلعہ احمد نگر، اسیر گڑھ، برہان پور، بندیل کھنڈ وغیرہ مقامات پر اپنا پرچم گاڑ دیا اور لال قلعہ جہاں سے پورے ملک پر مغل حکمراں کا راج تھا ان کے زیر اقتدار رعایا اور عوام چلا کرتے تھے اب ان کا بادشاہ شاہ عالم ثانی جو مجبور و بے بس ہو کر لال قلعہ کی چہار دیواری میں بند ہے اور انگریزوں کی پینشن پر پل رہا ہے۔انگریزوں نے سلطنت کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کا نقشہ کافی بدل چکا تھا ہر طرف بدیسی حکومت کی یلغار تھی۔نئے مفتوح علاقوں میں نظم و نسق کا انتظام چلانے پر سوال کھڑے ہو رہے تھے۔اس بات سے کوئی منکر نہیں کہ فتح دل کو سکون پہنچاتی ہے وہیں دوسری طرف تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بھی ہوتا ہے کیونکہ فتح ایک گندی سیاست ہے جس میں ناانصافی ،فریبی اور تشدد ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے ہیں۔انگریزوں نے بھی یہی کیا۔مختلف صوبوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نئی حکومت

بنائی گئی تو ان کے لئے بہت سارے مسائل پیدا ہونے لگے۔حکومت کا تحفظ، کمپنی کا فائدہ، مملکت کی دوامی اور رعایا اور حکمراں کے مابین موافقت کے علاوہ سب سے اہم مسئلہ یہ درپیش آیا کہ کہاں تک ہندوستانیوں کی روایات کو منظور کیا جائے اور کہاں تک ان کو نامنظور کریں۔ انگریز افسران نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہندوستانیوں کو اثر ورسوخ حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود کردیں تا کہ حکومت کو اس سے خطرہ لاحق نہ ہوسکے۔

انیسویں صدی کے پہلے عشرے یعنی ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی نے دہلی اور کئی ریاستوں، بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی چھبیس لاکھ مال گذاری کے عوض انگریزوں کو عطا کردی۔اس وقت الہ آباد میں تھے کیونکہ غازی الدین نے جب دہلی پر حملہ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا تو ان کو الہ آباد بھگا دیا۔ جہاں وہ ہر وقت اپنی چھ سہیلیوں جن کے ساتھ ان کی پوری زندگی گزری تھی ان کو یاد کرکے روتا اور بلکتا رہتا تھا۔اسی درمیان جنگ بکسر کا اعلان ہوا جس میں شاہ عالم ثانی بذات خود موجود نہ تھا بلکہ شکست کے بعد خود کو انگریزوں کے حوالہ کردیا اور ان کا پینشن خوار بن کر زندگی گذارنے لگا۔حیرت کی بات ہے کہ شاہ عالم ایک عیاش قسم کا حکمراں نکلا جب غلام قادر روہیلہ نے قلعہ میں گھس کر عورتوں کو ذلیل کیا ان کی عزت وآبرو کے ساتھ کھلواڑ کیا اور ان کی عزتیں لوٹیں شاہ عالم اور ان کے حوارین دیکھتے رہے کچھ نہ کرسکے بلکہ خود ان کی لپیٹ میں آگئے جس سے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ مارش مین لکھتا ہے کہ:

> ''شہنشاہ دہلی اگرچہ اس وقت اپنی خودمختاری اور اپنی آنکھوں سے محروم تھا پھر بھی اس کو ہندو مسلمان یکساں سر چشمۂ عز وشان سمجھتے تھے اور شاہی مہر سے جو پروانہ منصب داری کا اس زمانے میں بھی عطا ہوتا تھا جس کی دکن کے دور دراز صوبوں میں بھی اتنی ہی قدر ہوتی تھی جتنی اورنگ زیب کے زمانہ میں۔''[۲]

انگریز اور مرہٹوں کے مابین خوب جنگیں ہوئیں جن میں مرہٹوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔شاہ عالم جو انگریزوں کا پینشن خوار تھا ان کی حکومت برائے نام ''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم'' تھی۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوگیا۔اس کے بعد دہلی کی تخت نشینی اکبر شاہ ثانی کے حصے میں

آئی۔ بظاہر یہ بادشاہ تھے لیکن ملک کی باگ ڈور لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں میں تھی۔

ملک کی مختلف ریاستوں میں یکے بعد دیگرے انگریزوں سے معاہدے ہو رہے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں ہولکر نے، دولت راؤ سندھیا نے، ۱۸۰۷ء میں باجی راؤ دوم نے، ۱۸۱۸ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں کو وزیر علی خاں کی جگہ گورنر جنرل سر جان شوب نے ان کو تخت نشین کیا اور اس معاہدے پر طے ہوا کہ ۷۶ لاکھ روپے کمپنی کی افواج کے اخراجات پر صرف کرینگے اور بارہ لاکھ تخت نشینی کے عوض ادا کرنا ہوگا۔ اس طرح یہ تمام کام بڑی آسانی کے ساتھ ہو رہے تھے۔ خود ویلزلی حیران تھا کہ قدرت ان پر اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''پورے ہوش وحواس کے ساتھ کہتا ہوں کے خود مجھے امید نہیں تھی کہ
میرے سارے منصوبے اتنی تیزی سے فوری طور پر استحکام کے ساتھ
پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔''[۷]

ویلزلی اپنے حکام، برٹش افواج کی کارکردگی اور کمپنی کے زیر اقتدار چلنے والے افراد کے کاموں سے خوش تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد میں بھرپور کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ بلاشبہ وہ کامیاب ہوا لیکن ہندوستانیوں کے حکمراں طبقہ کو کچل کر، بادشاہوں کو زیر نگیں کر کے نوابوں کو کمپنی کے ماتحت اقتدار چلانے کی، راجا اور مہاراجاؤں کے وقار کو مجروح کر کے ہندوستان پر قابض ہوئے۔ یہاں کے عوام کی زندگی کو درہم برہم کر کے، ان کے درمیان منافقانہ چال چلیں۔ ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ مصیبتوں کے پہاڑ توڑے، سماجی اور تہذیبی روایات کو ختم کرنے کی سازشیں رچیں تاکہ مغربی تہذیب وتمدن کو اپنانے پر مجبور کیا جائے۔ ان کی معاشی زندگی بد سے بتر ہوگئی۔ دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ پورا ہندوستان معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ لوگ کتے اور بلی جیسی زندگی گذارنے پر مجبور و بے بس تھے۔ بادشاہوں کے خزانے لوٹ لئے گئے، نوابوں اور راجاؤں سے خراج یعنی ٹیکس لیا گیا جو غریب کسانوں اور مزدوروں کے خون پسینے کی محنت سے کمائے ہوئے تھے ایک جھٹکے میں کمپنی کے افسران نے مداخلت کی شکل میں لے لیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستانی عوام کی بے چارگی، بےبسی، ابتر زندگی اور قتل وغارت گری سے جوجھ رہی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب قوت رکھنے والے مغل عبرتناک ذلت کا شکار تھے۔ ناکارہ بادشاہوں کی ضعف

نے ہندوستانیوں کی کمر توڑ دی۔صنعت وحرفت کی زبوں حالی،ریاستی انتظام وانصرام کا انہدام، فوجیوں کا بغیر تنخواہ کے کام کرنا اور جو فوج انگریز کے زیر اقتدار کام کررہی تھی ان کے ساتھ انگریزوں کا ظالمانہ رویہ اور ہر ریاست کے ساتھ معاہدے کے مطابق خراج نہ ملنے کی صورت میں عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔انگریزوں کی سب سے بری عادت کہ وہ اپنے سے کمتر کو حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ویلزلی نے لارڈ ہیسٹنگ کو ۱۲/نومبر ۱۸۱۸ء کو ایک مسودہ میں لکھا ہے کہ:

''بیرونی فاتحین نے دیسی باشندوں کے ساتھ تشدد آمیز اور اکثر ظالمانہ سلوک کیا ہے لیکن اتنا نفرت آمیز برتاؤ کسی نے نہیں کیا ہے جتنا ہم لوگوں نے،اور کسی نے بھی پوری قوم کو اس طرح ذلیل ورسوا نہیں کیا ہے کہ اسے ناقابل اعتماد، سچائی سے بے بہرہ اور صرف ان جگہوں پر ملازمت کرنے کا اہل سمجھا جائے ان کے بغیر کام نہ چلے۔مقبوضہ قوم کے کردار کو اس طرح تباہ کرنے کا اقدام نہ صرف غیر فیاضانہ بلکہ غیر دانشمندانہ معلوم ہوتا ہے۔''[۸]

اکبر شاہ ثانی کے دور حکومت میں بھی انگریزوں کی اتھل پتھل جاری رہی۔ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے تجارتی لبادے کو اتار کر برطانوی سامراج کے تحت حکمرانی کررہی تھی۔ولی عہدی کا نازک مسئلہ زیر غور تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولی عہدی کا اعزاز بہادر شاہ ظفر کے نام کیا۔اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۲۸/ستمبر ۱۸۳۷ء میں ہوا بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی اکیس دن کے بعد جامع مسجد کے امام میر احمد علی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔اس درمیان سکّے سے شاہی نام ہٹا دیا گیا اور شہر میں کسی اعلان کی ضرورت محسوس ہوتی تو ان الفاظ میں منادی ہوتی۔''خلق خدا کی،ملک بادشاہ کا،حکم کمپنی بہادر کا'' بہادر شاہ ظفر بھی بے دست و پا تھے۔برٹش گورنمنٹ کی جانب سے نذرونیاز، تحفے تحائف وغیرہ کا آنا بھی بند ہوگیا۔انگریزوں کی جانب سے دن بدن ذلت آمیز برتاؤ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اس گستاخانہ برتاؤ سے ہندوستانی عوام جن کے دلوں میں ان مغل شہنشاہوں کی عزت وتوقیر تھی ا ان کو بہت صدمہ پہنچا۔انگریزوں کے نزدیک بادشاہ کی عزت گویا ان کی قوت کو استحکام بخشتا تھا۔اس کے علاوہ بادشاہ کی جانب سے وظیفے میں اضافہ کا مطالبہ پر مٹکاف نے سخت مخالفت کی۔اسی طرح

بادشاہ اپنی عزت و وقار کے تحت جب کبھی کسی کو خط لکھتے تھے تو اس میں ان کی رعایا ان کے بیٹوں کی طرح ہوا کرتی تھی ان میں فدوی، ارجمند جیسے القاب لکھے جاتے تھے لیکن برٹش گورنمنٹ کے زیر اقتدار چلنے والی بادشاہی نظام کے تحت جو خطوط انگریز حکمراں کو بھیجے جاتے تھے اس میں یہ القاب ان کو ناگوار گذرتا تھا اسی وجہ سے انگریز رزیڈنٹ ہاروے بڑی حقارت کے ساتھ لکھتا ہے کہ ''مجھے خطوط میں بادشاہ کا ''فرزند ارجمند'' نہ لکھا جائے وہیں دوسری طرف گورنر جنرل کی مہر سے ''بادشاہ کا فدوی خاص'' کے الفاظ کو بھی ہٹوا دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کے مختلف والیان ریاست کو بادشاہ دہلی کے لئے القاب و آداب اور عزت واحترام کے الفاظ لکھنے سے گریز کرنے کا حکم صادر ہوتا ہے۔ ان احوال نے رفتہ رفتہ بادشاہ اور ان کی رعایا عوام الناس کو انگریزوں سے متنفر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی شکست کے بعد باجی راؤ کی پینشن کو جاری کیا لیکن ۱۸۳۹ء میں ان کے بیٹے نانا راؤ کی پینشن بند کر دی۔ بھرت پور کے راجہ کے قلعے پر گولہ اور بارود سے حملہ کر کے اڑا دیا گیا جس میں ان کی موت واقع ہوئی۔ اس قلعے سے قیمتی ہیرے جواہرات اور ان کا خزانہ لوٹ لیا گیا۔ ۱۸۱۹ء میں سنگھا پور پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔ ۱۸۲۴ء میں برما پر چڑھائی کر کے کچھ حصوں پر قبضہ جمایا اور ان سے تاوان وصول کرنے لگے لیکن ۱۸۵۱ء میں دوبارہ ان پر حملہ کیا اور اس پورے خطے کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ ۱۸۴۱ء میں سندھ پر دھاوا بولا اور اسے بھی ہضم کر لیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے حیدر آباد سندھ، خیر پور، ریاست لاڑو، ریاست روپڑ اور ۱۹۴۹ء میں ڈلہوزی نے پنجاب کو بھی فتح کر لیا۔ ۱۸۵۰ء میں تھانیسر، شاہ گڑھ، ۱۸۵۳ء میں جھانسی، کرناٹک ناگپور کو اپنے قبضے میں کر لیا اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کو نہایت ہی غاصبانہ انداز میں ضبط کیا اور واجد علی شاہ کے ساتھ بڑی حقارت اور ذلت آمیز انداز سے گرفتار کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا گیا۔ یہ تمام فتوحات ڈلہوزی نے جس انداز میں کیں اس کے بارے میں انگریز مورخ مارش مین نے اس انداز میں تبصرہ کیا ہے جس کو خورشید مصطفیٰ رضوی نے اپنی کتاب ''جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون'' میں یوں بیان کیا ہے۔

''بعض طبقات میں اس اصول کو کسی برطانوی مدبر کی کارگذاری سے
مشابہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ایسے رہزنوں کی غارت گری سے تعبیر کیا گیا جو

اپنا مال غنیمت ڈر کے مارے جنگلوں میں بیٹھ کر شمار کیا کرتے ہیں۔

ایسے طبقات ڈلہوزی کو نہایت کمینہ اور بدترین حاکم سمجھا جاتا ہے۔''۹

۱۸۵۷ء کے اسباب بغاوت ہند میں انگریز پادریوں کے ذریعے ملک کے تمام باشندوں کو عیسائیت قبول کرنے کی تبلیغ کی۔جگہ جگہ مشنری اسکول قائم کیے۔ مذہب کے تعلق سے ان پادریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن ان لوگوں نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں اوران کی مقدس کتابوں اور مذہبی مقامات کوحقارت ونفرت کی نظر سے دیکھا اوران کے رسم ورواج کو برا بھلا کہا۔ان کے اسکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔جیلوں میں بھی ظلم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو عیسائیت قبول کرنے پر زور دیتے تھے۔الغرض بڑے پیانے پراور بڑی خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں عیسائی تبلیغیت کا زور وشور تھا۔فرانسیسی عورت مسز ہورٹسٹ انگلیسی اپنی بایوگرافی میں لکھتی ہیں جس کوسرسید نے اسباب بغاوت ہند میں یوں بیان کیا ہے:

''ہم یہ ذکر کرتے جاتے تھے کہ انگلستان کا بڑا پادری چاہتا ہے کہ ہندوستان کو دین مسیحی میں داخل کرے جولوگ خوشی سے اس کا دین قبول نہیں کرتے ان سے سختی کے ساتھ پیش آتا ہے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔''۱۰

ایک اور انگریز مفکر ایوکمیڈی اپنی کتاب Savarkar میں لکھتا ہے جس کو خورشید مصطفیٰ رضوی نے بیان کیا ہے:

''خواہ ہم پر کتنی ہی مصیبتیں آئیں مگر جب تک ہندوستان میں ہماری سلطنت باقی ہے ہمیں بھولنا نہیں چاہئے کہ ہمارا اصل کام اس ملک میں عیسائیت کا پرچار ہے۔.....ہمیں اس مقصد کے لئے اپنی کوششیں اور ذرائع وقف کردینا چاہئے اور اس وقت تک اپنے کام کو پوری طاقت سے مسلسل جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ ہندوستان مشرق میں ایک زبردست عیسائی قوم نہ بن جائے۔''۱۱

بغاوت کے اسباب میں ہندوستانی سماج میں ایسے طبقات پر قہر ڈھایا گیا جس سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ جڑا ہوا تھا۔جس سے ان کا اضطراب ہونا لازمی حصہ تھا۔اس میں صنعت وحرفت،

کسان اور تجارت کرنے والوں کی بربادی نے انہیں اور برباد کریا۔ ملک کی اکثر ریاستوں کے زمیندار، کاشت کار اور کسانوں کے کھیت کھلیان اور اس کے اناج پر انگریزوں نے کم قیمت لگائی، احتجاج کی صورت میں سزا ملی۔ قید اور جرمانے کا شکار ہوئے جبکہ اس سے قبل بادشاہوں کے دور میں کاشتکاروں کے اناج پر مناسب قیمت ملتے تھے اور فراخ دلی کا ثبوت بھی ملتا تھا لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی کیونکہ انگریزوں کی نظر میں ہندوستان سونے کی چڑیا تھی۔ یہاں کی زرخیزی، زراعت اور صنعت میں بنگال کا ریشمی کپڑا آدھے سے کم داموں پر بیچنے پر مجبور کر کے انگلستان بھیجا جاتا تھا جبکہ اس سے قبل وہ لوگ ریشم کا کپڑا فرانس اور اٹلی سے کئی گنا زیادہ رقم دے کر منگواتے تھے۔ اب ان لوگوں نے فرانس اور اٹلی سے لینا بند کر دیا کیونکہ ہندوستانی ریشم کا کپڑا فرانس اور اٹلی کے کپڑوں سے بہت کم دام پر ان کو یہاں (ملک ہندوستان میں) دستیاب ہوگیا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے اپنی طاقت اور حکومت کے بل بوتے پر ملک کو خوب لوٹا، بنا داموں کے اشیاء کو خوب سمیٹا، لگان اور کرایا نے ہر ہندوستانی کی کمر توڑ دی تھی۔ جدھر دیکھو غریبی اور مفلسی کی مار جھیلنے پر مجبور تھے۔

اس طرح دیکھا جائے تو ملک کے معاشی حالات بہت خراب تھے۔ ہر آدمی انگریزوں کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور تھا لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ وہ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ان کے سامنے کئی سو سال تک حکومت کرنے والی سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جو فطرتاً ملک کا بادشاہ تھا لیکن قلعہ کے اندر ہی تک ان کی بادشاہت تھی۔ وہ خود کمپنی کی پینشن پر زندگی گذر بسر کر رہا تھا۔ کب اور کس وقت ان کی بادشاہت ختم ہونے کا اعلان ہوجائے، ہر آدمی اسی خوف و ہراس میں تھا۔ کمپنی کے افسران کی جانب سے یہ اعلان ہو چکا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد لال قلعے کو خالی کرالیا جائے گا اور ''شاہی'' کا لقب بھی ختم ہو جائے گا۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بہادر شاہ ظفر ایک ایسے حکمراں گذرے ہیں جو بذات خود بادشاہت میں کوئی کام تو نہ کر سکے لیکن ادبی محفلیں اور مشاعرے کا رنگ خوب جمایا جس سے عوامی مقبولیت، شہر کے عمائدین، صاحب ثروت ادبا، شعرا کی لال قلعے کے اندر آنا جانا ہمیشہ لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، سالکؔ، مجروحؔ، شیفتہؔ اور بڑے بڑے دیگر افراد و احباب ان

کے پاس سائے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ذوقؔ و غالبؔ کو اپنا استاد تسلیم کیا تھا۔ ان کی صحبت میں اچھی شاعری کی۔ ان کا یہ شعر:

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو

میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

لال قلعہ کے باہر اور ملک کی مختلف ریاستوں میں انگریزی سامراج کے پھیلاؤ سے ہر آدمی متنفر تھا۔ بالآخر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انگریزوں کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔ ان کے خلاف علماء، مدبر اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے والے ذی شعور اور ہوش مند افراد نے بڑی خاموشی سے ملک کے طول و عرض میں بغاوت کی تیاری کرنی شروع کردی۔ ملک کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کے ساتھ زبردست لڑائی ہوئی جس میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ پورا ملک اس غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے بعد جگہ بجا گہ انگریزوں نے ملک کو لوٹا اور اس پر قابض ہوئے۔ دن بدن ہندوستانیوں کے دلوں میں چنگاری بڑھتی چلی گئی اور اب پانی سر سے اوپر بہنے والا تھا کہ ہر طرف انگریزوں کے خلاف آواز اٹھنے لگی اور بڑی خاموشی کے ساتھ سازشیں اور بغاوت کی تیاری چلنے لگی۔

سب سے پہلے ۱۸۴۵ء میں بہار میں انگریزوں کے خلاف آواز اٹھی۔ فوجیو میں روپے تقسیم ہوئے فرسٹ رجمنٹ کا منشی پیر بخش نے بڑی خاموشی سے انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی۔ بعد میں پتہ چلنے پر میجر راکرافٹ نے ان کے گھر کی تلاشی لی، جس میں راحت علی سے ''نامہ پیام'' کا پتہ چلا، جو باغیانہ خطوط تھے۔ اس جرم میں ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ بہار کی مختلف جگھوں پر بڑی تیزی کے ساتھ باغیانہ کوششیں جاری تھیں۔ سیف علی جو شاہ دہلی کا ایلچی قرار دیتا تھا انہوں نے ہزاری باغ اور دانا پور کی دیسی فوجیوں میں بغاوت پھیلانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ دوسری جانب ۱۸۵۰ء میں پنجاب میں چالیس ہزار دیسی فوجیوں میں باغیانہ تیور کے آثار نظر آرہے تھے۔ اسی دوران دہلی اور مختلف جگھوں پر اشتہارات لگائے گئے جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں سے اپیل کی گئی تھی کہ انگریزوں سے ملک کو بچانا ہے تو ہمیں آگے آنا ہوگا۔ جامع مسجد دہلی کے اشتہار سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ایران عنقریب اس ملک میں آنے والے ہیں اور مسلمانوں کو چاہئے کہ انگریز سے

جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسی طرح لکھنؤ میں بھی اشتہار جاری ہوا جس میں لکھا تھا کہ:

''ہندو مسلمانو! متحد ہو کر اٹھو اور ایک ہی بار ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دو کیونکہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکال دیا گیا تو تم لوگوں کے لئے اپنی جانیں بچانے کا موقع بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ آخری موقعہ ہے۔ اب۔ یا کبھی نہیں۔'' [۱۲]

مدارس میں بھی اس طرح کے اعلانات نظر آئے جس میں لکھا تھا کہ:

''ہم وطنو، اور مذہب کے وفادار شیدائیو اٹھو، اٹھو! تم سب ایک ساتھ اٹھو۔ فرنگی کافروں کو نیست و نابود کرنے کے لئے۔ جنہوں نے عدل و انصاف کے ہر اصول کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ ہمارا راج چھین لیا۔ ہمارے ملک کو خاک میں ملانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ صرف ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ خوں ریز جنگ کی جائے۔ یہ آزادی کے لئے جہاد ہے۔ یہ حق وانصاف کے لئے مذہبی جنگ ہے۔'' [۱۳]

اس طرح ملک کی مختلف جگہوں پر شہروں کی دیواروں پر باغیانہ اشتہارات لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ۱۸۵۷ء سے قبل چپاتیوں کی تقسیم ایک جگہ سے دوسری جگہ پورے ملک میں ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جہاں جہاں سے یہ چپاتی گذرے اپنے آپ کو متحد کرے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار رہے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی میں بھی چپاتیاں تقسیم ہوئی تھیں اور اب سو سال گذرنے کے وقت بھی اس قومی شکست کا احساس دلانے کی غرض سے تقسیم کی گئی تھیں۔ ہندوستانی افواج کے بڑے افسروں کے نام فوجیوں نے خاموشی کے ساتھ جو خطوط لکھے تھے اس میں ان لوگوں نے انگریزوں کے ظلم وستم کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے لئے ان لوگوں نے اتحاد کا مظاہرہ کیا کہ ہم انگریز سامراج کو اس ملک سے رفع دفع کر دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ دوسری طرف مولانا احمد اللہ شاہ ہندوستان کے دورے پر نکلے اور ہر جگہ ہزاروں کے مجمع میں مذہب اور وطن کو بچانے کا طریق بتاتے اور انگریزوں کے خلاف للکارتے۔ کنور سنگھ جنگی پیمانے پر جنگ کے لئے سامان فراہم کر رہے تھے۔ سید احمد شہید کے معتقدان عظیم آباد میں انقلابی سرگرمیوں کا گڑھ بنا چکے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں اردو اخبارات نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ ان اخبارات نے ۱۸۳۲ء

سے لے کر ۱۸۵۷ء تک برطانوی ظلم و زیادتی کو بیان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جبکہ اخبارات برطانوی سرپرستی میں چھپتے تھے۔ جب پہلی جنگ آزادی کی آگ بھڑکی تو ان اخبارات نے انگریزوں کے مظالم کو خوب لکھا اور انقلابیوں کے حوصلوں کو اور حوصلہ دیا۔ اپنی تحریروں کے ذریعے ان میں اور توانائی بخشی۔ اس وقت شائع ہونیوالے اخباروں میں صدر الاخبار آگرہ، سلطان الاخبار کلکتہ، گلشن نو بہار کلکتہ، عمدۃ الاخبار بمبئی اور بریلی۔ حبیب الاخبار بدایوں، خیر خواہ ہند، مراد پور، نور الاخبار الہ آباد، ترجمان شوق، تاریخ بغاوت ہند آگرہ، کریم الاخبار دہلی، کوہ نور، لاہور، طلسم لکھنؤ، آفتاب ہند بنارس، صادق الاخبار دہلی، سراج الاخبار دہلی اردو اخبار دہلی وغیرہ اہم اخبار ہیں۔ ان اخباروں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ان اخباروں نے عوام کے دلوں اور ان کے دماغوں میں انقلابی روح بیدار کی۔ پہلی جنگ آزادی کی چنگاری جو میرٹھ سے بلند ہوکر دہلی تک پہنچی تھی اس کو بھڑکانے میں اردو صحافت کا کردار بہت اہم ہے۔ ہندوستان کے گورنر لارڈ کیننگ نے ان اخباروں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کردیئے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔''[۱۴]

ان اخباروں میں کئی اہم اخبار، دہلی اردو اخبار ایڈیٹر مولوی محمد باقر حسین، صادق الاخبار اس کے ایڈیٹر سید جمیل الدین ہجر، سراج الاخبار، بہادر شاہ ظفر، اور پیام آزادی جس کے ایڈیٹر مرزا بیدار بخت تھے۔ یہ وہ اخبارات ہیں جنہوں نے آنکھوں دیکھا حال اپنی تحریروں میں بیان کیا اور اس کے ایڈیٹروں نے اس انقلاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان اخباروں کے حوالہ سے ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو صحافت نے استعمار کی آغوش میں آنکھ کھولی اور انگریزی نظام حکومت اور سیاست کے زیرِ سایہ پروان چڑھے تاہم اس کی جڑوں میں باغیانہ رجحانات کی تخم ریزی ہوچکی تھی۔ اپنی پیش رو فارسی صحافت سے اس نے انگریز راج پر تنقید و احتساب کے آداب سیکھ لیے تھے چنانچہ دور اول کے اردو اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈالنے

سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان اخبارات نے عام طور پر محتاط ہونے کے باوجود کمپنی حکومت سے کہیں کھلم کھلا اور کہیں ڈھکے چھپے الفاظ میں بیزاری کا اظہار تواتر سے کیا۔ کمپنی حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں عام ہندوستانی کی سوچ کیا ہے اور وہ اجنبی حکمرانوں کے بارے میں کیا احساسات رکھتی ہے۔ ان اخباروں میں اس کی عکاسی ہوتی رہتی تھی۔''۱۵

۱۸۵۷ء کی جنگ سے قبل انگریزوں کے خلاف چہار جانب سے بغاوت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اخباروں نے بھی خوب کھل کر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ملک میں انقلاب کا منصوبہ بنانے والوں میں نانا صاحب پیشوا، دھوندھو پنت اور عظیم اللہ وغیرہ نے اپنی کاوشوں کو جاری رکھا۔

ملک کے حالات دگرگوں تھے۔۱۸۵۲ء سے انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کے عقائد اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی۔ ان کو عیسائیت کی دعوت دی، قبول نہ کرنے کی صورت میں انگریز افسران نے ہندوستانی اتحاد، ہندو مسلم کے مابین ٹکراؤ پیدا کرنے کی صورت پیدا کی۔ کیونکہ انگریز اس بات سے واقف تھے کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے نزدیک سؤر حرام ہے۔ اس لئے ان دونوں قوموں کے درمیان آپس میں بھید بھاؤ کا گھنونا کھیل کھیلنے کی کوشش کی۔ جو لوگ ہندوستانی فوج کی شکل میں انگریزوں کے محافظ تھے ان کے لئے نئے کارتوس ایجاد ہوئے جس میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی گئی تھی۔ ان کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے کا حکم تھا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ حالانکہ آج تک ان انگریز مفکروں نے الگ الگ انداز میں لکھا ہے کہ اس میں کوئی سؤر اور گائے کی چربی نہ تھی بلکہ ان ہندی لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے جیسے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

انگریزی فوجوں کے سپہ سالار انسن (Anson) نے لارڈ کیننگ کو لکھا ہے کہ ''کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً حیرت نہیں ہوئی، میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابل یقین طریقے سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ جبکہ ''تاریخ عہد انگلشیہ'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ اس میں سؤر کی چربی نہ تھی

مگر گائے کی ضرورتھی۔'' اسی طرح خود ان کی ایک رپورٹ جو۱۸۵۳ء میں تیار کی گئی تھی اس میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ نئے کارتوں میں سؤر اور گائے کی چربی کا استعمال ہوا ہے۔''

۱۸۵۷ء کے ابتدائی دنوں میں جب انقلابیوں اور انگریزوں کے درمیان آنکھ مچولی چل رہی تھی اور انقلابی بڑے رازدارانہ انداز میں اپنا کام کررہے تھے اور انگریز دن بہ دن ہندوستانیوں کو تکلیف میں مبتلا کررہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ابتدای دنوں میں نئے کارتوں کا کارخانہ ڈم ڈم میں قائم ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک دن کارخانے کا ایک ملازم برہمن سپاہی سے ملا۔ پانی کی تلاش کی۔ برہمن سپاہی نے اس ملازم کی ذات پوچھی۔ ملازم نے کہا ذات کیا پوچھتے ہو کچھ دن کے بعد تمہاری ذات بھی نہ رہے گی کیونکہ نئے کارتوس آ گئے ہیں جن میں سؤر اور گائے کا چربی کا استعمال ہوا ہے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے منع کردیا۔ ۲۶ر فروری ۱۸۵۷ء کو برہان پور کی رجمنٹ نے کارتوس استعمال کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ضرورت پڑی تو تلوار بے نیام کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ انگریز افسران حیران و ششدر رہ گئے۔ اندر ہی اندر اس عمل کے لئے ان کو سبق سکھانے کی غرض سے ۱۹ر جمنٹ کو سزا دینے کا فیصلہ سنایا گیا اور ۳۱/ مارچ کو ۱۹ر جمنٹ بارک پور پہنچی یہاں ان سے ہتھیار لے لئے گئے اور ان کی برطرفی کا حکم ہوا مگر بارک پور کے دیگر غیرت مند رجمنٹ اپنے ہم وطن بھائی کی ذات کارتوس کو ہاتھ نہ لگانے کے جرم میں، اس سزا کو برداشت کرنا ناممکن تھا۔ منگل پانڈے جو کہ ایک بہادر سپاہی تھا اس کے سینے میں جوش انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کو آج ہی بغاوت پر آمادہ کیا لیکن رجمنٹ وقت سے پہلے بغاوت پر آمادہ نہ تھی۔ منگل پانڈے جب الوطنی سے سرشار اپنے جذبات کو روک نہ پائے اور کھلے میدان میں تلوار اور بندوق لے کر بآواز بلند پکارتے ہوئے نکلے۔ اٹھو، بھائیو۔ اٹھو، دیش کی آزادی کے لئے آگے بڑھو اور دغا باز دشمن پر حملہ کرو۔ اس جملے کو سنتے ہی سارجنٹ میجر نے گرفتاری کا حکم دیا مگر کسی کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ منگل پانڈے کو ہاتھ لگا سکے۔ اتنے میں منگل پانڈے نے میجر پر گولی چلادی۔ اسی وقت اس کا خاتمہ ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر لفٹینٹ آیا۔ گولی اس کے گھوڑے کو لگی دونوں گرے، لفٹینٹ پھرتی سے اٹھا اور منگل پانڈے پر گولی چلائی لیکن منگل پانڈے کو لگی نہیں اتنے میں پانڈے نے تلوار نکالی اور اس کا کام تمام

کردیا۔اس کے بعد جنرل ہیریسن ان کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھا تو پانڈے نے بندوق کی نال اپنی طرف کرلی تاکہ ان دشمنوں کے ہاتھوں مرنے سے بہتر ہے خود کو گولی مار لے لیکن وہ بچ گئے۔اس کے بعد ان پر مقدمہ چلا ان سے بار بار پوچھا گیا کہ وہ انقلابی جماعت کے راز اور سازش کرنے والوں کے نام بتادے لیکن منگل پانڈے نے کچھ نہیں بتایا اور بلآخر ۸/اپریل ۱۸۵۷ء کو سپاہیوں کے سامنے لاکر انہیں پھانسی دے دی گئی۔ان کے ساتھیوں کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔ نئے کارتوسوں کی خبر بڑی جلدی ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔ بارک پور کے سپاہیوں نے دیگر رجنٹ کے لوگوں کو خفیہ طریقے سے خبر کردی۔اس کے علاوہ یہ بات بھی ان دنوں گردش میں تھی کہ سوٗر اور گائے کی ہڈیاں پیس کر آٹے میں ملادی گئی ہیں۔اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سستے داموں میں بک رہا ہے۔بغاوت کی چنگاری ملک کے مختلف حصوں میں پھیل چکی تھی۔جگہ جگہ لوگ برٹش عمارتوں کو نشانہ بنارہے تھے۔۸/اپریل ۱۸۵۷ء کو انبالہ میں ہاسپٹل میں آگ لگادی گئی۔شراب کے گودام کو آگ کے حوالہ کردیا۔دہلی، لکھنوٗ، میرٹھ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ میں بغاوت کی آگ بھڑک چکی تھی۔اور یکم مئی کو انبالہ کی طرح لکھنوٗ کے دیسی سپاہیوں نے دانتوں سے کارتوس کاٹنے سے انکار کردیا۔لیکن انگریز باغی سپاہیوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا اس لئے تمام دیسی سپاہیوں کو بنا ہتھیار کے صبح آٹھ بجے پریڈ پر بلایا اور چاروں طرف سے گورے سپاہیوں نے ان پر گولیوں کی بوچھار کردی اور جن لوگوں نے بچ کر بھاگنے کی کوشش کی گورے سپاہی ان کے پیچھے دوڑے۔

انقلابی لیڈروں اور اس کی حمایت کرنے والوں نے بغاوت کرنے کی تاریخ ۳۱/مئی ۱۸۵۷ء شام طے کی تھی لیکن وقت سے پہلے ہی بغاوت کی چنگاری پھوٹ پڑی۔۲۳/اپریل ۱۸۵۷ء سے میرٹھ میں بغاوت شروع ہوگئی۔سب سے پہلے جنرل اسمتھ کے گھر اور اسپتال کو نشانہ بنایا گیا۔اس کے بعد انگریز حکمراں کی جانب س ۶/مئی کو دیسی سپاہیوں کو کارتوس منہ سے کاٹنے کا حکم ہوا اور بار بار ہوا۔ ہاتھ نہ لگانے کی صورت میں ان لوگوں کا کورٹ مارشل ہوا۔اس دوران روزانہ رات کو برھش عمارتوں، دفتروں اور فوجی ٹھکانوں میں آگ لگنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ ۹/مئی تک چلتا رہا۔انقلابیوں اور دیسی سپاہیوں کے مشورے کالی پلٹن کے مندر اور شاہ پیر صاحب کے مزار میں ہوتے تھے اس کے ساتھ صدر بازار کے عوام بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چل رہے

تھے۔ ۹رمئی کو فیصلے کا دن تھا۔ اس دن انگریز حکمراں اور ہندوستانی فوج پریڈ میں جمع ہوئے۔ ۸۵ ملزموں کو بلایا گیا اوران کودس دس سال کی سزا قید بامشقت سنائی گئی۔ ان کی وردیاں تمام ہندوستانی فوج کے سامنے اتار لی گئیں اوران وردیوں کو پیچھے سے پھاڑ دیا گیا۔ ان کی ٹوپیا ان کے لئے چھوڑ دیں کیونکہ یہ ٹوپیاں ان کی اپنی رقم سے خریدی ہوئی تھیں لیکن باغی سپاہیوں نے اسے بھی ہوا میں اچھال دیا اور پاؤں سے خوب روندا۔ ان تمام سپاہیوں کو بڑی حقارت سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں۔ قیدی اپنے ساتھیوں کو غیرت دلاتے تھے کہ تم جاؤ چوڑیاں پہن کر اپنی بیویوں کے پاس بیٹھو، ہم پر ظلم ہورہا ہے اورتم خاموش تماشائی بنے ہوئے ہو۔ تم ہندوستانی نہیں ہو کیونکہ ہندوستانی اپنے بھائی پر عزت و جان قربان کردیا کرتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے گھروں کو پہنچے تو ان کی عورتیں، بیوی، بھائی اور بہنوں کا جذبہ ابل پڑا۔ سید ظہیرالدین دہلوی ان عورتوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

> ''تم لوگ مرد ہو؟ اور سپاہ گری کا دعویٰ کرتے ہو، مگر نہایت بزدلے اور بےعزت اور بےشرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسران کے ہتھکڑیاں پڑیں اور تم کھڑے دیکھا کیے۔۔ تم سے کچھ نہ ہوسکا۔ لو یہ چوڑیاں پہن لو اور ہتھیار ہمیں دو۔ ہم افسران کو چھڑالائیں گے۔'' [۱۶]

یہ سپاہی مجبور و بےبس تھے۔ کیونکہ ان کے سامنے مسلح افواج کھڑی تھی۔ ان قیدیوں کو روانہ کردیا گیا۔ فوجی سپاہی اپنی اپنی بیرکوں میں چلے گئے۔ مگر ان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ رات بھر سپاہیوں نے مشورے کئے اور آناً فاناً بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک رجمنٹ جو تمام انگریزوں کے قتل عام پر مصر تھی تو باقی سپاہی اس کے حق میں نہ تھے بلکہ جہاں جس چیز کی ضرورت پڑے گی وہاں، ویسا عمل کریں گے۔ یعنی وقت اور حالات پر چھوڑ دیا۔ آدمیوں کو دہلی روانہ کردیا۔ اسی دن شام میں میرٹھ کے بازاروں میں یہ خبر پھیلی کہ انگریزوں نے دو ہزار بیڑیاں بنوائی ہیں جو کل کے دن باقی سپاہیوں کو پہنائی جائیں گی۔ ۹رمئی ۱۸۵۷ء کے ان واقعات کے بعد ۱۰رمئی کو صبح انگریز اطمینان کے ساتھ تیار ہوکر گرجا گھروں کا رخ کررہے تھے۔ ادھر دیسی فوج جیل کی طرف گئی اور اپنے پچاس افسران کو آزاد کرالیا۔ اس درمیان ان انقلابی سپاہیوں نے کسی کو تکلیف نہ پہنچائی اور نہ

ہی کسی کو مارا۔ یہ اگر چاہتے تو گرجا گھروں میں جب سارے لوگ جمع تھے تو اس وقت حملہ کر دیتے تو کسی کی جان تک نہ بچتی لیکن انقلابیوں نے ایسا کچھ نہ کیا بلکہ اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر پریڈ میں چلے گئے۔ انقلابیوں کو اندازہ ہوا کہ گورے فوج نے ان کے مقابلے کی تیاری کر لی ہے تو ان لوگوں نے اپنی چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ کرنل فنس یہ ہنگامہ دیکھ کر ان پر غصہ ہونے لگا۔ رجمنٹ ۲۰ پہلے ہی سے قتل و غارت گری پر آمادہ تھی۔ اس نے موقع دیکھتے ہی اس پر گولی چلا دی۔ پھر کیا تھا ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ سات انگریز افسران اور ان کے بیوی بچوں کو بھی مار ڈالا گیا۔ خواجہ حسن نظامی اپنے ایک مضمون میں وکٹر ہیوگوف کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستانی شہروں کے مکانات جنگلوں کے بھٹوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جن کے اندر رہنے والے اگرچہ انسانی شکل رکھتے ہیں لیکن وہ نہایت موذی اور ہیبت ناک ہوتے ہیں اور میرے خیال میں ہندوستانی بھٹوں کے انسانوں سے جنگلی بھٹوں کے حیوان اچھے ہوتے ہیں۔ میرٹھ میں یہی دیکھنے میں آیا کہ شہروں اور دیہات کے بھٹوں سے بے شمار ہندو مسلمان نکل کر آ گئے تھے اور انگریزوں کے ساتھ درندوں کا سا کام کر رہے تھے۔'' ۱۷

اس چنگاری نے پورے میرٹھ کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ جہاں انگریزوں کے مکانات تھے انہیں جلا دیا گیا۔ انگریزوں نے بھی انقلابیوں پر گولہ باری کی۔ رات بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف یہ شور تھا کہ ''مارو فرنگیوں کو'' دہلی اور میرٹھ کے راستے کو بند کر دیا گیا۔ شہر کے ٹیلی گراف کو کاٹ دیا گیا۔ سڑکوں اور ریلوے ٹریک پر انقلابیوں کو بٹھا دیا گیا۔ رات ہی میں انقلابیوں کی ایک بہت بڑی جماعت الگ الگ ٹکڑیوں میں دہلی کی جانب کوچ کر گئیں۔ انگریز افسران اور ان کے سپاہیوں کو اندازہ بھی نہ ہوسکا کہ باقی انقلابی کہاں اور کس طرف گئے۔ اس حملے کے زیر اثر میرٹھ کے اردگرد سہارنپور، بلند شہر، مظفر نگر وغیرہ میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ہر طرف قتل و غارت گری شروع ہوگئی۔ گورے سپاہیوں اور انقلابیوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

انقلابیوں کے اہم پیشوا نانا صاحب، عظیم اللہ اور دھوندھو پنت وغیرہ نے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی شب کو بغاوت کی تاریخ طے کی تھی لیکن اچانک وقت سے پہلے ہی میرٹھ میں یہ آگ

بھڑک اٹھی۔ پوری تیاری کا نظام درہم برہم ہوگیا۔۱۰ رمئی کو میرٹھ کو لالہ زار کرنے کے بعد ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو رات میں دہلی کا رخ کیا۔ انگریز افسران نے میرٹھ سے اپنا ایلچی دہلی کو روانہ کیا لیکن جب ان کا ایلچی دہلی پہنچا تو ان کا کمشنر سائمن فریزر شراب پی کر بدمست تھا۔ جب تک انہیں ہوش آتا تب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ تمام آزادی وطن کے چاہنے والے میرٹھ سے نکل کر ۱۱ رمئی کی صبح جمنا کے کنارے پل پار کرتے ہوئے شہر دہلی کی فصیل پر آ پہنچے۔ دہلی والے خود انقلابیوں کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے شہر کے لوگوں اور نگہبانوں نے جوش وخروش کے ساتھ ان کا استقبال کرتے ہوئے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ شہر کے ہندو مسلم سبھوں نے ان کا ساتھ دیا اور جو سپاہی انگریزوں کے عتاب سے پریشان تھےوہ بھی ان مجاہدین آزادی کے ہمراہ ہوگئے اور قلعے کی پشت پر جھروکے کے نیچے جمع ہوئے۔ بادشاہ کو صبح آٹھ بجے خبر ملی تو پریشان ہوگئے۔ ان سے بات چیت کرنے حکیم احسن اللہ خاں نے تسبیح خانے میں آ کر ان انقلابیوں سے بات چیت کی ظہیر دہلوی اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ:

> ''حضور بادشاہ سلامت ! آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں۔ آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمابردار ہے۔ ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے۔ ....ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، امیدوار انصاف ہیں۔ ہم ملازم انگریزی ہیں۔'' ۱۸

حکیم احسن اللہ کے ذریعے بادشاہ نے ان انقلابیوں کی باتیں سنیں جو ان کے لئے ناقابل یقین تھیں۔ لیکن انہیں بھی اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا احساس تھا۔ وہ انگریزوں کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ بادشاہ نے ان انقلابی مجاہدین آزادی وطن کو مخاطب کر کے کہا۔

> ''سنو بھائی ! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جدوآبا کے نوکر چاکر اپنے خداوندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن

بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا۔قوت لا یموت کو
محتاج ہو گئے۔.....میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں، مجھے ستانے کیوں
آئے ہو! میرے پاس خزانہ نہیں ک میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے
پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ
تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ سے
کسی طرح کی توقع استطاعت کی نہ رکھو۔''۱۹

اسی درمیان انگریز سمسن اور کپتان ڈگلس باغیوں سے گفتگو کرنے آیا تھا جسے بادشاہ نے بلوایا تھا۔ ایک قول کے مطابق فریز رتھا۔ بہر حال تکرار کی نوبت ان کی جان لے لی۔ انقلابیوں نے بہادر شاہ ظفر کو یقین دلایا کہ ہم آپ کو خزانے لا کر دیں گے آپ ہماری رہنمائی کریں۔ اس کے بعد یہ لوگ شہر میں پھیل گئے اور سب سے پہلے ان لوگوں نے پادری کو قتل کیا جو پہلے ہندو تھا اور اب وہ عیسائیوں کا پادری بن گیا تھا۔ شہر پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا لیکن ابھی تک میگزین پر قبضہ نہ ہو سکا تھا جو انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ انقلابی فوجیوں نے میگزین کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں نے خود اس کو اڑا دیا۔ اس کے آگے پیچھے کئی اور مکانات جل کر راکھ ہو گئے۔ ہر طرف قتل و خون ریزی کا بازار گرم تھا۔ کتنے افسران قتل کر دیئے گئے۔ شہر میں ہر طرف بدامنی پھیل چکی تھی۔ ان انقلابیوں نے سب سے پہلے بیرکوں سے انقلابیوں فوجیوں کو دعوت دی اور جیل کی سلاخوں کو توڑا تا کہ انقلابی آزاد ہوں۔ ان کی عمارتوں اور ہسپتال کو نشانہ بنایا۔ اس درمیان میرٹھ اور دیگر مقامات سے پیدل دستے انقلابیوں کے شہر میں تسلسل کے ساتھ داخل ہونا اور انگریزوں کو چن چن کر مارنا شروع کر دیا۔ دہلی کے فوجی چھاؤنی میں کرنل رپلے نے تمام فوج کو جمع کیا اور باغیوں کی مذمت کی۔ ۵۴ رجمنٹ کے دیسی سپاہیوں نے کہا کہ ہمیں میرٹھ کے سپاہیوں کے آگے کر دیجیے ہم ان کو سمجھا لیں گے۔ ان کی اس بات کو کرنل نہ سمجھ سکا اور رجمنٹ کو حکم دیا کہ ان کا سامنا کرے۔ جب دونوں آمنے سامنے ہوئے تو ایک دوسرے کو سلوٹ کیا اور مارو فرنگیوں کو کے نعرے سے ان پر ٹوٹ پڑے اور ''شہنشاہ ہند زندہ باد'' کے نعروں نے ان کے حوصلے کو اور بلند کر دیا۔ ایک گولی اچانک آئی اور کرنل رپلے کو ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد کئی افسران فوجی دستہ لے کر آئے لیکن

ہر ایک کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس طرح دہلی پر دوبارہ بہادر شاہ ظفر نے اپنی بادشاہت کا اعلان ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو ان انقلابیوں کی مدد سے کیا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ جب بھی جنگ و جدال کا مرحلہ آتا ہے تو شہر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لوٹ مار، غنڈہ گردی عام ہو جاتی ہے۔ بدمعاش و بدقماش لوٹ مار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بہادر شاہ انہی امور کو دیکھنے لال قلعہ سے ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے جہاں ان کو انگریزوں نے محدود کر رکھا تھا۔ ہر طرف بادشاہ کی جے جے اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ مغل شہزادوں کو جن میں مرزا مغل کو کمانڈر ان چیف اور بخت خاں کو گورنر جنرل بنایا گیا اور بادشاہ بذات خود فوجی انتظام کو دیکھ رہے تھے۔ بہادر شاہ نے ریاست جھجھر، بلب گڑھ، الور، جے پور اور فرخ نگر سے امداد طلب کی۔ بادشاہ انگریزوں کے قتل عام کے حق میں نہ تھے لیکن انقلابیوں نے ۱۷۵۷ء کے حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۶ رمئی کو قتل عام کروا کر سب کو مار دیا۔ اس طرح دہلی کی مختلف جگہوں پر جو انگریز کے حامی و مددگار تھے ان کے گھروں سے نکال کر ان کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

دوسری جانب کانپور میں بغاوت کرنے والوں کی رہنمائی نانا صاحب کر رہے تھے۔ جھانسی میں لکشمی بائی نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ پٹنہ میں وہابیوں اور بنارس میں برہمنوں نے مذہبی امور کی حفاظت اور اس کی مزاحمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سی۔ پی۔ جوشی ان انقلابیوں کی شورش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''جہاں کہیں فوجی شورش بپا ہوتی عموماً اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی شہر اور دیہات میں بغاوت پھوٹ پڑتی لیکن کئی مقامات میں لوگوں نے سپاہیوں سے پہلے ہی علم بغاوت بلند کر دیا، جہاں کہیں بغاوت شروع ہوتی سرکاری خزانہ، گودام اور اسلحہ خانہ لوٹ لیا جاتا۔ بیرکوں اور سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر دیا جاتا اور جیل خانوں کے پھاٹک کھول دیئے جاتے۔ ہر جگہ سرکاری دستاویزات کی طرف باغیوں کا وہی رویہ ہوتا جو بنیوں کے بہی کھاتوں کی طرف تھا اور دونوں صورتوں میں وجہ ایک ہی تھی۔ ان کی نگاہ میں یہ دستاویزات جابرانہ ٹیکسوں کی وصولی اور ضبط و امن کے قیام کے وسائل تھے جو انہیں ایک آنکھ نہ

بھاتے تھے۔'' ۲۰؎

بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہیت کے دوبارہ اعلان ہونے کے بعد ۱۳؍مئی ۱۸۵۷ء سے دہلی پر بغاوت کے بعد دھیرے دھیرے ملک کے طول و عرض میں اس کی چنگاری لگنے لگی۔ فیروز پور، علی گڑھ، رڑکی، اٹاوہ، لکھنؤ، متھرا، بریلی، شاہ جہان پور، کان پور وغیرہ میں پھیلتی چلی گئی۔ ہر جگہ بڑی تیزی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے والے اور تلواروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ یکم جون کے بعد مرادا باد، سیتاپور، اعظم گڑھ وغیرہ میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ نانا صاحب نے کانپور کا محاصرہ کیا تو لکشمی بائی نے ۷؍جون کو جھانسی کے قلعہ پر قبضہ کیا۔ ۹؍جون کے بعد یہ لہر دریار، فتح پور، گوالیار اور فتح گڑھ پہنچ گئی اور دیکھتے دیکھتے بغاوت کی آگ اندور اور ہاتھرس میں بھی پھیل گئی۔ ۲۷؍جولائی کو کنور سنگھ نے آرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح یہ لڑائیاں مختلف جگہوں پر الگ الگ انداز میں ہوتی رہی۔ کہیں شکست تو کہیں فتح کا جشن تھا۔ بغاوت کرنے والے فوجیوں نے بڑی بہادری کے ساتھ ہر چہار جانب انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن ۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۲۰؍ستمبر ۱۸۵۷ء تک دہلی اور اس کے اطراف کی حالت نہایت دگرگوں رہی۔

جنرل بخت خاں اپنے چودہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار تھا۔ ادھر انگریزوں کی مدد کرنے کے لئے پنجاب کے سکھوں نے بھرپور تعاون کیا اور انگریز سپاہی مدراس، بمبئی اور رنگون سے دہلی آ گئے۔ جنرل بخت خاں نے اپنی سپہ سالاری کے ذریعے انگریزوں سے کئی مقابلے کئے اور انہیں علی پور تک کھدیڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ انگریزی کیمپ میں ۱۴؍جولائی کو ان کا بہادر کمانڈر چیمبرلین مارا گیا۔ انہی دنوں بقرعید بھی آ گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے اعلان کروا دیا کہ اس بار گائے کی قربانی کوئی نہیں کرے گا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہوا پکڑا گیا تو اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حکیم احسن اللہ جو بہادر شاہ ظفر کے بہت خاص تھے، دوسری طرف انہوں نے انگریزوں سے بھی ہاتھ ملا لیا تھا۔ گائے کی قربانی پر پابندی لگنے کے بعد احسن اللہ نے اس حکم پر احتجاج کیا اور انگریزوں کی حمایت میں بڑی چالاکی کے ساتھ بات کی۔ کیونکہ انگریز بقرعید کے موقع پر گائے کے ذبیحہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، اس وجہ سے بادشاہ نے مصلحتاً گائے کی قربانی سے منع کیا تھا۔ ایک انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمس میں رابرٹ لکھتا ہے کہ:

''اس خاص موقع (بقرعید)۔ یکم اگست پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کردی گئی اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوششیں ہو رہی تھیں۔ پہلی اگست کی صبح کو مسجد میں اور مندر پر ہجوم تھے اور تمام لوگ اس زبردست جدوجہد کی کامیابی کے لئے دعا کررہے تھے۔ شام کو ہزاروں کی تعداد میں ان گنت باغی جوش اور تعصب سے پاگل ہو کر شہر کے دروازہ سے جہاد کے نعرے لگاتے ہوئے نکلے اور آگے بڑھ کر ہمارے دفاع پر حملہ آور ہوئے۔''[21]

یکے بعد دیگرے کئی حملے ہوتے رہے۔ انگریزوں نے کشن گنج والے مورچے پر حملہ کیا اور ۲۹/اگست کو بھی پورا دن توپوں سے شہر پر گولہ باری کرتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر کے خزانے دن بہ دن خالی ہوتے جارہے تھے۔ مستقل سپاہیوں کی دیکھ بھال ان کی تنخواہ ذرائع آمدنی ندارد، سپاہی اناج کی کمی سے پریشان تھیفو جی افسر اور شہزادوں میں ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ مہاجنوں نے ہاتھ کھڑے کردیئے۔ تاجروں کے پاس سے گندم ختم ہوگیا۔ بلآخر فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ ظفر اپنا سامان بیچ کر فوج کی تنخواہ دیں گے جبکہ فوج کا ماہواری خرچ پانچ لاکھ تہتر ہزار تھا۔ انگریز دن بہ دن لال قلعے کے قریب ہوتے جارہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے جے پور، الور، بیکانیر اور جودھ پور کے راجاؤں کو غیرت دلاتے ہوئے خط لکھا کہ:

''میری دلی خواہش ہے کہ فرنگی جس طرح بھی ہو، ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دیئے جائیں اور ملک آزاد ہو۔ لیکن آزادی کی جنگ اس وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب ایک قابل شخص جو تحریک کا تمام بار اپنے کاندھوں پر لے کر منتشر قوتوں کو منظّم کرسکے۔ اور اس بغاوت کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے۔ میں ذاتی طور پر حکومت کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر تم دیسی راجگان اپنی تلواریں دشمن کب نکالنے کے لئے بے نیام کرنے کو تیار ہوں تو میں ان کے حق میں شہنشاہی سے مستعفی ہوجاؤں گا جو اس کام کے لئے منتخب ہوں۔''[22]

بہادر شاہ ظفر کے خطوط نے ان راجاؤں کے دلوں میں کوئی اثر پیدا نہیں کیا اور نہ ہی ان

راجواڑوں کوغلامی کا کوئی احساس تھا۔ستم یہ کہ یہ راجا انگریزوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ہر چہار جانب سے ان کے لئے پیدل وار، کوئی توپیں، کوئی گورکھے اور کوئی فوج انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھیج رہا تھا۔ ادھر انقلابیوں کے خیمے میں کوئی ایسا بڑا افسر نہ تھا جو تمام باغیوں کو اکٹھا کر سکے اور ہندوستان کی مختلف جگہوں سے آئے ہوئے انقلابیوں کو ایک جگہ جمع کر سکے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس غیر منظّم تنظیم تھی جس سے ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۳ر ستمبر کو انگریزوں نے قدسیہ باغ اور کمشنر کی کوٹھی کو مورچہ بنایا اور دن بھر توپیں داغتے رہے۔ جس سے سیاہ برج کا مورچہ ٹوٹ گیا۔ فوج نے کابلی دروازے پر توپیں لگا دیں اور پھر ۱۴ر ستمبر کو جاسوس کے ذریعے پتہ چلا کہ کشمیری دروازہ کے فصیل میں شگاف ہو گیا ہے تو انگریزوں نے صبح سویرے اس فصیل کے شگافوں سے اندر داخل ہو گئے۔ اس طرح الگ الگ دروازوں سے انگریز شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے چہار جانب سے گھسنے کی تیاری کی۔ یہاں تک کہ جامع مسجد میں ہزاروں لوگ جمع تھے لیکن جیسے ہی پتہ چلا کہ انگریز فوج آ رہی ہے تو فوراً تلوار لے کر نکل پڑے لیکن انگریزوں کی توپوں کے سامنے ٹک نہ سکے۔ انگریز افسر مارے گئے اس کے باوجود وہ لوگ ہر محاذ پر ڈٹے رہے۔ صرف دہلی دروازہ اور اجمیری دروازہ انقلابیوں کے پاس رہ گیا تھا۔ لیکن ۲۰ر ستمبر کو یہ دروازے بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ ۱۶ر ستمبر سے ۱۹ر ستمبر تک مسلسل شہر میں جنگ ہوتی رہی۔ ہر طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ انقلابی سپاہیوں میں اب لڑنے کی طاقت نہ بچی تھی۔ مرزا غالب ''دستنبو'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''دو تین دن تک کشمیری دروازے تک تمام راستے میدان جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ، یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔... مجھے مردہ دل کا خاک کدہ، وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے دمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگر چہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ باہر چلے جاتے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔ انگریزوں کی فتح اور مظالم میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام

کولڑ کر فتح کرتے ہیں لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔
اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد و
عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت
بھی۔ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی
بستیاں اور مقبرے تھے۔ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔''۲۳

دہلی کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔انگریز ہر کس و ناکس کو قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک امیر و غریب ہر ایک کو اپنا دشمن جان کر موت کے گھاٹ اتارنے پر تلے ہوئے تھے۔انقلابیوں نے دم توڑ دیا تھا۔انگریز ہر دروازے سے دہلی کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ بخت خاں بھی بادشاہ ظفر کو قلعہ چھوڑنے سے قبل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ''حضور میرے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں'' لیکن بادشاہ نے انکار کر دیا۔لیکن انگریزی افسران الٰہی بخش کو (جو بہادر شاہ ظفر کے بہت خاص تھے) حکم دیتا ہے کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے کہ بہادر شاہ ظفر انقلابیوں کے ہمراہ دلّی شہر سے باہر نہ جانے پائیں ورنہ دوبارہ وہ اپنی طاقت بنا لے گا۔اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے بار بار الٰہی بخش بہادر شاہ ظفر کو روکنے پر مجبور کرتا ہے اور طرح طرح کے بہانے بناتا ہے۔ بلآخر ایک خواجہ سرا بہادر شاہ ظفر کو مشورہ دیتا ہے کہ ''حضور! صاحب عالم (الٰہی بخش) تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گذارش پر توجہ فرمائیے۔مرنا اور تکلیف اٹھانا تو زندگی کے ساتھ ہے۔''

۲۰ ستمبر کو بہادر شاہ ظفر بیگم زینت محل اور شہزادے وغیرہ کے ساتھ تحفظ کی خاطر لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرے کے لئے نکلے۔مقبرہ جانے سے پہلے درگاہ حضرت نظام الدین میں ان کے تکیہ سے ٹیک لگا کر تین دن کے بھوکے پیاسے بیٹھے تھے۔داڑھی پر گرد و غبار، چہرہ اترا ہوا۔جسم سے نڈھال، سالہا سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج درگاہ کے متولی سے کھانا مانگ کر بیسن کی روٹی اور چٹنی کھا رہا ہے۔کچھ دیر کے بعد بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں روپوش ہو گئے۔ بخت خاں پھر آئے اور دوبارہ التجا کی کہ وہ ان کے ساتھ چلیں لیکن بہادر شاہ ظفر نے ان سے کہا کہ:

''بہادر! مجھے تیری ہر بات پر یقین ہے ....مگر جسم کی قوت نے
جواب دے دیا ہے۔اس لئے اپنا معاملہ تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں۔مجھ

کومیرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کر کے
دکھاؤ۔ میں نہیں، نہ سہی تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے۔''

بخت خاں وہاں سے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے چلا گیا اور مغربی دروازے سے ۲۱ رستمبر کو میجر ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے اپنے آپ کو بخوشی ان کے حوالہ کر دیا۔ بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو لال قلعہ میں قید کر دیا گیا، بادشاہ کے دونوں لڑکے مرزا مغل، مرزا اختر اور پوتے ابوبکر کو قید کر کے انگریز اپنے ہمراہ لے گئے لکن راستے میں ہڈسن مل گیا اس نے تینوں کو گولی ماردی اور سر کاٹ کر بہادر شاہ ظفر کے سامنے لے گیا اور کہا کہ ''کمپنی کی جانب سے یہ آپ کی نذر ہے جو برسوں سے بند رکھی تھی'' بہادر شاہ ظفر نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دیکھا اور کہا ''الحمد اللہ! تیمور کی اولاد ایسے ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی۔''

اس طرح ۱۸۵۷ء کے حالات جو اسباب بغاوت ہند کی شکل میں ابھرے اور بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے ۱۷/اکتوبر ۱۸۵۷ء کو رنگون بھیج دیا۔ ان کے ہمراہ بیگم زینت محل اور جواں بخت بھی تھے۔ بلآخر ۷/نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسی سال کی عمر میں وہ انتقال کر گئے۔

کتنا بد نصیب ہے ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اس طرح مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلیہ سلطنت جو کئی سو سالہ تاریخ پر محیط ہے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس سلطنت میں زوال کا آنا فطری تھا کیونکہ اس سلطنت کے بڑے بڑے سورماؤں نے اپنی تاریخ خود بنائی۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب نے ملک وملت، جان و مال کی حفاظت، رعایا پروری اور ملک کی سالمیت کے لئے جان و مال کی قربانی دی۔ جس سے ملک کے حالات بہتر ہوئے۔ ملک کی ارضیت پھیلتی چلی گئی۔

لیکن حیف صد حیف کہ اورنگ زیب کے بعد اس سلطنت کے مغل حکمراں ناکارہ اور نا اہل ثابت ہوئے۔ اپنی زندگی عیاشی اور شراب نوشی میں گذار دی۔ انگریز جو تجارت کے غرض سے ہندوستان آیا تھا مغلوں کی نا اہلی کے سبب انہیں موقع ملا اور ملک پر کمپنی کے ذریعے تسلط قائم کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پلاسی کی جنگ میں ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کو شکست دی اور اس کے سو سال بعد

۱۸۵۷ء میں مغل بادشاہ شاہ ظفر کو قید کر کے پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ جو تحریک سراج الدولہ نے چلائی، شاہ ولی اللہ تحریک یا شہید میسور ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف جنگ یا پھر ۱۸۵۷ء میں انقلابیوں کے ذریعے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت کا بلند کرنا اور پورے ملک پر قابض ہو جانا۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمانوں نے مشترکہ انداز میں جنگ آزادی کے لئے کوششیں کیں جس میں ہوم رول تحریک، ستیہ گرہ، تحریک عدم تعاون، تحریک ترک موالات (سودیشی تحریک) انڈین نیشنل کانگریس کا قیام، سول نافرمانی تحریک، (ستیہ نمک گرہ) گول میز کانفرنس، جلیاں والا باغ کا قتل عام، آزاد ہند فوج، انقلاب زندہ باد، ریشمی رومال تحریک، جمیتہ العماء تحریک، خلافت تحریک، مسلم لیگ نے ہندوستان سے انگریزوں کو کھدیڑ کر باہر کا راستہ دکھایا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء سے جو انگریزوں کے خلاف تحریک چلی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں جا کر پوری ہوئی۔ اور ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ اس طرح راقمہ نے اس باب میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے سیاسی کشمکش اور عوامی اضطراب کا جائزہ لیا ہے۔

حواشی

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف		صفحہ نمبر
۱۔	تاریخ تحریک آزادی ہند	ڈاکٹر تاراچند/مترجم قاضی احمد عدیل عباسی	ترقی اردو بیورو دہلی	۷۴
۲۔	احمد شاہ ابدالی	گنڈہ سنگھ	تخلیقات لاہور	۴۲۰
۳۔	اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	ایم۔آر۔پبلیکیشنز دہلی	۴۹۳
۴۔	چہار عناصر۔دربار ملی	عبدالقادر بیدل/مرتبین شیخ محمد اکرام، وحید قریشی	ترقی ادب لاہور	۴۶۰
۵۔	تاریخ تحریک آزادی ہند	ڈاکٹر تاراچند/مترجم قاضی احمد عدیل عباسی	ترقی اردو بیورو دہلی	۲۱۶
۶۔	جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان	۷۵
۷۔	تاریخ ادب اردو جلد دوم	جمیل جالبی	ایجوکیشن پبلیشنگ ہاؤس	۲۱
۸۔	تاریخ تحریک آزادیِ ہند	ڈاکٹر تاراچند/مترجم محمد عدیل عباسی	ترقی اردو بیورو	۴۱۹
۹۔	جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان	۱۰۰
۱۰۔	اسباب بغاوت ہند	سر سید احمد خاں/ڈاکٹر فوق کریمی،	کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی	۲۲
۱۱۔	جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان	۱۰۳
۱۲۔	جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان	۱۲۳
۱۳۔	جنگ آزادی اور اٹھارہ سو ستاون	خورشید مصطفیٰ رضوی	مکتبہ برہان	۱۲۴
۱۴۔	ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو	۳۵۹

۱۵۔ اردوصحافت انیسویں صدی میں ڈاکٹر طاہر محمود ،مطبوعہ کراچی ۳۵۳

۱۶۔ داستان غدر (ہنگامہ ۵۷ء کے چشم دید حالات) سید ظہیر الدین دہلوی، اکادمی پنجاب لاہور ۷۸

۱۷۔ جنگ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، ۴۵۵

۱۸۔ داستان غدر سید ظہیر الدین دہلوی ، اکادمی پنجاب لاہور ۴۶

۱۹۔ داستان غدر سید ظہیر الدین دہلوی ،اکادمی پنجاب لاہور ۴۹

۲۰۔ انقلاب ۱۸۵۷ء پی۔سی جوشی، ترقی اردو بیورو ۳۹

۲۱۔ ہندوستان ٹائمس رابرٹ ۱۵اگست ۱۸۵۷ء

۲۲۔ غدر کی صبح وشام مترجم خواجہ حسن نظامی، کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو ۲۴۲

۲۳۔ دستنبو مرزا غالب/مترجم خواجہ احمد فاروقی ۳۸۔۳۷

☆☆☆☆☆

باب چہارم

انتقامی جذبہ، آزادی کی تڑپ

۱۸۵۷ء کا ہندوستان تنازعی مسائل سے دوچار تھا۔ کیونکہ غیر ملکی اقتدار ملک پر غاصبانہ اقتدار کا حریص تھا جس کے باعث ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی انگریزوں کے خلاف تھی۔ انہیں ملک پر مسلط ہونے سے روکنا تھا۔ لیکن اس جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے اس جنگ کو ''فوجی بغاوت'' اور ''غدر'' کا نام یا تو ہندوستانیوں نے اسے ''جنگ آزادی'' سے موسوم کیا۔ جبکہ پہلی جنگ آزادی میں ملک کے تمام باشندوں، ہندو مسلم، سکھ وغیرہ نے جی جان سے ملک کو انگریزوں کے قبضے میں جانے سے روکنے کی پوری کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس باب میں راقمہ یہ بتانے کی کوشش کرے گی کہ ملک کے باشندوں نے انگریزوں کے خلاف مورچہ کیوں کھولا، ان کے خلاف آواز کیوں اٹھانے کی ضرورت پڑی۔ جبکہ اس سےپہلے دیگر مسلم حکمرانوں نے بھی ملک پر لڑائی کے ذریعے تسلط قائم کیا۔ اس وقت اتنا ہنگامہ اور ملک کی سالمیت کے خاطر خون خرابہ نہیں ہوا۔ بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ یہاں کے راجہ مہاراجاؤں نے ملک ان کے حوالے کردیا۔ اس کے برخلاف جب انگریز اس ملک پر حاکم وقت بننا چاہتے تھے تو ہر طرف سے ان کے خلاف آواز اٹھنی شروع ہوگئی اور ان کے خلاف ہر محاذ پر کھڑے ہوگئے تاکہ ان جابر و ظالم انگریز حکمراں کے خلاف انتقامی جذبہ اور ملک کی آزادی کی تڑپ دوگنی ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے کئی اسباب تھے۔ ان اسباب میں پہلا سبب یہ ہے کہ انگریز ہندوستان بغرض تجارت آئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد دن بہ دن بڑھنے لگی۔ عہد جہانگیری میں شہنشاہ جہانگیر نے ان انگریزوں کی ناپاک حرکتوں کے باعث ملک سے نکلنے کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن

ان کے حکمراں انگریز کی جانب سے معافی تلافی کی نوبت آئی پھر سے جہانگیر نے ان کو تجارت کی اجازت دے دی۔ان انگریزوں نے تجارتی میدان میں خوب ترقی کرلی اوراس ترقی کے ذریعے کمپنی کی بنیادرکھی۔اس کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا۔اب اس کمپنی کے تحت انگریز ملازمین کام کرنے لگے۔اورنگ زیب کے زمانے میں ان لوگوں نے مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک کے حالات دگرگش ہو گئے۔ایسا محسوس ہورہا تھا کے ہر چہار جانب سے مغل سلطنت کے تخت وتاج پرسیاہ بادل منڈلانے لگے۔اس درمیان انگریزوں نے ملک کے طول وعرض پر گہری نظر رکھتے تھے۔اور موقع کی تلاش میں چھوٹی موٹی جھڑپیں شروع کردی تھیں۔کیونکہ ان کی کمپنی دیگر کمپنیوں یا کاروباری سطح پر دیگر مما لک کے لوگوں کے مقابلے ان انگریزوں نے اپنا تسلط اور رعب جمارکھا تھا۔ان کی کمپنی پورے ہندوستان میں متعارف ہوچکی تھی۔ مدراس کے حکومتی سطح پران کا عمل دخل ہو چکا تھا۔دستوری عمل میں ردوبدل اوررائے مشورے کا حق ان کوحاصل ہو چکا تھا۔اسی وجہ سے ان لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور جہاں کہیں موقع ملتا فوجی تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان انگریزوں نے ملک کے اندرونی حالات ،خلفشار راجہ، مہاراجہ کے درمیان آپسی لڑائی میں ملوث تھے کیونکہ ہندوستان کے بادشاہ عیاش اور کمزور ہونے کے باعث ان میں وہ بات نہ تھی جو اکبر، جہانگیر،شاہ جہاں، اورنگ زیب وغیرہ میں تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت جگہ جگہ حملے شروع ہو چکے تھے۔مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنا چاہتی تھی۔اس میں وہ بھرپور کامیاب ہوئے ۔مسلمان ابتدائی دور سے ہی برطانوی حکمرانوں کے طرز عمل اور طریقۂ کار سے سخت نفرت کرتے تھے۔یہ ان کی نادانی تھی کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے جذبات اور احساسات کو تکلیف پہنچائی اوران کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جبکہ برخلاف ہندوستانی نفسیات، اخلاقیات، مذہبی امور کی حفاظت،عادات و خصائل،جذبات و احساسات کی حفاظت جتنی مسلم حکمرانوں نے سمجھا اور برتا اتنا برطانوی حکمرانوں نے نہیں سمجھا بلکہ ان انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں اورمسلمانوں کے جذبات اوران کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی۔عیاری اور مکاری سے ہندوؤں اورمسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی اور پورے ملک پر اس طرز ادا سے غاصب ہو گئے۔انانگریز حاکموں کے سپاہیوں میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ ملک کو فتح کرسکے بلکہ رشوت،سازش،

نفاق اور حد درجہ کی دورخی پالیسی پر عمل کرکے ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑوا کر اس ملک کو حاصل کیا۔اسی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل ودماغ میں اس ملک کو حاصل کرنے کی آزادی اور انتقامی جذبہ بھڑک اٹھی۔

انگریزوں نے آہستہ آہستہ ملک کے انتظامی امور میں مداخلت شروع کردی کیونکہ انہوں نے اپنا اثر رسوخ اتنا بڑھالیا تھا کہ بادشاہوں اور الگ الگ صوبوں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کو کسی بھی معاملے میں ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوب میں کرناٹک اور مشرق میں کلکتہ پر قبضہ کرلیا۔ بنگال میں مرشدآباد کا حاکم نواب سراج الدولہ سیا انگریزوں کی بہت زوردار لڑائی ہوئی۔یہ پہلی جنگ آزادتھی ۔مسلم حکمراں کے ساتھ یہاں پر بھی مسلمانوں کی دھوکہ دھڑی نے انگریزوں کے ہاتھ پاؤں مضبوط کردیئے۔اگر میر جعفر کی غداری نواب سراج الدولہ کے ساتھ نہ ہوتی تو انگریزوں کے حوصلے پست ہوجاتے کیونکہ یہ لڑائی بہت بڑی لڑائی تھی ایک طرح سے یہ حق اور باطل کی لڑائی تھی کہ اس ملک پر حکومتکرنے کے اہل ہے یانہیں۔لیکن میر جعفر کی غداری نے ان انگریز حکمراں کو ثابت کروادیا کہ وہ اہل ہیں جبکہ وہ اہل نہیں تھے۔اس وجہ سے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کہاں انگریز سپاہیوں کی تعداد تین ہزار اور مسلم حاکم سراج الدولہ کی فوج ستر ہزار تھی۔اس میں کوئی تال میل نہیں اس کے باوجود نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی ۔انگریزوں نے انہیں قید کرکے قتل کروادیا۔

پورا ہندوستان بچے، جوان، بوڑھے،عورتیں بلا تفریق مذہب وملت اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔انتقامانہ جذبہ دن بہ دن بڑھنے لگا اور انگریز ہر صوبہ، ضلع ،قصبہ گاؤں میں ایسے لوگوں کی ٹولی بنائی اور انہیں لالچ دیا تا کہ وہ ان کے اشارے پر کام کرے۔ان کو عہدہ اور مال ودولت سے نوازا جانے لگا۔وہی ہوا جو انگریز چاہتے تھے۔ان کو ہر جگہ سے ملک میں عذاری، پھوٹ ،رخنہ،نفرت،ایک دوسرے کو بھڑکانے کے لئے مل گئے ۔میر جعفر،سیٹھ امی چند،راج درلب جیسے غدار کی شکل میں اور بھی اکھٹے ہوگئے ۔انگریزوں کی خوب مدد کی جس سے انگریزوں کا کام بنتا گیا۔پھوٹ ڈالتا گیا ملک کے الگ الگ حصوں پر ان کا قبضہ ہوتا گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے بنگال، بہار،اڑیسہ کو شاہ عالم نے انگریزوں کو

سونپ دیا اور ان کی طاقت کومحسوس کرتے ہوئے اور اپنی شکست مانتے ہوئے مصالحت کرلی اور انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان تمام چیزوں کو دیکھا اور مغل حکمراں کے کرتوت اور ان کے افعال واعمال پر ندامت ظاہر کرتے ہوئے انگریزوں کا ظلم وستم، زیادتی برداشت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

۱۷۷۲ء میں شیر میسور ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی انگریزوں کے ساتھ خوب معرکہ آرائی ہوئی اور انہوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیئے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے کئی معرکے ہوئے اس کے بعد ان کے بیٹے شیر میسور ٹیپو سلطان کی لڑائی انگریزوں کے ساتھ بہت ساری ہوئی۔ اکثر و بیشتر ان کی فتح ہوئی لیکن بعد میں انگریزوں نے وہی حربہ استعمال کیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف ان کے خیمے میں غداروں کو تیار کیا۔ ان ہی غداروں میں میر صادق بھی تھا جو دوغلہ پن کا شکار تھا۔ دوسری جانب مرہٹوں کو لالچ دے کر ٹیپو سلطان کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا جس سے ٹیپو سلطان بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ء میں شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت نے پورے ہندوستان کو ہلا دیا۔ ہر طرف ٹیپو کے چاہنے والے تھے۔ مشرق ومغرب، جنوب وشمال پورا ہندوستان ان کی بہادری پر شیدا تھا۔ ان کی بہادری کے چرچے دور دور تک تھے۔ ہر محبّ وطن ان جیسا جیالا، لڑاکو اور جواں مرد اپنے بچوں کو بنانا چاہتا تھا۔ ہر ہندوستانی ان کی قربانیوں کو یاد کرتا اور دل ہی دل خوش ہوتا کہ کوئی ایسا شیر تھا جو انگریزوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن اپنوں کی بغاوت اور غداری نے اپنوں ہی کو نیچا کر دکھایا۔ اس سے ہر ہندوستانی شرمندہ تھا اور انتقام کے جذبے سے سرشار تھا۔ جہاں جہاں انگریزوں نے ضلعوں، صوبوں پر قبضہ کیا تھا وہاں وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں اور ان کے حکمراں طبقے میں اس صوبے کو آزاد کرانے کی کوششیں جاری تھیں۔ ان کے اندر انتقامی کاروائی اور آزادی بمعنی اپنے صوبے، ضلع، شہر اور گاؤں کو آزاد کرانے کا جذبہ ان کو ان علاقوں سے کھدیڑ کر بھگانے کا حوصلہ دن بہ دن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ جہاں جہاں انگریز ملک کے مختلف حصوں پر قبضہ کرتے چلے جارہے تھے وہاں وہاں ملک کی حفاظت اور اس کے نگہبان تیار بیٹھے تھے۔ لیکن وقت ان انگریزوں کا تھا۔ جدھر جاتے ادھر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ اس طرح انہوں نے دار سلطنت دہلی اور نواح دہلی کو چھوڑ کر ملک کے چاروں حصوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ کرناٹک کے بعد انہوں نے پنجاب، سندھ، اودھ اور برما پر قبضہ

جمایا اور ۱۸۵۷ء آتے آتے انگریزوں نے ملک کے طول وعرض پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ سوائے دہلی اور نواح دہلی کو چھوڑ کر۔ اب ان کی نگاہ نواح دہلی پر تھی۔ جنگ کے مختلف طریق کار کی تلاش تھی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کئی اور طاقتور حکمراں، سکھ مرہٹہ، علی برادران وغیرہ کی یلغار دہلی اور نواح دہلی پر ہو چکی تھی۔ انگریز بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے آ گئے۔

بغاوت کے اسباب میں ۱۸۵۷ء میں لارڈ ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی کامیاب نظر آئی۔ جہاں جہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں ان پر انگریز حکمراں مسلط ہو گئے۔ ہندوستانیوں کے دلوں پر بہت برا اثر پڑا اور وہ مشتعل ہو گئے۔ وہیں دیگر اسباب میں اقتصادی بحران، زمینداروں اور جاگیرداروں کی زمینیں ہڑپ لیں بہت سارے بے روزگار ہو گئے انگریزوں کی غلامی اور بے روزگاری نے بغاوت کی چنگاری پر آمادہ کیا۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے ہندوستانی معاشرت میں دخل اندازی کی جس میں معاشرت، رسم ورواج، مذہب وتہذیب، اخلاق واعادات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے جذبات بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ ستی کا خاتمہ، ہندو بیوہ کی دوسری شادی، نچلی ذت کے لوگوں کا اعلیٰ ذات کے لوگوں کے ساتھ کھان پان، مندر ومساجد کی ذمہ داری اس طرح ہزار ہا معاملات نے ہندوستانیوں کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا۔ یہ چیزیں برداشت سے باہر تھیں۔ جذبات مجروح ہونے کی صورت میں انتقام لینا از حد ضروری تھا۔ دن بہ دن اس کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عیسائی مبلغین کا گھر گھر جا کر دعوت عیسائیت دینا ہندوؤں اور مسلمانوں کو راس نہ آیا۔ یہ معاملہ تو ان کے لئے بہت سنگین تھا جس پر ان کا اعتماد اور اعتقاد تھا اسی کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس حرکت وعمل نے ہر ہندوستانی کو بغاوت اور بدلے کی آگ پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بے روزگاری کے عالم میں ہندوستانیوں کو انگریز نے فوج میں بھرتی کا راستہ دکھایا اور انہیں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا جو لوگ انگریزوں کو اپنا دشمن مانتے تھے۔ اب ان کی لڑائی ان ہی ہندوستانی بھائیوں سے تھی جو ان کی غلامی کرتے ہوئے فوج میں یا پھر دیگر امور میں ان کے زیر اقتدار تھے۔ ہندوستانی فوجیوں کے مطالبات پورے نہ کرنا، ان کو اپنے جوتوں کے نیچے رکھنا، حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، ان دیسی سپاہیوں کو بہت صدمہ پہنچا اور ان کے دلوں میں بھی وطن کی محبت اور انگریزوں کے خلاف بڑھی اور انھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ چنگاری کا پنپنا لازمی حصہ تھا۔

نواح دہلی میں میرٹھ، باغپت، پانی پت، مظفرنگر، علی گڑھ، بلند شہر، سہارن پور، رڑکی، سردھنا پر قابض ہوکر اور دہلی پر بہادر شاہ ظفر کو دہلی کے لال قلعے تک محدود کر دیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اب کوئی بادشاہ نہیں بنے گا اور شہزادوں کو کوئی بھی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔اس طرح انگریزوں کی حکومت ۱۸۵۷ء میں قائم ہو چکی تھی۔ اب اور تب میں بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت جو نہ کے برابر تھی اس کو بھی ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی ہر برادری کے لوگ اس غاصبانہ حرکت پر نالاں تھے۔ ہر دل میں انگریز کے خلاف بغاوت کی چنگاری پھوٹ رہی تھی۔ بلا آخر مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانیوں کے دلوں سے وہ چنگاری میرٹھ سے شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں یہ بغاوت جو ہندوتانیوں کے دل و دماغ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت، انتقام کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ تھی وہ پھیل چکی تھی۔ ہر طرف ان کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی۔ ۱۱رمئی کو میرٹھ کے سپاہیوں اور انقلابی سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور بہادر شاہ ظفر کو دوبارہ ملک کا شہنشاہ تسلیم کیا اور اس کا اعلان کروادیا گیا۔اس اعلان سے انگریزوں کے خیمے میں ہلچل مچ گئی۔ دہلی کی سرزمین خون سے لت پت ہو چکی تھی۔ قاضی افضال لکھتے ہیں کہ:

ہائے کیا دہلی پہ آفت آ گئی   چین سے بیٹھے تھے شامت آ گئی
سر پہ عالم کے مصیبت آ گئی   فوج کیا آئی قیامت آ گئی

یا پھر غالب کا یہ انداز جو دہلی ماتم کدہ میں تبدیل ہو چکا تھا:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے اب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک   تشنۂ خوں ہیہر مسلماں کا

دہلی کی تباہی پر بہادر شاہ ظفر کا یہ انداز:

گئی یک بیک ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایائے ہند تباہ ہوئی کہیں گیا جو ان پر جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نیکہا یہ بھی قابل دار ہے

یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں بے گناہ
و لے کلمہ گویوں کی سمت سیا بھی ان کے دل میں غبار ہے
نہ تھا شہر دلّی پر تھا چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
سب ہی جادہ ماتم سخت ہے کہو کیسی گردش وقت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ وہ دیار ہے

اور صدرالدین آزردہ نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تصویر ہی ''فغاں دہلی'' کے ذریعے کھینچ ڈالی۔

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی
والی کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
کب تلک داغ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پر بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں آزردہ نہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اس طرح دہلی کی تباہی کے بعد ۱۳ر مئی ۱۸۵۷ء کو علی گڑھ، اٹاوہ، فیروز پور، متھرا، لکھنؤ، بنارس، بریلی، عظیم آباد، شاہ جہاں پور وغیرہ تک پھیلتی چلی گئی۔ پورا ہندوستان انقلابیوں اور انگریزوں کے درمیان خون کی ہولی میں محو تھا۔ دہلی مستقل جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پورے ہندوستان میں انگریزوں کی کوشش دہلی پر قبضہ کرنے کا تھا۔ اس میں انہوں نے پوری طاقت صرف کر دی اور مدراس و

دیگر جگہوں سے اپنی انگریز فوجیوں کی ایک بڑی تعداد دہلی کوچ کرنے کا حکم دیا۔ بلا آخر طویل جنگ کے بعد ۱۶ر ستمبر کو انگریزوں نے زور دار گولہ باری کے ذریعے کشمیری دروازے کو اڑا دیا۔ پھر ۲۰ر ستمبر کو دوبارہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا گیا اور طویل مقدمہ چلنے کے بعد رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ اسی پر بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے کہ:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تمام ہندوستانیوں خاص طور پر مسلمانوں کو بڑی شکست نصیب ہوئی کیونکہ ان انقلابیوں میں زیادہ تر ناتجربہ کار، ہوش میں کم جوش میں زیادہ تھے۔ حریت پسندوں کی کوئی تنظیم بھی نہ تھی۔ رہبری اور رہنمائی کرنے والا نہ تھا۔ خبر رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسلحہ اور کارتوس کی کمی تھی کیونکہ انقلابیوں نے زنگ آلودہ ہتھیاروں سے جنگ کی تھی۔ معاشی اسباب بھی نہ تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اکثر و بیشتر ریاستوں کے والیوں نے عہدہ اور منصب کے لالچ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح اور بھی بہت سارے اسباب ہیں جو ان کے ناکامی کا سبب بنے اور انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے انتقامی جذبے سے جو جنگ لڑی اور آزادی کی تڑپ لے کر ان کو منھ توڑ جواب دیا اس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے کیونکہ ہندو اور مسلم اس جنگ میں دوش بدوش شریک تھے۔ ڈاکٹر رضوان قیصر ۱۸۵۷ء نکات اور جہات'' کے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستان کی تاریخ عمومی طور پر اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تاریخ خصوصی طور پر شاہد ہیکہ انگریزوں کے ہندوستان آنے سے قبل ہندو، مسلم رشتوں میں کوئی کشیدگی نہ تھی اور ہم ایک قوم تھے۔ ہاں یہ بات بھی صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً ریاستیں آپس میں جنگ کرتی رہتی تھیں مگر ان جنگوں میں فرقہ واریت کے عناصر ہرگز کارفرما نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں قومی اتحاد و یگانگت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس کی ایک کڑی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قومی یکجہتی اور ہندو مسلم باہمی رشتوں کی گرمجوشی کی مثال ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا آزادی کی پہلی جنگ سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتی۔''[1]

۱۸۵۷ء کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہر ہندوستانی نے جان و مال،عزت و آبرو سے قربانی دی۔ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح اس جنگ کی روداد اور اس کی حقیقت کو عوام الناس تک پہنچانے اور عوام میں انگریزوں کے حرکات وسکنات اور ان کے بارے میں مختلف الرائے وغیرہ کو بیان کرنے کا سہرا اخباروں نے بھی خوب نبھایا ہے۔ کیونکہ صحافت کا کام سچائی کو بے نقاب کرنا اور صحافی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے سماج کو مستعد اور حالات سے باخبر رکھنے میں کوتاہی نہ برتے۔

ہندوستانیوں کو آپس میں اتحاد اور بھائی چارے کی خبر سے روبرو کرانے کے لئے جو لائحہ عمل تیار کیا گیا وہ اخبار نویسی کا کام تھا۔ ہندوستانی اخبار نویسی کے ذریعے ملک گیر بغاوت کو بروئے کار لایا گیا۔لیکن اگر ہندوستانی اخبار نویسی کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ ابتدا ہی سے اخبار کا مزاج باغیانہ تھا۔ ہندوستان میں یورپ کے جو ترقی یافتہ اور مفید فن مثلاً غم سے نجات دلانے،آپس میں قومی اتحاد قائم کرنے کا جو ذریعہ دبے پاؤں ہندوستان میں داخل ہوا، وہ فن صحافت تھا۔لیکن کسی حد تک یہ فن ہندوستانی حکمراں طبقے کا بھی دشمن ثابت ہوا۔

البتہ اس فن کی مصروفیات سے دیگر کمپنی کے لوگ باخبر تھے۔محض یہ کہ حکمراں طبقہ جو فن صحافت کا دشمن تھا اس نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان میں فن صحافت کی شہرت نہ ہو اور ہندوستانی عوام فن صحافت کے علم سے بے خبر رہے تا کہ ملک کے باشندے اس سے محفوظ رہی۔لیکن ایسا ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ اگر دنیا میں قومی اتحاد بھائی چارے کی دعوت نہ دی جاتی تو ہندوستان پوری طرح تباہ و برباد ہو جاتا۔اس لئے انگریز ہندوستانی عوام کو اردو صحافت سے دور رکھنا چاہتے تھے کہ اگر ہم ان کو صحافت سے دور نہیں رکھیں گے تو یہ عوام ہماری بھی دشمن ہو جائے گی کیونکہ صحافت کا فن ایسا فن ہے جس کے ذریعے ہم عوام میں ایک تحریک کا آغاز کر سکتے ہیں۔اس لئے حکمراں طبقہ کے لوگ عوام الناس کو فن صحافت سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

لوگ آپس میں کٹتے مرتے،خون خرابے کا ماحول برپا رہتا۔ان تباہ کن حالات کو دیکھتے ہوئے ایسی صورت حال میں اس کے اندر اخبار شائع کرنے کا فیصلہ لیا گیا تا کہ عوام خبر کے ذریعے ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت رکھ سکے۔اسی جذبے کے ساتھ اخبار رسانی کے فیصلے سے

اس بات کو ذہن نشین رکھا گیا کہ خبر کے ذریعے ہندوستانی عوام انگریزوں کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو سکے۔

صحافت:

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جو صحف سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معٰنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ یعنی ایسا مطبوعہ مواد جو شائع ہوتا ہے صحافت کہلاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں یہی اصطلاح رائج ہے۔ جبکہ انگریزی میں Journalism کہا جاتا ہے جو جرنل سے ماخوذ ہے۔ جرنل کو ترتیب دینے والے کے لئے journalist یا صحافی کی اصطلاح رائج ہے۔ ایسے صحافی جو اس پیشہ کو مکمل طور پر اپناتے ہیں یا اسے ذریعہ روزگار بناتے ہیں انہیں Working Journalist کہا جاتا ہے۔ جو صحافی جز وقتی طور پر یہ کام کرتے ہیں اور کسی ایک مخصوص اخبار سے وابستہ نہیں رہتے بلکہ مختلف اخبارات میں مضامین رفیچر کالم لکھتے ہیں وہ آزاد صحافی (Freelance Jourlalist) کہلاتے ہیں۔

صحافت کا اور خاص طور پر اردو صحافت کا علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی اور تہذیب پہلو بھی ہے۔ ہم عام طور پر عملی پہلو دیکھیں تو اخبار ہی واضح دیکھا جا سکتا ہے جس میں علم کے حوالے سے بہت ساری معلومات میسر ہوتی ہیں۔ صحافت کی زبان کے بھی تین پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا علمی، دوسرا ادبی اور تیسرا مواصلاتی، یعنی عام بول چال۔ اس لئے اردو صحافت کی زبان معیاری، بے مثال خوبصورت اور نمایاں ہوتی ہے۔

صحافت کسی بھی معاملے کے بارے میں تحقیق اور پھر اسے صوتی، بصری یا تحریری شکل میں بڑے پیمانے پر قارئین، ناظرین یا سامعین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے۔ جو تکنیکی لحاظ سے شعبہ صحافت سے منسلک ہے وہ عوام کو باخبر رکھنے کا ہے۔ اداروں جیسے حکومتی اور تجارت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ صحافت کسی بھی معاشرے کے کلچر کو بھی اجاگر کرتی ہے جس میں فنون لطیفہ، کھیل اور تفریح کے اجزا شامل ہیں۔

اردو صحافت کی تاریخ:

ہماری تاریخ، خاص طور پر صحافت کی تاریخ جو سماج کا آئینہ ہے۔ روزمرہ کی کہانی پیش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنے اس باب کے تحت ''انتقامی جذبہ اور آزادی کی تڑپ'' کے زیرعنوان ۱۸۵۷ء میں صحافتی کردار اور اس کے دستاویزات کی شکل میں ان حقائق کو دریافت کرنے کی جسارت کریں گے کہ وہ کون کون سے اخبارات تھے جنہوں نے بڑی جانفشانی سے ۱۸۵۷ء کے حقائق کو بیان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ اور حکومتی سطح پر ڈر محسوس نہیں کیا بلکہ عوام اور حکمرانوں کے اہم فیصلوں کو بیان کرنے میں کوئی تردد نہ ہوا۔ ہندوستان میں اخبار کی ابتداء خاص طور انگریزی اخبار کی ابتداء ۱۷۸۰ء میں ہوئی۔ اس کے بیالیس سال بعد ہندوستانی اخبار نویسی خاص طور پر فارسی اور اردو کی ابتداء ۱۸۳۳ء میں ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے اختتام میں ہندوستانی اخبار نویسی کو بہت ساری آزادی حاصل نہیں تھی۔ ان میں خاص طور پر ''سچ بولنے کی آزادی'' جو کہ کسی بھی ''پریس کی آزادی'' اس کا بنیادی حق ہے۔ ہندوستان کے اخباروں کے لئے برطانوی حکومت جو کہ ابھی وہ پورے ملک پر مسلط بھی نہیں ہوئی تھی اس وقت ان کا حکم نامہ یہاں کی بادشاہت اور صوبائی سطح پر راجہ، مہاراجہ پر بھی اثر انداز تھا۔ اسی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت اپنے وقار اور معاشیاتی نقطۂ نظر سے ہر ایک پر حاوی تھے۔ دیسی اخباروں کے لئے ان کا پہلا قانون تھا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام ۱۷۹۹ء میں لارڈ ڈوپلزی کے تحت درج ذیل پانچ ہدایات نافذ ہوئیں۔

۱۔ ہر اخبار کا ایڈیٹر اور مالک اپنے پتے سے حکومت کے سکریٹری کو مطلع کرے
۲۔ اخبار کے آخری صفحے پر بانتر (پرنٹر) کا نام چھاپا جائے
۳۔ اتوار کے دن کوئی اخبار شائع نہ کیا جائے
۴۔ ان قاعدوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کو یورپ بھیج دیا جائے گا
۵۔ حکومت کا سکریٹری یا کوئی اور افسر جس کو اس کام کے لئے مقرر کیا جائے جب تک اخبار کے پروف کا معائنہ نہ کرلیا اس وقت تک اخبار نہ چھاپا جائے۔

ان ہدایات پر دیسی اخباروں نے عمل نہیں کیا تو اور بھی سخت قوانین لا کر ان پر سختی برتی گئی اور ۱۸۲۳ء کو ایڈم نے عارضی طور پر گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا تو سپریم کورٹ سے یہ قانون پاس کرایا کہ اگر حکومت کے خلاف اخبار، پمفلٹ، رجسٹر، رسالہ، کتاب، عام خبریں یا خفیہ اطلاعات میں

حکومت کی کاروائیوں پر نکتہ چینی کی تو اس کا لائسنس منسوخ کر دیا جائے گا۔اس کے خلاف راجہ رام موہن رائے اور کلکتہ جنرل کے ایڈیٹر نے اپیلیں دائر کیں لیکن کورٹ سے خارج کر دیا گیا۔لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ہندوستانی اخباروں کے مزاج میں صداقت،صاف گوئی،ضمیر کی آواز میں لچک تھی۔ یہ اپنی آواز سے کیسے پیچھے ہٹ سکتے تھے۔اسی لئے ابتدا ہی سے ان اخباروں کے تیور سخت اور صداقت پر مبنی خبروں کو شائع کرنے کے تھے کیونکہ ان اخباروں کے ایڈیٹروں نے ملک کے حالات اور عوامی اضطراب کو محسوس کیا۔اور یہ بھی محسوس کیا کہ انگریز کی مسلط تمام ہندوستانیوں کے لئے بھیانک منظر نامے سے کم نہ ہوگا۔اسی لئے ان اخباروں نے صداقت کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بہت سارے دیسی اخباروں نے انگریز اور ملک کے مسائل سے دوچار مسئلہ کو بیان کرنے سے قاصر تھے کیونکہ وہ انگریزوں کے عتاب کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے۔اسی لئے بڑے سیدھے سادے انداز میں اخبار نکالتے اور عوامی خبروں کو بیان کرتے لیکن فارسی اور اردو اخباروں نے اپنا الگ طریقہ اپنایا۔ان اخباروں میں بھی بہت سارے اخبار صرف عام زندگی کے مسائل اور اس کا حل کا راستہ تلاش کرتے ہوئے بڑے سادہ انداز میں جاری کیے۔

ہندوستانی اخبار نویسی کی ابتدا انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی اور سب سے پہلا اخبار ''ڈگ درشن'' بنگالی زبان میں جارین ہوا۔اس کے بعد سماچار درپن وغیرہ شائع ہوئے۔اس کے دو دہائی کے بعد ہر ہری پرشاد نے راجہ رام موہن رائے کے توسط سے ۱۸۲۱ء میں بنگلہ اخبار ''سنواد کمودی'' جاری کیا۔ان اخبارات میں سیاسی خبروں کے علاوہ ہندو سماج کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا۔ان دنوں ستی کا رواج عام تھا۔سنواد کمودی کے معاون ایڈیٹر بھوانی چرن بندو پادھیائے نے ''سماچار چندریکا'' جاری کیا۔ ہردت نے مخالفانہ رویہ سمجھ کر اپنے لئے چیلنج سمجھا اور ۲۷/ مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو کا پہلا اخبار ''جام جم'' جاری کیا جبکہ اس سے پہلے یہ اخبار فارسی میں نکلا کرتا تھا۔لیکن کسی مجبوری کے تحت یہ اخبار ۲۳/جنوری ۱۸۲۸ء کو اردو میں بند ہوگیا اور فارسی میں جاری رہا۔اس کے بعد فارسی میں ''شمس الاخبار'' منی رام کی ادارت میں نکلنے لگا۔اس کے بعد مختلف زبانوں میں اخباروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا۔البتہ بہت سارے فارسی اخبار جن میں اردو ضمیمہ بھی ہوتا تھا ان اخباروں میں ''ماہ عالم فروز'' مہر نیم روز،سلطان الاخبار،آئینہ سکندر وغیرہ ہیں۔۱۸۳۵ء

کے بعد اردو اخباروں کا چلن عام ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں بنارس سے خیر خواہ ہند، دہلی سے سید الاخبار جو سرسید کے بڑے بھائی سید محمد نکالتے تھے۔ اس کے بعد مولوی باقر حسین کی زیر قیادت دہلی سے ''دہلی اردو اخبار'' جاری ہوا۔ اس کے بعد اردو اخبارات کی تعداد دن بہ دن بڑھنے لگی۔ جن میں مخزن، الا۔۔ احمدی، صدرالاخبار، گلدستہ وغیرہ اہم اخبار نکلنے شروع ہوئے۔ دوران غدر اور غدر کے بعد نکلنے والے اخباروں میں اردو گائڈ، شمس الاخبار، امین الاخبار، طلسم حیرت، اودھ اخبار، ہندوستانی اخبار، عالم، مدارس پنچڑ وکٹوریہ گزٹ، عمدۃ الاخبار، ریاضی الاخبار، تہذیب الاخلاق، سعد الاخبار وغیرہ اخبار تھے جنھوں نے صحافت کو آگے بڑھایا۔

اردو صحافت کی تاریخ بہت پھیلی ہوئی اور منتشر حالت میں ہے۔ ڈیڑھ پونے دوسو سال کے عرصے میں برصغیر کے کوچے سے اردو اخبارات اتنے بڑے پیمانے پر طلوع اور غروب ہوئے کہ مؤرخینِ صحافت کی جانب سے اردو اخبارات کی بابت بے شمار معلومات اور تفصیل سمیٹ لینے کے باوجود سیکڑوں اخبارات کے متعلق ہمارا علم تا حال ناقص اور ادھورا ہے۔

انیسویں صدی کی صحافت کے سلسلے میں ہماری معلومات کا اولین ماخذ اشرف نقوی کی کتاب ''اختر شہنشاہی'' (مطبوعہ ۱۸۸۸ء) ہے جس میں اس دور کے اخبارات کا حال مختصراً قلم بند کیا گیا ہے۔ دوسرا ماخذ ''مقالات وخطبات نگاری وتا تاسی'' ہیں جن میں اس زمانے کے اخبارات کے بارے میں بڑی نادر معلومات ملتی ہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مذکورہ کتابوں کے علاوہ اردو صحافت کے ارتقائی دور کے متعلق ہمارے پاس کوئی اور قدیم ذریعہ نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

آج اردو صحافت بہ اعتبار مقدار، معیار اور اثرات جنوب مشرقی ایشیا کی کسی بھی دوسری زبان کی صحافت کی ہمسر کہی جاسکتی ہے۔ اس مقام تک رسائی میں اسے جن ارتقائی مرحلوں سے اور جانگسل تجربوں سے گزرنا پڑا اس کی داستان طویل ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت نے دو صدی قبل آغوش غلامی میں آنکھ کھولی۔ پہلی جنگ آزادی میں برطانوی استعمار کے خلاف صف آرا ہوئی پھر اسی استعمار کے زیر سایہ پروان چڑھی اور آخر کار اس استعمار کو دیس سے نکال دینے کی تحریکات کا ہراول دستہ بنی۔

انیسویں صدی نتیجہ خیز سیاسی رزم آرائی اور بعد ازاں فیصلہ کن سیاسی وتہذیبی تبدیلیوں کے علاوہ اردو صحافت نے جنم لیا۔ اس کی نشو ونما ہوئی، اس کی ہئیت ،مزاج، زبان اور اسلوب سبھی کچھ اسی دور میں متشکل ہوئے۔ لہذا اردو صحافت کے تدریجی ارتقا کے مطالعہ و تجربہ کے لئے اس صدی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور اول ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء اور دور ثانی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک عرصے پر محیط ہے۔

صحافت کا وجود قدیم دور میں بھی الہام کی صورت میں موجود تھا لیکن الہام سے اخبار کا سفر طے کرنے میں صحافت کو ہزاروں سال کا عرصہ لگا۔ اس عرصے میں کرہ ارض نے کتنی عظیم الشان تاریخی تبدیلیاں دیکھیں جن کی خبر آنے والے زمانے کے لوگوں کے لئے مختلف ذرائع سے محفوظ کی گئیں۔ آج کی ہر لمحہ بدلتی دنیا نے گذشتہ چند سالوں میں صحافت کا انداز بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اخبار سے ریڈیو، پھر ٹی۔ وی اور اس کے بعد آن لائن جرنلزم کا سفر محض چند سالوں میں طے ہو گیا اور آج ہم ذرائع ابلاغ کے تیز ترین دور میں سانس لے رہے ہیں۔

جدید دور میں صحافت مکمل طور پر نیا رخ اختیار کر چکی ہے اور عوامی رائے پر مؤثر طریقے اثر انداز ہوتی ہے۔ عوام کا بڑے پیمانے پر اخبارات پر معلومات کے حصول کے لئے اعتماد، صحافت کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات کے بارے میں معلومات کا حصول تیز ترین اور انتہائی آسان ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں پہلا انگریزی اخبار ۱۷۸۰ء میں نکلا اس اخبار کے بعد کسی دیگر اخبار کا آغاز نہیں ہوا۔ پہلا انگریزی اخبار انگریزوں کے ذریعے ہی شائع ہوا۔ اس اخبار سے عوام میں رفتہ رفتہ سلیقے کا آغاز ہوا۔ اس کے ۴۲ (بیالیس) سال بعد ۱۸۲۲ء میں ہندوستانی اخبار نویسی کا بھی آغاز ہو گیا۔ محمد عتیق صدیقی ان اخبارات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ’’ہندوستانی اخبار نویسی کے ابتدائی دور ۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۷ء کا اگر جائزہ
> لیا جائے جو بڑی حد تک فارسی اور اردو اخبار نویسی کا دور تھا تو اس کی
> گہرائی میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف نفرت و عداوت کے بھڑکتے
> ہوئے شعلے نظر آئیں گے اس کا نقطۂ عروج ۱۸۵۷ء کے اوائل کا زمانہ

تھا جب کہ خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی اخباروں نے غیر
ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے جذبات عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا
نہیں رکھی۔'' ۲

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی ابتداء سے ہی ہندوستان میں بغاوت کی ابتداء ہونے لگی تھی جس کے نتیجے میں ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑکنا اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت دل میں بھڑکنے لگی تھی اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے آغاز ہی سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت بھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔

ان سب حالات کے ساتھ ہندوستانی اخبارات نے انگریزوں پر نکتہ چینی کرنا شروع کردیا۔ اس سلسلے میں لکھنؤ اور کلکتہ کے اخبارات کا کردار قابل ذکر ہے۔ ان سے پہلے بھی اردو صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے بے شمار خدمات انجام دی ہیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔

اردو صحافت کی بے شمار خدمات رہی ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس نے اپنے اندر مختلف ادائیں سموئے رکھتے ہیں جس سے ہمہ وقت اردو خدمات انجام دی ہیں۔

صادق الاخبار جو دہلی سے شائع ہوتا تھا اس سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جس کا حوالہ محمد عتیق صدیقی نے بھی اپنی کتاب ''اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں'' میں دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''صادق الاخبار (دہلی) کے بیان کے مطابق اخبارات مفصلات
آگرہ، بمبئی گزٹ دیگر اخبارات انگریزی نے بہت رشک سے لکھا
ہے کہ ہندوستانی اخبار والوں کو آزادی پریس نہیں (دینی) چاہئے۔
کیونکہ یہ لوگ اس کی قدر نہیں جانتے اور کبھی ایسی آگ لگا دیتے ہیں
کہ بجھائے نہیں بجھتی۔'' ۳

درج بالا اقتباس سے ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ انگریزی اخبارات نے علاقائی اخبارات کے ذریعے ملک کی فضا کا اندازہ لگایا کہ ملک میں امن وامان اور بھائی چارے کا خاتمہ کیا جائے۔

جس کے نتیجے میں انگریزوں نے پہلا قدم ہندوستانیوں کے اخبارات شائع ہونے پر پابندی لگانے کا بیڑا اٹھایا۔یعنی انگریزی حکومت نے ہندوستانی اخبارات کی اشاعت پر پابندی عائد کردی۔اس کے بعد انگریزی اخبارات نے ملک کی فضا کو بحال کرنے کا منصوبہ بندی کی کیونکہ اخباروں کے ذریعے ایک ملک سے دوسرے ملک تک خبر رسانی کا کام کیا جاتا تھا۔

۱۸۵۷ء میں حصہ لینے والے اخبارات جس کا مزاج باغیانہ تھا اس میں اردو اور فارسی کے اخبارات نمایاں ہیں۔انگریزوں کے جارحانہ رویے کی بدولت ہندوستانی عوام ان سے بدظن تھی اور ان کے خلاف نفرت کی آگ میں جھلس رہی تھی۔اخباروں نے کھل کر ان تمام باتوں کو بیان کیا جس کو حکومت پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔بغاوتی احوال کے حوالہ سے گورنر جنرل لارڈ لینگ کونسل کی تقریر میں کہتا ہے کہ:

> ''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کردئے ہیں۔یہ کام بڑی مستعدی، چالاتی اور عیاری سے انجام دیا گیا ہے۔''[۴]

ان اخباروں نے بڑی بے باکی کے ساتھ ملک میں ہو رہے انگریز مخالف رویے کی کھل کر تائید کی اور اخباروں کے ذریعے ان حقائق کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی کہ موجودہ صورت حال انگریز ہندوستانی باشندوں کو بڑی خاموشی کے ساتھ عیسائیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے۔بغاوت کی لہر شروع ہوتے ہی انگریزوں نے ہندو اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔کارتوس کے ذریعے ان کے تئیں ہر ہندوستانی مشتعل ہو گیا اور ان کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔اخباروں نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ ان کارتوسوں میں سؤر اور گائے کی چربی کا استعمال ہوا ہے جس کو کوئی بھی ہاتھ نہ لگائے۔ان اخباروں کی سرخیوں نیپورے ہندوستان میں آگ کی لہر پیدا کردی اور ہندوستانی ہوشیار ہو گئے۔گارسا دتاس کے مطابق اس اقتباس کو دیکھیں:

> ''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخباروں نے جو بے دلی پھیلانے میں پہلے ہی سے مستعدی دکھا رہے تھے۔اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوس کو ہاتھ لگانے سے

انکار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ باور کرادیا کہ اس حیلے سے انگریز
ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔'' ۵؎

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ظلم وزیادتی سے پریشان، روہیلہ، مرہٹہ اور سکھوں کی یلغار نے سلطنت دہلی کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ دہلی میں یہ خبر عام ہوگئی کہ شاہ ایران ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔امید کی کرن جاگی۔صادق الاخبار نے اس خبر کو بڑی مسرت کے ساتھ اس انداز میں شائع کیا۔

''ایک اشتہار نام نہاد شاہ ایران دہلی میں گزرگاہو پر آویزاں کیا گیا ہے۔....خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اہل اسلام کو نصاری کی مدد ومعاونت سے پرہیز کرنا واجب اور مناسب ہے کہ حتی المقدور مسلمانوں کی نیک خواہی میں مساعی اور عزؔ ریزی ہیں۔انشااللہ قریب ہے کہ میں سریر ہند پر جلوہ گر ہوتا ہوں اور وہاں کے بادشاہ ورعیت کو فرسند وشاماں کرتا ہوں جیسا کہ انگریزوں نے ان کو نان شبینہ سے محتاج کیا ہے......مجھ کو کسی مذہب سے غرض نہی۔....پس واجب ہے کہ بوڑھے، جوان، ادنیٰ واعلیٰ، عقل مند، کم فہم، کسان اور سپاہی سب کے سب بے بس اور پس وپیش اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ہتھیار باندھ لیں علم اسلامی بلند کریں اور اپنے ہم قوموں کو بھی راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت پہنچائیں۔'' ۶

ہندوستانی اخبارات جنہوں نے وقت اور حالات کے مطابق انگریزوں کے خلاف تحریر، تقریر، واقعات اور حالات سے باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں سرفہرست صادق الاخبار، سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار کے علاوہ مراۃ الاخبار، اخبارِ ظفر، اخبار بہار، پٹنہ، دوربین، صدرالاخبار آگرہ، قلعہ معلیٰ اور انگریزی حکومت کی کارکردگی پر منحصر تھی۔عمدۃ الاخبار، قائد خان اور بہادر خان وغیرہ جوان مرد کے حق میں مضامین شائع کرنے کے جرم میں اس اخبار کو بند کردیا۔سلطان الاخبار کلکتہ نے بڑے زور وشور سے جہادیوں کی خبروں کو شائع کیا لیکن دشمن کی نظر میں کھٹکنے لگا اور حکومت نے اسے ضبط کرلیا۔ترجمان شوق میں سکندر آفندی نے دہلی اور لکھنؤ کے تباہ کن حالات دیکھ کر دہل

گیا اوراس نے اس اخبار کے ذریعہ تفصیل کے ساتھ برطانوی حکومت اور ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے حالات اور تباہی کو بیان کیا اس کی پاداش میں اس اخبار پر پابندی عائد کردی۔طلسم لکھنؤ، سحر سامری رسالہ، بغاوت ہند، چشم فیض وغیرہ اخباروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات تو پوری ہندوستان میں یکساں تھے لیکن دہلی کا معاملک کچھ اور تھا کیونکہ دہلی دارالسطنت ہونے کی وجہ سے ہرایک کی نگاہ اس پر تھی۔ان میں انگریز حکمراں سرفہرست تھے۔ ملک کی راجدھانی پر تسلط قائم کرنے کے لئے بے چین و بے قرار تھے۔ اس درمیان جتنے بھی حالات وواقعات رونما ہوئے ان تمام چیزوں کو ۱۸۵۷ء کے حالات پر لکھی گئی کتابوں، رسالوں اور سرگذشت میں بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اخبار بھی ان تمام احوال واطوار کو جو روزمرہ کی داستان تھی اس کو اپنے اخباروں کی زینت ہر اخبار والوں نے بنایا۔ان ہی اخباروں میں ایک اخبار ''پیام آزادی'' بھی ہے۔

''پیام آزادی'' نامی اخبار نے ۱۸۵۷ء کے حالات کو خوب قلم بند کیا۔اپنے اخبار کے ذریعے تحریک آزادی میں نئی روح پھونک دی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے میں اس اخبار نے جان توڑ محنت کی تا کہ ملک کی سالمیت کو بچانے کی خاطر ہر ہندوستانی کو قربانی دینی پڑے گی۔اس اخبار کو جاری کرنے والے بہادر شاہ ظفر کے نواسے مرزا بیدار بخت ہیں لیکن اس کی ادارت کی ذمہ داری عظیم اللہ خان کی تھی جو اس تحریک کے عظیم قائد اور روح رواں بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا کوئی بھی اعلان اسی اخبار میں چھپتا تھا۔۱۸۵۸ء میں لندن سے The Narative of the Indian Revolt نامی کتاب چھپی تھی۔اسکتاب میں ''پیام آزادی'' کے حوالہ سے یہ اقتباس نقل کیا ہوا ملتا ہے:

> ''بھائیو! دلّی میں فرنگیوں کے ساتھ آزادی کی جنگ ہورہی ہے۔اللہ کی دعا سے ہم نے انہیں جو پہلی شکست دی ہے اس سے وہ اتنے گھبرائے ہوئے ہیں کہ جتنا کسی دوسرے وقت وہ دس شکستوں سے نہیں گھبرائے۔بے شمار ہندوستانی بہادر دلّی میں آ آ کر جمع ہورہے ہیں۔ایسے موقعوں پر اگر آپ وہا کھانا کھا رہے ہیں تو ہاتھ یہاں آکر

دھوئیے۔ ہمارے کان آپ کی طرف لگے رہتے ہیں۔ ہم آپ کی
توپوں کی آواز سننے کو بے چین ہیں۔ ہماری آنکھیں آپ کے دیدار کی
پیاسی سڑک پر لگی ہوئی ہیں آپ کا فرض ہے کہ فوراً آیئے۔''[۷]

''پیام آزادی'' کا کردار ۱۸۵۷ء میں بخوبی ادا ہوا۔ صاحبان ادارت ملک کے حق میں اور انگریزوں کے ظلم وزیادتی کو بیان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ یا سی وجہ سے انگریزوں کو دوبارہ دہلی پر قبضہ ملنے کی صورت میں پیام آزادی کے قارئین اور صاحبان مدیران وغیرہ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

اس طرح ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات پر چند کتب اور اخبارات ہی ایسے ہیں جو صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان میں تحریر کردہ چیزیں اور فارسی کے زیر اثر آنے والی تحریریں اس سمت میں بہت خاص ہیں۔

ہندوستانی اخبار نویسی کی یہ بات خاصی قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانے کے بعد کسی بھی زبان کے اخبار فارسی ہو یا اردو کوئی بھی دستاویز موجود نہیں اور اب تک ان کی معلومات کسی کو فراہم نہیں ہو سکی ہے۔

اگر موجود ہوتے تو ان اخبارات کی مدد سے ۱۸۵۷ء یعنی بغاوت کی تمام معلومات فراہم ہو سکتی تھی۔ اس دور کے حالات کا بہ خوبی آسانی سے جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ دہلی کے چند گنے چنے اخبار ہی قابل ذکر ہیں جن کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔ وہ اخبارات درج ذیل ہیں۔

۱۔ سراج الاخبار
۲۔ دہلی اردو اخبار
۳۔ صادق الاخبار

اب ہم ان اخبارات کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

سراج الاخبار:

اس اخبار کی اشاعت بہادر شاہ ظفر کے دور میں شروع ہوئی جس کا تعلق بہادر شاہ ظفر کے دربار سے تھا۔ اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ''دہلی اردو اخبار'' اور صادق الاخبار میں بھی ہوتا تھا۔ سراج الاخبار بہادر شاہ ظفر کا درباری اخبار تھا۔ سراج الاخبار بہادر شاہ ظفر کا اخبار تھا۔ اس اخبار کو بہادر شاہ

ظفر کے روزنامچہ یا سراج الاخبار کے نام سے جانتے تھے کیونکہ اس میں قلعہ معلیٰ کی زیادہ تر خبریں ہوتی تھیں۔ اوراس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ یہ اخبار روزنامچے کے مزاج کو اصولاً برتا گیا۔ ا میں جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے حالات اور جنگ کی روزانہ کی روداد ہوا کرتی تھی۔ انگریزوں کے ظلم وزیادتی جبری تسلط،توپوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ کو بیان کرنے سے کتراتے نہیں تھے بلکہ اخبار کی آزادی کا حق ادا کرتے تھے۔ سراج الاخبار میں چھپی ایک خبر ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کے ان احوال کو بیان کرتی ہے جو ملک میں غدر یا جنگ آزادی کی پہلی کرن تھی اس کی روداد اس انداز میں ملتی ہے۔ سراج الاخبار کا اقتباس دیکھیں:

''یوم دوشنبہ شانزدہم رمضان مطابق ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء

''صبح کو خسرو خاور نے جب کوہساروں پر اپنے جھنڈے گاڑے تو فرمانروائے اقلیم ہند نے بعد نماز،خسرو کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ احترام الدولہ (حکیم احسن اللہ خاں) کو شرف فیض شناسی بخشا۔ خضار دربار بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے۔

آٹھ بجے کے بعد خبر ملی کہ ضلع میرٹھ کی انگریزی فوج کے سواروں اور پیادوں نے وہاں کے حکام وقت سے سرتابی کی ہے اور اپنے افسروں کو قتل کرنے کے بعد جوق در جوق جھروکہ کے نیچے حاضر ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جھروکے کے دروازے کھولنے کے لئے آوازیں لگا رہے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی بادشاہ نے شرف الدولہ بہادر کو یاد فرما کر حکم دیا کہ قلعہ درا بہادر (کیپٹن ڈاگلس) کو اس ماجرے کی اطلاع دی جائے۔ چنانچہ وکیل سلطانی نے قلعہ دار بہادر کو حسن الحکم حضور سلطانی میں حاضر کیا۔ اس بہادر نے تمام سوار اور پیادوں سے جو جھروکے کے نیچے جمع تھے چلاّ کر کہا کہ حضور (بادشاہ) کو تکلیف نہ دو اور یہاں سے ہٹ کر کسی اور طرف چلے جاؤ۔ یہ سن کر وہ سب راج گھاٹ کی طرف چلے گئے۔

قلعہ کے تمام دروازوں کو بند کرنے کے حکم والا تبار نے شرف نفاذ پایا۔ اسی اثنا میں قلعہ دار بہادر نے اجازت چاہی کہ جھروکہ کے

نیچے جا کر اس گروہ کثیر کو روکے لیکن حضور پرنور نے جو حکمت پناہ بھی
ہیں۔اسے اس ارادہ سے باز رکھا۔اور گھر واپس جانے کے لئے فرمایا
کہ مبادا اس گروہ کے ہاتھوں مارا نہ جائے۔حکمت پناہ کے بے حد
اصرار پر گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوئے قلعہ دار بہادر نے درخواست
کی کہ....میموں کے لئے دو پالکیاں اور دو ضرب توپیں عنایت ہوں
(تا کہ انہیں محل کے زنانے حصے میں منتقل کر دیا جائے) حضور نے حکم
دیا کے دونوں چیزیں فوراً اس کے ساتھ کی جائیں۔
پالکیاں اوت توپیں قلعہ دار کے پاس پہنچی ہی تھیں کہ اطلاع ملی کہ امین
الدولہ بہادر (مسٹر سائمن فریزر) قلعہ دار بہادر (کیپٹن ڈگلس) کی
کوٹھی میں آئے اور بگھی میں بیٹھ کر سواروں کے ہمراہ کلکتہ دروازے
تک جانے کے بعد قلعہ مبارک کی طرف لوٹے۔راہ میں دو ایک ترک
سواروں سے مقابلہ و مجادلہ ہوا قلعہ مبارک میں داخل ہوتے وقت بگھی
سے اتر پڑے اور ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ایک اور انگریز کے ہمراہ
لاہوری دروازے کو بند کرنے کا حکم دیا۔اسی تردد و مرور میں دو ایک
ترک سوار،ان کی سازش سے اندر گھس آئے جو درازے کے پہرے
پر متعین تھے اور اس بہادر کا کام تمام کر دیا۔
اس کے بعد ان تلنگوں نے،جو پہرے پر متعین تھے،قلعہ مبارک کے
دونوں دروازے بلکہ شہر پناہ کے دروازے بھی کھول دیئے۔پھر تو اس
(باغی) گروہ کے لوگ مور و ملخ کی طرح ہر دروازے سے قلعہ کے
اندر گھس آئے۔اور (اس کے ساتھ ہی) قلعہ دار اور میمیں خاک و
خون میں تڑپنے لگیں بلکہ تمام انگریز خواہ اہل سیف تھے یا اہل قلم
موت کے گھاٹ اتار کر ان کے مکانوں کو آگ لگان دی۔یہ خبر
وحشت اثر سن کر شہر یار (بادشاہ سلامت) کو سخت تشویش ہوئی۔اس
شورش اور طغیانی بے تمیزی میں سیکڑوں جگہ (انگریزوں کا) قلع قمع
ہوا۔''[8]

اس طرح سراج الاخبار میں روزنامچے کی شکل میں خبریں چھپتی تھیں۔روزانہ کے حالات

قلم بند ہوتے تھے۔غدر کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کو اس لئے بند کردیا کہ اس اخبار نے ۱۸۵۷ء کے حالات انگریزوں کے خلاف کھل کر خوب لکھا۔اس وجہ سے دوبارہ انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد اس اخبار کو شائع ہونے سے روک دیا۔

دہلی اردو اخبار:

یہ اخبار غدر کے زمانے میں دہلی سے ہی شائع ہوا۔اس کے بانی (Editor) مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین صاحب تھے۔غدر کے دوران اس اخبار کو زیادہ تر انگریز پسند نہیں کرتے تھے دیگر اخبارات کے مقابلے یہ اخبار قدرے ''امن پسندانہ'' تھا۔اس اخبار میں خبروں کو پیش کرنے کا انداز بہت ہی آسان اور سہل تھا۔انگریز ہندوستانی اخبارات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت کیخلاف اردو اخبارات کھل کر لکھتے تھے اور ان اخبارات میں حقیقت بیان کی جاتی تھی کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کے ساتھ کس طرح کا ظلم کرتے ہیں اور ہمیں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہمارے سلسلے میں ان کی کیسی منفی سوچ ہے۔اس لیے انگریزی حکومت اردو اخبارات کی دشمن تھی۔

اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جذبے کو نہیں ابھارا گیا۔اصل میں انگریزی حکومت اس چیز سے بالکل بھی نفرت نہیں کرتی تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ہم علم وفنون کو عام کریں اور تعلیم کے میدان میں ان کی پوری توجہ کرائیں اور اس کی مخالفت نہیں کریں وہ اس چیز کی مخالفت کرتے تھے کہ جو اردو اخبارات میں ہم شائع کرتے ہیں ان سے رک جائیں اور انگریزوں کے خلاف لکھنا بند کردیں بس اس لیے وہ اردو اخبارات کی مخالفت کرتے تھے دراصل انگریزی حکومت اردو اخبارات کے نشر واشاعت کی مخالف ہرگز نہیں تھی بلکہ اس سوچ اور فکر کی مخالف تھی۔ چونکہ اس اخبار کا مقصد انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہونا اور عوام میں آپس میں قومی اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔اس اخبار کو شائع کرتے وقت تمام اصولوں کو مدنظر رکھا گیا جس سے کہ انگریزوں میں ناراضگی کا کوئی ولولہ پیدا نہ ہو۔دراصل دہلی اردو اخبار علاقائی خبروں سے پرہیز کرتا تھا جس کا تذکرہ محمد عتیق صدیقی کی کتاب ''اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں'' میں بھی ملتا ہے۔مثلاً بارک پور کے واقع کے بعد علاقائی اخباروں نے جو خبریں شائع کی تھیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ مقام ہے غور اور قیاس کا کہ عوام کالا بازاری لوگ جو گپ ہانکتے تھے اور شہر میں لوگوں کی زبان پر تھا کہ بہتری سپاہ برگشتہ ہو رہی ہے اور مقابلے کو موجود ہے سراسر وہ باتیں لغو اور بے اصل تھیں۔ اس قسم کی بہتری خبریں درباب لکھنؤ اور جنگ ایران وغیرہ امور پر روز نئی نئی طرح سے سنے جاتے ہیں بلکہ لکھے جاتے ہیں لیکن اصلی تحقیق قابل حکم قطعی وتصدیق نہیں ہوتے۔''[9]

اس اخبار میں میرٹھ کے حملے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور میرٹھ کی فوج سے متعلق خبروں کو اخبار میں شائع کیا جانے لگا تا کہ میرٹھ کی انگریزی فوج سے دہلی کی عوام محفوظ رہ سکے۔ کیونکہ دہلی کی عوام کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں میرٹھ کی بچی کچی انگریز فوج دوبارہ دہلی پر قبضہ نہ کر لے اس لیے اس خبر کو دہلی اردو اخبار میں شائع کرنا ہی بہتر سمجھا گیا۔

اس سبب میرٹھ کی انگریز فوج کو مدنظر رکھتے ہوئے اخبار میں کوئی ایسی خبر شائع نہیں کی جاتی تھی جس سے انگریزوں میں غصہ کی آگ بھڑک جائے۔ اس سلسلہ میں محمد حسین آزاد کی نظم ''تاریخ انقلاب'' بھی قابل ذکر ہے۔

محمد حسین آزاد کی نظم ''تاریخ انقلاب'' بہت ہی اہم نظموں میں مانی جاتی ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس نے ہندوستانیوں کو ایک نیا باب دیا اور انقلاب کا پرچم بلند کرنے کے لیے اس نظم نے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی امنگ کو جگایا اور آزادیِ ہند میں جس طرح اردو اخبارات کا اہم رول رہا ہے کہ تخلیق کار اپنے انداز میں بے شمار نظم تخلیق کر کے ایک انقلاب برپا کر دے اور پھر اسی طرح اردو اخبارات نے بھی اہم کردار نبھایا اور سوئے ہوئے قوم کو ان اخبارات نے جگانے کا کام کیا۔

محض یہ کہ دہلی اردو اخبار سے عوام کو انگریزوں کی لڑائی کو روکنے میں خاصی مدد ملی۔ دہلی اردو اخبار کی اشاعت کا مطلب انگریزوں کے خون خرابے کو روکنا تھا جس سے کہ عوام میں یہ اطمینان کا جذبہ پیدا ہو گیا کہ اب انگریزوں کی فوج مکمل طور پر پست ہو چکی ہے۔ کیونکہ خدا کی عطا کی ہوئی جیت کو کوئی نہیں روک سکتا پھر اس اخبار کی روشنی میں بھی یکا یک انقلاب برپا ہو گیا۔

یکا یک دھیرے دھیرے اردو اخبار انگریزی اخبارات کو للکارنے لگے جس کا تذکرہ ہم محمد عتیق صدیقی کی کتاب ''اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں'' میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

> ''اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرنڈ اف انڈیا...... اور وہ لنتر انیاں حکمت وحکومت اناؤں انگلستانیوں کی۔ اب دیکھیں کہ شہر و دیہات کے ہندوستانیوں نے بے۔۔۔۔۔اور نادانوں نے اور بے غرضوں اور بے بندوبستیوں نے اون کے (انگریزوں کے) اہل حکومت و اہل جرائت صاحبان عزم وانتظام کو کس نوبت تک پہنچادیا۔'' [۱۰]

بغاوت شروع ہونے کے دو ماہ بعد ''اردو اخبار'' کا نام بدل کر ''اخبار الظفر ہو گیا لیکن جلد اور نمبر شمار وہی رہا جو ''دہلی اردو اخبار'' کا تھا۔

صادق الاخبار:

یہ اخبار ۲۰/اپریل ۱۸۵۷ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ اخبار انگریزوں کا خاصہ دشمن تھا کیونکہ اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس اخبار کا مقصد ہی یہی تھا کہ انگریز کے خلاف ملک کے عوام تک اس اخبار کے ذریعہ خبر دی جاسکے تا کہ عوام اس حکومت کی اصلیت سے واقف ہوسکیں اور ہندوستانی عوام کے ذہن و دماغ میں یہ بات سرایت کر جائے کہ انگریز ہمارے دشمن ہیں اور ان کے خلاف کھڑے ہو کر سب متحد ہو جائیں اور ہمارا ملک ان کے چنگل سے آزاد ہو سکے۔

محض یہ کہ یہ اخبار انگریزوں کے خلاف تھا جس سے انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے خلاف آگ بھڑکنے کے اسباب رہتے غرض یہ کہ یہ اخبار انگریزوں کا دشمن تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سید جمیل الدین تھے۔

اس اخبار کو بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمے میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ یہ دہلی کا خاصہ قابل اعتماد اور قابل تعریف اخبار تھا۔ جس کو شہر کے تمام طبقات میں مقبولیت حاصل تھی۔ اس اخبار میں بغاوت کے الزام کو بھی خاصی تفصیل سے بیان گیا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق بغاوت پھیلانے کے الزام میں سید جمیل الدین

صاحب کو تین سال قید با مشقت کی سزا بھی ہوئی تھی۔

بقول ایک سرکاری گواہ چنّی لال صادق الاخبار، دہلی کا منہ زور اخبار ہونے کے ساتھ ساتھ شہر کے تمام طبقوں میں خاصا مقبول بھی تھا۔ انگریز صادق الاخبار کے سخت دشمن تھے اور اس کی ہر میدان میں مخالفت کرتے تھے اور صادق الاخبار کو برٹش گورنمنٹ نے بند بھی کروادیا تھا لیکن باوجود اس کے صادق الاخبار عوام الناس کے درمیان مقبول رہا بلکہ اس کی مقبولیت میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا۔ اسی مناسبت سے حکومت کے حلقوں میں صادق الاخبار کا نام باغی رکھ دیا اور یہ اخبار انگریزوں کے درمیان اسی نام سے جانا جاتا تھا لیکن باوجود حکومت کی مخالفت کے یہ اخبار کچھ دنوں تک تو جاری وساری رہا لیکن پھر اخراجات کی تاب نہ سکا اور صادق الاخبار بند ہوگیا۔ صادق الاخبار انگریزوں کے لئے باغی اخبار تھا۔ اخبار کے شائع ہونے کے بعد کافی وقت تک یہ باتیں تھم سی گئی تھیں ماحول میں کچھ بتدیلی سی آ گئی لیکن جب دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو جن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ان میں مولوی باقر حسین بھی خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کی موت کا تعلق انگریزی حکومت یا صحافت سے نہیں تھا بلکہ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کی موت سے تھا جن کو بغاوت کے دوران مولوی باقر نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ جب ٹیلر کی پناہ کی خبر باغیوں کو لگی تو انہوں نے مولوی باقر کے گھر کی نگرانی شروع کردی۔ مولوی باقر کو جب ان پریشان کن حالات کی خبر ہوئی تو ایسے حالات میں انہوں نے ٹیلر کو ہندوستانی لباس پہنا کر اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے باہر کردیا تاکہ ان کی جان بچ جائے لیکن ٹیلر کچھ ہی دور گیا تھا کہ باغیوں کو اس کی خبر ہوگئی اور انہوں نے چند ہی قدم کی دوری پر جاکر ٹیلر کو جا دبوچا اور لاٹھیوں ڈنڈوں سے اس قدر زدوکوب کیا کہ اس کی وہیں موت واقع ہوگئی۔

انگریزی حکومت میں ٹیلر نامی شخص بہت ظالم تھا وہ آئے دن لوگوں پر ظلم وستم کرتا تھا اور کئی لوگوں کے قتل کا ملزم تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ آئے دن ہندوستانیوں پر ظلم کرنے میں ملوث رہتا اور جسے چاہتا اسے قتل کردیا کرتا تھا۔ انگریزی حکومت کا دست شفقت اس کے سر پر تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستانیوں پر ظلم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا اور ظلم کے تمام اسلوب کو اپناتا تھا اس لیے انگریزی حکومت اس کے ساتھ تھی۔ اور ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی اس لیے وہ ظلم اور قتل وغارت گری

میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا اور معتبر شخصیات کو چن چن کر قتل کروا دیتا تھا۔ اسے اپنی دولت اور رتبہ پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس طرح دور حاضر میں مالدار لوگ ہمارے ملک ہندوستان میں جو چاہے کر سکتے ہیں اور کسی کو قتل بھی کرا سکتے ہیں اور کوئی ان سے باز پرس نہیں اسی طرح ٹیلر کے اندر بھی تکبر بھرا پڑا تھا اور وہ لوگوں پر ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔

مولوی باقر کی طرح ہی بہادر شاہ ظفر کا نام بھی جنگ آزادی کے مجاہدین میں سنہرے حرف میں لکھا جاتا ہے جن کو پہلی جنگ آزادی میں ایک عظیم مقام حاصل ہے۔

بہادر شاہ ظفر آزادی کی لڑائی میں اپنی خوشی سے شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کو اس میدان میں لایا گیا تھا۔ جس سے کہ ملک انگریزی فوج ان کے خلاف ہوگئی۔ جس کے تحت ملک گیر سطح پر بغاوت میں ان کا نام خاصی شہرت کا حامل ہوگیا اور ان کو جنگ آزادی میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ بقول محمد عتیق صدیقی:

> ''اٹھارہ سو ستاون کے جہاد آزادی کی داستان میں بہادر شاہ ظفر کی حیثیت ایک مرکزی کردار کی ہوگئی تھی۔ میرٹھ کی باغی فوج جو اس آگ میں سب سے پہلے کود دی تھی (۱۰رمئی ۱۸۵۷) مغلوں کے آخری نام لیوا اور دہلی کے برائے نام اور بوڑھے بادشاہ کو جس کی حیثیت کمپنی بہادر کے پنشن خوار کی تھی اپنا بادشاہ بنا کر اس کے سر پر برائے نام بادشاہت کا وہ تاج رکھ دیا (۱۱رمئی ۱۸۵۷ء) جو کبھی حقیقی طور پر اس کے اجداد کے سر کی زینت ہوا کرتا تھا۔[۱]

جب بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک میں لایا گیا تو خاصی عوام ان کی فرمابردار ہوگئی۔ ان کے آس پاس کے افراد ان کو باغیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں کر سکے جس کے سبب جنگ آزادی کی تاریخ میں بہادر شاہ کو ایک خاص عزت و عظمت کا مقام حاصل ہے جسکے سبب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کا نام ایک ''قومی نشان'' بن گیا۔ ملک کے تمام انگریز دشمن بلا تفریق مذہب وملت ان کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے جنہوں نے ہماری بغاوتی تاریخ کو ایک دل کش اور عظیم ترین شخصیت ثابت کر دیا۔ دہلی کی آزادی کی تاریخ میں بھی اس وجہ سے بہادر شاہ ظفر کو خاص شہرت حاصل ہے کیونکہ جس دوران پورا ملک انگریزوں کی گرفت میں تھا۔ ملک میں قتل عام کا سلسلہ جاری

تھا۔ دہلی پوری طرح بربادی کے دہانے پر تھی اور اس پر انگریزی فوج قابض تھی۔ ملک میں چہار جانب خون خرابا ہو رہا تھا۔ ایسے تباہ کن حالات میں بہادر شاہ ظفر کی ساری ہمدردیاں دہلی کے عوام کے ساتھ تھیں۔ اس دوران انگریز ہندوستانیوں کی عزت نفس پر بھی حملہ آور ہو رہے تھے۔ ایسے حالات میں بہادر شاہ ظفر سے ہندوستانیوں کے لئے جو بھی مدد ہوئی انہوں نے کی۔

بہادر شاہ ظفر بہت معزز تھے اور مغل دور کے باادب اور ہوشیار عقلمند بادشاہ تھے۔ اسلام پرست بھی تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کا نام بھی بہت ہی اہم ہے۔ دراصل یہ جنگ آزادی بہادر شاہ کو جنگ آزادی کا سرپرست نامزد کر کے لڑی گئی تھی اس لیے ان کا نام بھی جنگ آزادی کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا، نہ صرف ان کے شہزادوں کو شہید کیا گیا بلکہ انہیں خود رنگون جلا وطن کر دیا گیا۔ ان کا انتقال بھی رنگون میں ہوا۔ انہیں اپنے ملک میں دفن ہونے کے لیے بھی جگہ نہیں ملی۔

اٹھارہ سو ستاون کے اخباروں اور چند دستاویز کی اشاعت کے بعد حکومت ہند کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ادارے اس کتاب سے متاثر ہوں تو یہ ہی اس کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

لکھنؤ:

دہلی کے علاوہ لکھنؤ میں بھی حالات خاصے پیچیدہ تھے۔ وہاں پر بھی قتل عام کا بول بالا تھا۔ ہر سمت بغاوت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ حالات بہت نازک تھے۔ دوران بغاوت لکھنؤ میں بھی خاص گرما گرمی کا ماحول رہا۔ اس دوران لکھنؤ میں صدر نام کی ایک چھاؤنی کو مہینے کی پہلی تاریخ کو آگ نے گھیر لیا تھا۔ اس دوران لکھنؤ کی رجمنٹ چھاؤنی میں آگ لگ گئی تھی جس میں پولیس کے کافی افراد سپر خاک ہو گئے۔

انبالہ:

اخبار کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ انبالہ میں دوران غدر کافی خون خرابہ ہوا۔ انبالہ اور سیالکوٹ میں کارتوس کو منہ سے توڑنے کو لے کر جم کر ہنگامہ ہوا۔ انبالہ میں خون خرابے کی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی کے قریب ہونے کی بنا پر انگریزی حکومت کا انبالہ پر قبضہ رہا اور قتل و غارت گری کا میدان

گرم رکھا تھا۔اس لیے انبالہ پر ظلم وزیادتی کی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یہاں انگریزوں نے کوئی ایسا عمل نہ تھا جو نہ کیا ہو جس سے انسانیت شرمسار نہ ہوئی ہو۔ ہر میدان میں انگریزی فوج نے ہندوستانیوں کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کیا اور ان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انبالہ پر بھی جنگ آزادی کا گہرا اثر رہا اور یہاں قتل و غارت گری میں بڑا نقصان انبالہ کا بھی رہا۔انبالہ کی تباہی و بربادی کے متعلق محمد عتیق صدیقی بھی اس طرح رقم طراز ہیں:

''صاحب فرانڈ اف انڈیا تحریر کرتے ہیں کہ ان دنوں تمام سپاہ سرکاری نے نئے نئے کارتوس سے سرتابی کرنی شروع کردی ہے۔چنانچہ چند روز ہوئے علاقہ بنگال میں کچھ پلٹن پھر گئی تھیں۔ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔آج از روئے تار برقی معلوم ہوا کہ پلٹن گورکھ (گورکھا) نمبر۶ مقیم انبالہ نہ بر وقت قواعد عمل درآمد کارتوس سے بھی انکار کیا۔اطلاع افسر سپاہ ہندوستانی (Troops) کو حکم زیر کرنے سرکشی پلٹن کا دیا اور ان پر جبر کرانے شروع کیے۔ کہتے ہیں کہ اس طوفان بے تمیزی میں ایک بارک گوروں کی پچھلی رات کو جل کر خاک ہوگئی اور ایک ہندوستانی پیادوں کا اسپتال جو کہ فاصلہ میل بھر کا رکھتا تھا پھنک گیا۔از روئے ایک چھٹی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کو قواعد سے ٹکراتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں لوگوں کے دل کا شک ابھی بالکل رفع نہیں ہوا۔۱۲

نتیجہ یہ کہ ملک میں ہر جانب خون خرابے کا ماحول تھا کہیں آپس میں مارکاٹ جاری تھی تو کہیں کارتوسوں کو لے کر ہنگامہ تھا۔

میرٹھ:

ایک اخبار کے ذریعے میرٹھ کے بارے میں یہ معلومات فراہم ہوئی کہ دوران غدر میرٹھ میں کوئی رات اور کوئی دن ایسا خالی نہیں تھا جب کسی جگہ آگ نہ لگی ہو۔ یہ بات ایک خط مورخہ۔۔۔

سے بھی دستیاب ہے کہ میرٹھ میں ایک رجمنٹ تپی جو کہ ایک بنگلہ کے اسپتال میں بیرک میں رہتی تھی وہ بھی جل کر خاک ہوگئی تھی۔ ۶/تاریخ کو بارک ماسٹر کا گودام جلا دیا گیا تھا۔ میرٹھ میں لڑائی کے لئے خنزیر کی چربی چڑھے کارتوس کا استعمال کو مدعا بنایا گیا۔ اس لئے میرٹھ کی رعایا بہت ہی تنگ دستی کے ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس دوران منگل پانڈے اور اس کے ساتھیوں کب انگریزوں نے حکومت سے غداری کرنے کی سزا دی تھی۔ غدر کا یہ سلسلہ کافی عرصہ تک رہا۔

میرٹھ بہت ہی مشہور شہر ہے اور آزادی ہند میں یہاں کے عوام کا بڑا کردار رہا ہے اور غدر کے دوران بڑے ظلم کے ساتھ میرٹھ کو گذرنا پڑا ہے۔ میرٹھ نے آزادی کے لئے بہت خون بہایا ہے اور بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اور ساتھ ہی اپنی معزز ہستیوں کو شہید بھی کیا ہے اور نونہالوں کے خون سے اس شہر کو سینچا ہے اور پھر اپنے اندر ایک انقلاب کو بھی برپا کیا ہے۔ اسی لیے غدر کا تذکرہ کیا جائے اور میرٹھ کا نام نہ لیا جائے تو یہ میرٹھ کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں بلکہ ظلم کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرٹھ کے راستے ہی انگریزی حکومت دہلی پر قابض ہوئی تھی۔ اگر ہم اتحاد کے ساتھ ہوتے اور ہمارے ساتھ دھوکہ دھڑی کا کھیل نہ کھیلا جاتا تو میرٹھ ہم فتح کر لیتے اور انگریزوں کو دہلی کے تخت وتاج پر بیٹھنے نہ دیتے لیکن اپنوں کی دغابازی کی وجہ سے ہم ذلیل وخوار ہوئے اور ہمیں شکست ملی اور انگریزی حکومت دوبارہ دہلی پر قابض ہوگئی

بارک پور:

بارک پور کا واقع بھی ہندوستانی جنگ آزادی کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کے ایک رسالے نے مورخہ ۲۹/اپریل ۱۸۵۷ء دہلی گزٹ سے معلومات فراہم ہوتی ہے کہ بارک پور میں بھی خاصی پولیس افراد پر تباہ کن حملہ کیا گیا تھا۔ محض یہ کہ ہندوستانیوں کا مقصد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے تھا۔ کچھ احباب اس مقصد ذریعہ ہے۔ مقصود تو اپنی ہستی کو پالیتا ہے اور ساتھ ہی غیروں پر انحصار و اعتماد سے نجات حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے مصری بھائیوں نے بھی اس جنگ کو اپنی جنگ قرار دیا تھا۔

۴/مئی ۱۸۵۷ء کو ماحول بام عروج پر تھا۔ ملک میں چاروں جانب گرماہت کا موسم برپا

تھا۔ کچہری کا وقت تھا سب اپنے حکام اپنے محکموں میں اپنے کاموں میں مشغول تھے اس دوران یہ خبر ملی کہ جج کو چند انگریزی فوج کے افسران میرٹھ پل سے اتر کر آئے اور میرٹھ کی ہندوستانی عوام پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنے لگے۔ ایسے تباہ کن حالات میں ہندوستانیوں کا مقصد انگریزوں کو پست کرنا تھا۔ لیکن اس دوران انگریزوں کو ولولہ زیادہ تھا تو ہندوستانی عوام انگریزی حکمرانوں پر اپنا سکہ نہیں جما سکی۔

میرٹھ کی لڑائی میں ہندوستانیوں کی شکست کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس مقابلے کے لئے مناسب ہتھیار نہیں تھے اور وہ بے سروسامانی کے عالم میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں کود پڑے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے پاس جدید اسلحہ تھا وہ زیادتربیت یافتہ اور منظّم تھے اور ہندوستانی ان کے جوابی حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں نے میرٹھ کے ساتھ دہلی کے دریا گنج جیسے اہم علاقے کو اپنا نشانہ بنالیا۔ لیکن یہاں پر حالات میں ردوبدل کا آغاز ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں کچھ گھڑسوار داخل ہوئے جنھوں نے دریا گنج کے انگریزوں کو مات دے دی۔

ٹیلر کا قتل:

دستاویز میں غدر کے زمانے میں ٹیلر کا قتل بھی خاص اہمیت کا حامل واقعہ ہے۔ یہ شخص عیسائی مذہب کا پیروکار اور حد درجہ کا متعصب شخص تھا۔ اکثر ناواقف عوام کو اغوا کرتا تھا۔ دریا گنج کے واقعہ کے دوران پاس کے قلعے کے اسپتال میں ڈاکٹر چمن لال کا خون بھی اسی کے سر ہے۔ یہ غور کرنے والی بات ہے کہ شخص خاصہ مالدار تھا اور اس کو بھی تانہ کے ہی علاقے میں مارا گیا۔ یہ بات سچ ہے کہ انسان کتنا بھی مالدار ہو دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہتا سب کے سب ایسے ہی رکھا رہ جاتا ہے اور موت اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ یہی حال ٹیلر کا بھی ہوا۔

خاص شہر دہلی:

دہلی کے علاقے میں تو عوام غدر کے دوران خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ یہاں پر لوٹ مار کا زیادہ دور دورہ تھا۔ ایک آدمی کے گھر میں گھس کر چند سپاہیوں نے اس کو گولیوں سے

بھون ڈالا۔ چاروں جانب سے دہلی شہر لٹتا گیا۔ لوگوں نے تلنگوں جیسا عوام کا بھیس بدل کر دہلی کے عوام کو لوٹا اور قتل کیا۔ اس کا تذکرہ دہلی اردو اخبار میں بھی ملتا ہے۔ یہاں پر انگریز چھپ کر عوام کو سزا دے رہے تھے اور نقصان پہنچا رہے تھے۔ انگریزوں کا کام ہندوستانی عوام کو ہر روز ہر لمحہ نقصان پہنچانا تھا۔ اس وقت حالات کچھ علحیدہ تھے۔ معاملات کچھ الٹا سا ہو گیا تھا کہ انگریزوں کا دبدبہ کم پڑ گیا تھا اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو مارنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اگر کوئی شخص فرنگی نما دکھتا تو ہندوستانی عوام ان کا قیمہ بنا دیتے تھے یا پھر ان فرنگیوں میں کوئی اکیلا شخص بازار جاتا تو یہ ہندوتانی لوگ اس نگریز کو مار گراتے۔۔ جیسے غدر کے دوران ایک شخص خربوزہ فروش کی دکان پر منہ لپیٹے خربوزہ خریدنے لگا، دو چار آدمی اور بھی وہاں خریداری کر رہے تھے ایک دوسرے پر پیش قدمی کرتے ہوئے یہ اس آدمی کی بولی میں یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ ''تو چپ رہے گا'' تو وہاں موجود عوام اس کو انگریز سمجھ بیٹھے اور اس کی خوب پٹائی کر دی۔ محض یہ کہ انگریز لوگ شک وشبہ میں بھی مارے جارہے تھے۔

اردو اخبارات کو سب سے زیادہ کہیں نقصان اٹھانا پڑا ہے تو وہ شہر دہلی ہے۔ جہاں اس شہر کو اور یہاں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کو بہت نقصان اٹھانا پڑا دہلی شہر میں ہی سب سے زیادہ فن صحافت کا علم رکھنے والے صحافی کا قتل ہوا اور اس کی وجہ بھی یہ تھی کے دہلی والوں کا ایک بڑا صحافتی طبقہ انگریزی حکومت کے ظلم وستم کی بھینٹ چڑھ گیا۔

دہلی دارالحکومت تھا اور اردو کا مسکن بھی دہلی ہی تھا اور پھر اردو صحافی بھی زیادہ تر دہلی میں مقیم تھے اور ساتھ ہی وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ کر رہے تھے ۔آئے دن ان کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ اس لیے دہلی کے صحافی حضرات کو زائد نقصان اٹھانا پڑا۔ اور کثیر تعداد میں دہلی کے صحافی شہید کر دیے گئے۔

اس طرح ہندوستانی صحافت خاص طور پر اردو اخبارات نے بڑھ چڑھ کر ۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا۔ تاریخ کی گواہی اور چشم دید مناظر دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، سراج الاخبار، پیام آزادی وغیرہ نے اپنا فرض ادا کیا۔ اس عہد کے اخباروں کے توسط اور دستاویزات کی روشنی میں اس مقالے کے عنوان ''انتقامی جذبہ، آزادی کی تڑپ'' کو موضوع بنا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں ۱۸۵۷ء کے دل ہلا دینے والے مناظر، ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپ

بیتی جس پر انگریزوں کے مظالم ہوئے، جن کی جاگیریں، زمینیں کی ضبطی، غدر کے دوران بوڑھے، جوان، بچے اور عورتوں کے قتل عام سے ان پر کیا بیتی ہوگی۔ان تمام چیزوں کے زیر اثر ان ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقامی جذبہ اور آزادی کی تڑپ کس حد تک ہوئی ہوگی۔اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔انہی امور کو موضوع بناتے ہوئے اخبارات اور دستاویزات کی شکل میں ان دنوں کی کیفیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔تاریخ کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی میں ان اخباروں نے بھرپور حصہ لیا اور عوام کے دلوں اور دماغوں میں انقلابی روح پیدا کی جو چنگاری میرٹھ سے اٹھی اور دہلی سمیت پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔اس چنگاری کو بھڑکانے میں اردو صحافت نے بھرپور کام کیا۔گورنر لارڈ کیننگ ان اخبار کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

> ''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے۔یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔[۱۳]

حواشی

۱۔	۱۸۵۷ نکات اور جہات	حسن مثنیٰ	کتابی دنیا دہلی	ص۔۱۴۵
۲۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہراہ دہلی	ص۔۱۴
۳۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	کتابی دنیا دہلی	ص۔۸
۴۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	کتابی دنیا، دہلی	ص۔۱۴
۵۔	ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی عہد میں	محمد عتیق صدیقی	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی	ص۔۳۵۹
۶۔	ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ	مرتب عطاالرحمٰن قاسمی	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی	ص۔۷۵
۷۔	ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ	مرتب عطاالرحمٰن قاسمی	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی	ص۔۱۰۹
۸۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہرہ دہلی	ص۔۳۹۔۳۷
۹۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہرہ، دہلی	ص۔۱۶
۱۰۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہرہ، دہلی	ص۔۱۷
۱۱۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہرہ، دہلی	ص۔۱۹
۱۲۔	اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاوزیں	محمد عتیق صدیقی	مکتبہ شاہرہ، دہلی	ص۔۳۱۔۳۰
۱۳۔	ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	محمد عتیق صدیقی	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی	ص۔۳۵۹

☆☆☆☆☆

ادبی تصانیف

(۱۸۵۷ء کا ادبی، لسانی اور تہذیبی پہلو)

اٹھارہ سو ستاون سے قبل اور بعد کے ادبی، لسانی اور تہذیبی پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے قبل یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اس وقت ملک کے حالات کیسے تھے اور کیوں ایسی صورت حال پیدا ہوئی۔ کہانی بہت طویل ہے اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ ایک یادگار باب ہے۔ اس میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور نفسیاتی زندگیوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر طرف برطانوی حکومت کی یلغار تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مذہبی عقائد کو پاش پاش کر رہی تھی۔ عیسائیت کی تبلیغ نے ہر ہندوستانی کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے رہبر و رہنماؤں کا قتل، اورنگ زیب کے بعد بادشاہوں کی نااہلی کے سبب انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ہر حصے پر یلغار کی۔ جبکہ ان کا مقصد ہندوستانی معاش پر دسترس حاصل کرنا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے حوصلے بلند تھے۔ ملک کے حالات اتنے خراب ہوئے کہ ہر چہار جانب سے مغل سلطنت کا خاتمہ، اور اپنی اجارہ داری کے لئے سکھ، مرہٹہ، جاٹ اور انگریز ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ ان میں برطانوی افواج حاوی تھی۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے سراج الدولہ کو شکست دی تھی۔ اٹھارویں صدی کا اختتام ٹیپو سلطان کی شہادت سے ہوا۔ ٹیپو سلطان ایک جواں مرد مجاہد، حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھا۔ انگریزوں کو ہر چہار جانب سے کھدیڑا اور معرکہ میں شکست سے دوچار کیا۔ لیکن ۱۷۹۹ء کی جنگ میں انگریزں نے چال چلی۔ دیسی حکمرانوں کو لالچ دے کر ان کو اپنے ساتھ ٹیپو سلطان سے لڑنے پر مجبور کیا۔ مرہٹوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا جس سے شیر میسور نے بہادری سے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں کی

اس شکست نے انگریزوں کی ہمت کو جلا بخشی، جس سے ملک کے کونے کونے پر انگریزوں کا قبضہ ہونے لگا۔ ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی اپنی بے بسی کو ظاہر کرتے ہوئے بہار، بنگال اور اڑیسہ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور خود پینشن خوار ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء تک آتے آتے ملک کے اکثر و بیشتر حصے پر انگریز غالب آ چکے تھے۔ ہندوستان کے دیسی سپاہی ان کی غلامی کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن وقت اور حالات کے پیش نظر یہ سپاہی دن بدن کی ظلم و زیادتی، ان کی حقارت آمیز نظروں سے نہ بچ سکے۔ ان کے اندر ملک کی حفاظت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ اس لڑائی کی ابتدا انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں کی نافرمانی سے ہوئی کیونکہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ سوٴر اور گائے کی چربی کے کارتوس کے استعمال پر زور دیا گیا۔ انگریز سپاہیوں کی بالا دستی نے بغاوت پر آمادہ کیا۔ ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں اندر ہی اندر نفرت، عداوت اور غم و غصہ پنپنے لگا۔ مغل کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو لال قلعہ تک محدود کر دیا گیا۔ ان کی حکومت لال قلعہ تک ہی محدود تھی۔ لیکن ہندوستانی عوام اور ان کی رعایا ان کی قدر اور ان کے حکم و فیصلے کے منتظر رہتے تھے۔ دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے پینشن خوار ہونے کے باوجود اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اس درمیان برٹش حکومت نے اعلان کر دیا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد اب کوئی بادشاہ نہیں ہوگا اور لال قلعہ خالی کرنا ہوگا۔ انقلابیوں اور باغیوں میں نفرت کی آگ اس وقت اور بھڑک اٹھی جب چربی والے کارتوسوں کے استعمال کی پابندی نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ پہلے بارک پور میں بغاوت شروع ہوئی لیکن بآسانی کمپنی کے حکام نے اس پر کنٹرول کر لیا لیکن ۱۰/اپریل ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی والے ہندوستانیوں نے چربی والے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بغاوت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ہر طرف فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ انقلابیوں نے الگ اپنے اپنے انداز میں کوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر جنگ آزادی کے سپاہیوں نے جی جان لگا کر دہلی کی جانب کوچ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو دوبارہ شہنشاہ ہندوستان کا اعلان ۱۱/مئی ۱۸۵۷ء کو کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے شہزادوں کو فوجی خدمات سونپی اور جنگ کے معاملات کو خود دیکھنے لگے بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر دیکھیں:

ظفر یہ بارِ عشق اٹھے نہ اٹھے ہم ضعیفوں سے

مگر ایک بار اپنی تاب و طاقت آزماتے ہیں

بہادر شاہ ظفر کے فوجیوں نے انگریزوں کو خوب کھدیڑا لیکن بعد میں انگریزوں کو احساس ہوا کہ ان کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے تو انہوں نے مدراس، بمبئی اور دیگر مقامات سے اپنے انگریز فوج کو دہلی آنے کا حکم دیا اور ستمبر کے اوائل میں سکھوں اور گورکھا سپاہیوں نے بھی انگریزوں کو امداد دینی شروع کر دی۔جس سے ان کی طاقت دوگنی ہوگئی اور بہادر شاہ ظفر کے فوجیوں میں وہ تاب اور ولولہ نہ رہا جو انگریز فوجیوں میں تھا۔ کیونکہ بہادر شاہ کے پاس اسباب کم تھے اور جو تھے وہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے۔ساز و سامان کی کمی تھی۔ ہتھیار زنگ آلود تھے۔ سپاہیوں میں زیادہ تر ناتجربہ کار تھے۔سرکاری خزانہ خالی ہونے کی کگار پر تھا۔اخیر میں بہادر شاہ ظفر کو فوجیوں کی تنخواہ دینے کے لئے اپنا سامان فروخت کرنا پڑا۔دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے حالات بہت خراب ہوگئے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ انگریزوں نے دہلی کی فصیل توڑ کر دہلی کے اندر داخل ہوگئے اور چاروں طرف سے لال قلعہ کو گھیر لیا۔ بہادر شاہ ظفر بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو لے کر ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعہ سے ہمایوں کے مقبرہ میں روپوش ہوگئے لیکن کیپٹن ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے ان کو قید کیا اور ان پر مقدمہ چلا کر انہیں رنگون جلاوطن کر دیا

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے　　دو گز زمیں بھی نہ ملی کوے یار میں

اٹھارہ سوستاون کے حالات وواقعات سے ادیب ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ شاعر بھی متاثر ہوئے۔ جوں جوں انگریز ملک پر اپنا قبضہ واقتدار جماتے گئے ان کے مفاد عوامی مفاد سے ٹکرانے لگے۔غلامی اور مظلومیت کا احساس ہر ہندوستانی کو کھٹکنے لگا۔ان میں اس عہد کے شعرا بھی موجود تھے۔وہ اس درد کو کیوں نہ محسوس کرتے۔اپنی شاعری کے ذریعہ ان تمام جذبات واحساسات کو شاعری میں کیوں نہ ڈھالتے۔ یہ ان کا فطری تقاضا تھا۔دل کی آواز تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے حوالے سے ان شعرائکے دل کی آواز سنیں۔جس سے اس عہد کی تاریخ وتہذیب اور مٹتے نقوش کا پتہ چلتا ہے۔میرؔ کی شاعری اٹھارہویں صدی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں　　تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج وتخت کا

دلّی کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

داغؔ دہلوی نے شہر آشوب کے ذریعے اس عہد کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

زمیں کے حال پہ اب آسماں روتا ہے   ہر اک فراق مکیں میں مکاں روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے   غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے

مصحفی کے نزدیک انگریزوں کا رویہ اس انداز میں ابھرتا ہے۔

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی   ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

مفتی صدرالدین آزردہؔ ''فغان دہلی'' میں دہلی کی تباہی کا حال لکھتے ہیں

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی   والی کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی   کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
عیش وعشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد   لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد   پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دہلی آباد
کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو   قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مومن کے نزدیک ۱۸۵۷ء کے حالات نے انہیں جہاد پر آمادہ کر دیا تھا۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب   یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں   اس فوج کے ساتھ محشور ہوں

ایک اور مقام پر یہ کہتے ہیں:

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں   ہے معرکہ جہاد چل دیجیے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز   وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

غالب کے نزدیک شہر دہلی کا حال اس انداز میں نظر آتا ہے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک   تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

یا پھر غالب کا یہ انداز:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو وہ سن کے بلالیں گے اجارا نہیں کرتے
کوئی ویرانی سے ویرانی ہے دشت کو دیکھ کر گھریاد آیا

میر مہدی مجروح کا یہ انداز بیان:

یہ کہاں جلوہ جاں بخش بتان دہلی کیونکہ جنت پہ کہا جائے گمان دہلی
ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد ڈھونڈے ہیں اپنے مکینوں کا مکان دہلی

منیر شکوہ آبادی جنہوں نے غدر کے واقعات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔شعر دیکھیں:

روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کل ہے

یا پھر سزائے کالا پانی کا یہ بیان:

کوٹھری تاریک پائی مثل قبر تنگ تر تھی حلقہ زنجیر سے
بول وغایط کی جگہ بستر کے پاس تھی نجس ترخانہ خنزیر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک کٹ گئی قید ستم تقدیر سے
یہ کہا تاریخ ہم نے اے منیر صاف نکلے خانہ زنجیر سے

حالؔی نے بھی غدر کے احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔انہوں نے بھی علم وادب کی تباہی کا مرثیہ کہا ہے:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
غالب و شیفتہ،میر و آزردہ و ذوق اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن دہلوی وصہبائی وممنون کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالؔی ہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

محمد حسین آزاد نے بھی ''فتح افواج مشرق'' کے ذریعے داستان غدر کو بیان کیا ہے:

تھے صاحب جاہ و حشم لشکرِ جرار اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کے نکلے
آفاق میں تیغ غضب و حضرت قہار سب جو ہر عقل ان کے رہے طاق پر رکھے

سب ناحق تدبیر و خرد ہوگئے بیکار　　کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت

یاں دیدہ عبرت کو ذرا کھول تو عاقل　　ہے بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار

کیا کہیئے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے　　حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بہ دیوار

حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش　　مٹ جائے نشان خلق میں اس طرح سے یک بار

اس طرح اور بھی بہت سے شعراء ہیں جنہوں نے اٹھارہ سوستاون کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ان میں بسمل عظیم آبادی،اشفاق اللہ خاں، بہادر شاہ ظفر،شیفتہ، میر مہدی مجروح،منیر شکوہ آبادی،تشنہ،سوزاں مبین،ظاہر،فرحت وغیرہ نے غزل،نظم،شہرآشوب وغیرہ کی شکل میں سن ستاون کی جدوجہد اورانگریزوں کے مظام کو برداشت کرتے ہوئے ان احوال کو بیان کیا جوان لوگوں نے دیکھا اور برتا ہے۔سن ستاون کا دور قدیم اور جدید دور کے حد فاصل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے کی تہذیب اور غدر کے بعد کی تہذیب میں نمایاں فرق آنے لگا تھا۔

اس طرح اٹھارہ سوستاون کی ناکام جدوجہد سے پہلے سو ڈیڑھ سو سال کا پورا عرصہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین دورنظر آتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ملک گیر جنگ آزادی منحصر تھی۔اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی چالاکی کے سبب ناکام ہوئی۔اس جنگ کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے پاؤں ہندوستان میں مضبوطی سے جم گئے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت سارا کام زوروں پر ہوا۔۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام جس کے ذریعے ہماری ادبی روایت کی تاریخ موجود ہے جس میں لسانی،ادبی،اور ثقافتی میراث ہے اسی طرح ۱۸۲۵ء میں دلّی کالج کے قیام کے ذریعہ سائنسی ثقافت کوفروغ ملا اور علمی ادب میں خوب نام کمایا۔علمی نثر کے ذریعہ اس کالج نے خوب ترقی کی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کالج کا وجود ضرور ختم ہوگیا تھا لیکن کالج کے علمی کارنامے کا تسلسل برابر جاری رہا۔اس کالج کے قدیم طلبا،اس کی میراث بنے رہے اور ہمیشہ علمی کاموں میں مصروف رہے۔اس کالج کے طلبا میں مولوی ذکا اللہ،محمد حسین آزاد،کرم چند، پیارے لال آشوب،موہن لال کشمیری،ڈپٹی نذیر احمد،میر ناصر علی اور پنڈت من پھول وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

دہلی کالج نے اردونثر ونظم کی فضا کونئی وسعت بخشی،مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں تو اس پر بلا واسطہ اور بالواسطہ اس تحریک (دلّی کالج) کا بہت کچھ اثر ہے۔''[1]

اس کالج نے اساتذہ، طلبا اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جس کا مقصد ادب کو نئے زاویے سے دیکھنا اور نئے معنی و مفاہم کے ذریعے اس کو برتنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی جو ۱۹۴۷ء تک قائم رہی۔

مغربی زبان و ادب کا بالواسطہ اثر اردو زبان و ادب پر بھی پڑا۔ فورٹ ولیم کالج، دلّی کالج کے زیر اثر ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کی بول چال نے اردو زبان پر خوب اثر ڈالا ہے۔ انگریزی الفاظ کا جملوں میں استعمال کرنا ہندوستانیوں کے زبان زد ہے۔ انیسویں صدی انگریزی زبان و ادب کے عروج کا زمانہ ہے اور بیسویں صدی میں مغربی انداز و اسلوب مکمل طور پر نکھر آیا جس کے اثرات اردو ادب پر ہوئے اور نئے نئے اصناف بھی اردو ادب میں وارد ہوئے۔ داستان کا عمل تو بہت پہلے ہی سے ہمارے ادب میں موجود تھا لیکن غدر کے بعد داستان پر لوگوں نے کم توجہ دی کیونکہ اردو ادب میں نئے اصناف نے جنم لیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی کے زیر اثر آنے والے اصناف میں ناول ،افسانہ، ڈرامہ، سفرنامہ، ترجمہ، مضمون، رپورتاژ، خاکہ، سوانح، طنز و مزاح، مکتوب، خودنوشت وغیرہ جیسے ہیں۔ شاعری میں غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ جیسے اصناف انگریزی کی آمد سے قبل رائج تھی لیکن انگریزی ادب کے ذریعے آنیوالی شاعری میں آزاد نظم، نظم معریٰ، نثری نظم، ہائیکو وغیرہ جیسے اصناف آئے۔ ہندوستان میں ان اصناف کو برتنے والوں میں سرسید، بھارتیندو، حالی، آزاد، شبلی، سرشار، نذیر احمد وغیرہ ہیں۔ جن کی کوششوں نے قدیم اردو میں جو بھاری بھرکم الفاظ، بوجھل اور مسجع عبارت سے مزین ہوا کرتی تھی۔ ان ادیبوں نے سہل انداز میں اس کو برتا اور عوام الناس تک اس کو پہنچایا۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''کئی حیثیتوں سے ہندوستان میں انگریزی راج تاریخ کا ایک تاریک عہد تھا مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسی رابطہ سے ہندوستان میں نئے علوم و فنون، سائنس، نئے طرز فکر، نئے ادبی تجربات کو بڑھاوا ملا اور ٹھہری ہوئی اقتصادی زندگی میں حرکت پیدا

ہوئی۔ چونکہ حقائق واضح نہیں تھے اور تبدیلیوں کی نوعیت پچھلی تاریخی تبدیلیوں سے مختلف تھی اس لئے کچھ ہی مفکر اور ادیب ایسے تھے جو روح عصر کو سمجھ سکے اور اپنی سوجھ بوجھ کو ادبی شکل دے سکے۔ ایسے ادیبوں میں بھارتیندو، سرسید، حالی، آزاد، بنکم چند، سرشار، نذیر احمد اور شیر خبردار وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں جو وقت کی نبض کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔'' ۲

اردو ادب کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس حادثہ نے ملک کے نظام کو ہی بدل دیا اور ہندوستانیوں کی زمین تنگ کردی۔ یہ ملک بھائی چارے کا ملک ہے لیکن اب یہی بھائی چارے والے لوگ دو وقت کی رروٹی کے لئے محتاج ہیں۔ معاشی زندگی نے ہر ایک کی کمر توڑ دی۔ انگریزوں نے مسلمانوں پر جو ظلم ڈھایا ہے اس قتل و غارت گری سے دہلی اور نواح دہلی کے سرخ ہونے پر شاعر و ادیب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اسی وجہ سے ہر ادیب و شاعر نے اپنی تحریروں میں اس منظر اور اس عہد کی تاریخ کو قید کر دیا۔ بہت سارے ادیب اس غدر یا انقلابی جنگ کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینا مناسب نہیں بلکہ وہ تعلیم اور اصلاح معاشرہ پر دھیان دیں تاکہ مسلمان تیر و تلوار سے نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور شریعت محمدی پر عمل پیرا ہو کر اس کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ اس باب کے تحت ہم یہاں ان ادبی تصانیف کا تذکرہ کریں گے جو ۱۸۵۷ء کے بعد لکھی گئی ہیں یا پھر اٹھارہ سو ستاون سے قبل اس جنگ کے ابتدائی اثرات سے متاثر ہوئی ہیں۔ اس کے زیر بحث آنے والی تحریروں میں لسانی اور تہذیبی پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان تصانیف کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا تاکہ وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ زبان اور تہذیب کیسے بدلتی ہے اس کا اندازہ ان تحریروں یا کتابوں سے ہو جائے گا جو ۱۸۵۷ء سے قبل والی تحریروں کے انداز و اسلوب، طریقہ اظہار اور انقلابِ آزادی کی جدوجہد کے بعد والی تحریروں میں فرق دکھائی دے گا۔ غدر سے پہلے والی تحریروں میں ثقیل، مشکل پسندی اور عربی و فارسی کے الفاظ و القاب کی کثرت نظر آتی ہے جبکہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد والی تحریروں میں سہل، آسان الفاظ اور مسجع و مرصع والی عبارتوں سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ ہمارے ادبا نے بڑی جانفشانی

سے ان تمام مراحل کو آسانی کے ساتھ عبور کیا۔ ان دابی تصانیف میں لسانی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے آتے آتے اردو نثر، فارسی کی مرہون منت ہے جو ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی۔ رجب علی بیگ سرور فسانہ عجائب لکھ چکے تھے۔ ۱۸۳۲ء میں ''ریاض دلربا'' ناول نما قصہ لکھا جا چکا تھا۔ اس کے لکھنے والے منشی گمانی لعل ہیں۔ غالب فارسی چھوڑ کر اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات کا علم ہمیں اردو زبان وادب کے ہی ذریعے زیادہ تر پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات کے تحت انگریز مورخین نے ہم لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں کی لیکن بڑی خاموشی سے اردو زبان وادب کے چاہنے والوں نے غدر کی داستان کو اردو میں لکھا اور ہمیں ان حالات سے آگاہی دی۔ ان کتابوں میں معین الدین خاں کی ''خدنگ غدر''، ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر'' سید کمال الدین صدر کی ''قیصر التواریخ''، سید وزیر حسین دہلوی کی ''دلّی کا آخری دیدار'' پنڈت کنہیا لال کی ''تاریخ بغاوت ہند'' سرسید کی ''اسباب بغاوت ہند'' مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی''، منشی رام سہائے کی ''حالات غدر'' جیسی کتابوں سے ۱۸۵۷ء کے حالات کا جائزہ ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے چشم دید گواہ اور ان حالات کو برتنے والوں میں سرفہرست ادیب وشاعر غالب ہیں:

غالب:

مذکورہ باب کے تحت سب سے پہلے ۱۸۵۷ء کے ادبی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے تاکہ ۱۸۵۷ء میں ہونے والے حالات اور اس کے زیر اثر ادبا کی تخلیقات کا بخوبی جائزہ لیا جا سکے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ہے وہ بحیثیت ایک شاعر اور نثر نگار بھی۔ انہوں نے لٹتے ہوئے اور جلتے ہوئے دلّی کو دیکھا تھا۔ جن چیزوں کو دیکھا اور محسوس کیا ان تمام چیزوں کو خطوط کے ذریعے اپنے رفقاء واحباب، رشتہ دار وغیرہ کو بتانے کی کوشش کی۔ ان کی پہلی تصنیف ''دستنبو'' ہے۔

دستنبو جو فارسی زبان میں ان کی اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب ایک طرح سے غالب کا روز نامچہ اور سرگزشت ہے۔ اس روز نامچے میں دہلی کی شکست کے حالات وواقعات قلم بند ہیں۔ غالب

خود اس کتاب دستنبو کے بارے میں مرزا یوسف علی خاں کے نام ''عود ہندی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی ۳۱ ویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے اور نثر فارسی زبان قدیم میں ہے جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکۂ معظّمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے ۔ یہ کتاب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔''[۳]

۱۸۵۷ء کا زمانہ غالب کے لئے بہت ہی پر آشوب زمانہ تھا۔ان دنوں ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ سیاسی مسائل پر پوری طرح دسترس رکھتے تھے۔اسی وجہ سے مغل سلطنت کو محض ان دنوں وہ علامتی تصور کرتے تھے کیونکہ انگریز انتظام اور ان کے عسکری نظام ہر ایک پر حاوی تھے۔ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کی چھاؤنی کے سپاہی بغاوت کر کے دہلی پہنچے تو یہاں بہادر شاہ ظفر جو علامتی بادشاہ بنے ہوئے تھے ان کو ان انقلابیوں نے دوبارہ ملک کا بادشاہ تسلیم کیا اور ہر طرف انگریز حکمراں کو قتل کرنا شروع کیا۔ غالب بڑی خاموش مزاجی سے ان نظاروں کو دیکھتے رہے جب قتل و غارت گری کا بازار تھم گیا تو اس وقت انگریز ملک کے حاکم بن چکے تھے۔ پورے ملک پر ان کا تسلط تھا۔ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دلّی پر فتح حاصل کی۔غالب نے انہی حالات و واقعات کو ''دستنبو'' میں روز نامچے اور اپنی سرگزشت کی شکل میں بیان کیا ہے۔ یہ روز نامچہ جس میں غالب نے اپنے آپ کو انگریزوں کا مسیحا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلابیوں کو برا بھلا کہا ہے اور انگریزوں پر حملہ کرنے والوں کی مذمت کی ہے ان کے خلاف نفرت و عداوت کا اظہار کیا ہے۔ غالب اچھی طرح جانتے تھے کہ اب مغل حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔مفادات اور باقی زندگی گذارنے کے لئے ان کی خیر خواہی کا روپ اختیار کرنا ہوگا۔اسی وجہ سے انہوں نے دستنبو تحریر کر کے فاتح حکمراں کے سامنے پیش کی۔ڈاکٹر نتالیہ پرگارینا (Natalia Prigarina) نے اس منظر کو دیکھ کر لکھنے پر مجبور ہوئیں کہ:

''دستنبو (یعنی گلدستے یا عطردانی) کا مقصد یہ تھا کہ فرمان رواؤں کے

ہاتھوں میں پہنچ کر وہ ان کے مشام جاں کو معطر کرے اور بغاوت کے
زمانے میں شاعر کی وفاداری کا ثبوت فراہم کرے تا کہ وہ پینشن کی
بحالی کی امید پھر سے باندھ سکے۔ غالب اس طرح یہ کوشش کرتے
ہیں کہ نوآبادیاتی حکومت کی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آ کر کچلے جانے
سے خود کو بچالیں۔ لیکن ان کے اس گل دستۂ رنگ و بو سے خون اور جلا
کر راکھ کر دینے والی بستیوں کی بو آتی ہے۔"[۴]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی افادیت کے تحت اس روز نامچے میں بڑی تحریف کی ہے۔ اگر مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۷ء کی جنگ جیت گئے ہوتے تو ان کی خدمت میں پیش کی جاتی انگریز فاتح ہوا تو ان کے حکمراں کے آگے اسے اپنی پینشن خواہی کے لئے پیش کیا جبکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب ایک قوم پرست تھے۔ ان کے خمیر میں ہندوستانی دل دھڑک رہا تھا۔ دلّی کی تباہی و بربادی ان کو ستا رہی تھی۔ بار بار انہوں نے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ غالب جس تہذیب و تمدن کے نمائندہ تھے وہ بساط ہی الٹ گئی۔ نہ وہ قلعہ رہا اور نہ وہ دلّی کے اوراق مصور ہی رہے بلکہ ہر جگہ ویرانیت چھا گئی۔ ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط جو ۱۸۵۸ء میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"انگریز کی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔
اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور
کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ
دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل
گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو،
اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے! اتنے یار مرے کے جواب
میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔"[۵]

غالب نے دستنبو کے ذریعے ۱۸۵۷ء کے حالات کو قلمبند ضرور کیا ہے لیکن کئی وجوہات کے تحت جس میں غالب انگریزوں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کا تعلق مغل حکومت کے دربار سے نہ تھا بلکہ ہم انگریز کے بہی خواہ ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں انقلابیوں کو غالب نے بہت برا کہا ہے اور

برے القاب سے یاد کیا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے انقلابیوں کو بد باطن، بدنصیب،شوریدہ سر، دیوانہ وآوارہ، گم نام، بدذات، ناخدا ترس، مدہوش، ظالم، درندہ صفات وغیرہ تک گنوایا ہے۔اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان مجاہدین آزادی کو فسادی، خنزیر، نمک حرام وغیرہ القاب سے بھی پکارا ہے۔وہیں دوسری جانب انگریزوں کے لئے عزت واحترام کے الفاظ میں کوئی کمی نہ کی۔ان کے لئے منصف، قابل احترام، صداحترام، خوش اخلاق و نیک نام صاحبان علم و دانش، دانشور، حاکم عدل و انصاف جیسے القاب سے نوازا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب جہاں اپنے خطوط کے ذریعے ملک و قوم کے غم خوار نظر آتے ہیں وہیں ۱۸۵۷ء کے حالات پر آنسو بھی بہاتے ہیں اور اپنے احباب ورشتہ دار پر ماتم کناں ہیں دستنبو میں مصالحت پسندی سے کام لیتے ہوئے بڑی عجیب کشمکش کے شکار ہیں۔ اس لئے غالب کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خطوط اور دستنبو کے ذریعے جس میں ۱۸۵۸ء کا ذکر ہے۔اس میں دل ودماغ کا کام قابل تحسین ہے۔ان تمام چیزوں کے باوجود دستنبو یا پھر ان کے خطوط اور عود ہندی اس عہد کی تاریخ کو پیش کرتی ہیں اور ۱۸۵۷ء کے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں کچھ سچائی ہے تو کچھ ذہنی اختراع ہے۔یہ معاملہ ان پر اور ان کے خدا پر چھوڑتے ہوئے آگے نکلتے ہیں۔جیسا کہ اکابرین ادب نے ان پر چھوڑا ہے۔

غالب اپنی شاعری کے ذریعے انیسویں صدی کے اہم شاعر قرار پائے۔وہیں انہوں نے اپنی نثری تحریر سے بھی خوب نام کمایا۔عبدالرحمٰن بجنوری ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''مغلوں کے تین عطیات ہیں تاج محل، اردو اور غالب''۔ غالب نے شاعری کے ذریعے کمال حاصل کیا تو دوسری جانب خطوط کے ذریعے ادب میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ان کے اردو خطوط نگاری سے پہلے فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے اور اردو میں بھی لکھے جاتے تھے لیکن غالب نے پہلی بار اردو خطوط کو مکالمہ بنایا۔انداز تحریر بدل دیا، بھاری بھرکم الفاظ، بوجھل اور نہ سمجھ میں آنے والے الفاظ کو متروک کردیا اور آسان زبان میں خطوط لکھنا شروع کردیا جس سے ہر قاری آسانی سے سمجھ سکے۔ان کے خطوط ان کے عہد کی عکاسی ہیں۔اسی لئے عہد غالب کو سمجھنے میں غالب کے خطوط کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے حالات اور اس کے پس منظر کو جاننے اور سمجھنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔غالب کے ہردل عزیز دوستوں میں ہرگوپال تفتہ بھی تھے جن کے نام بہت سارے

خطوط ملتے ہیں۔ان کو ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات پر بھی بہت سارے خطوط لکھے ہیں۔ان ہی خطوط میں ایک خط یہ بھی ہے جو دہلی کے تباہ کن حال پر مبنی ہے جو نیچے درج ہے۔غالب لکھتے ہیں کہ:

''تم جانتے ہو کہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔شعر کہے، دیوان جمع کیے۔اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام تھا اور حقیر تخلص تھا۔ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔اگر چہ صورت اس جنم کے بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی بنی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب چھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و تخلص تفتہ ہو۔آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا واللہ ڈھونڈنے کی مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ہنوز البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔''

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں۔گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نریندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔راجا نے صاحبان علی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی۔یہ لوگ بچ رہیں۔چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں مگر وہ نوکر جو اس ہنگامہ میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں۔میں غریب شاعر دس

برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست یاز دہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیئے۔ مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا شنبہ دسمبر ۱۸۵۷ء اسداللہ۔''[۶]

اس طرح نہ جانے ان گنت واقعات اور ۱۸۵۷ء کے ہولناکیوں کو بڑی تگ و دو اور جانفشانی کے عالم میں بیان کیا ہے۔ ان کے خطوط جیتے جاگتے سماج کا آئینہ ہیں۔ اس عہد کی آئینہ تاریخ ہے۔ غالب کی شخصیت کسی سے مخفی نہیں۔ انہوں نے نثر کے ذریعے اپنی پہچان بنائی ہے۔ اگر ان کی شاعری نہ بھی ہوتی تو ان کا مقام آج بھی اتنا ہی ہوتا جتنا آج ہے۔ ان کی شاعری نے ان کو اور بلند مقام عطا کیا ہے۔ دونوں کی اشتراکیت نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کی شاعری میں بھی زمانے کا عکس نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا محور فکری اساس پر رکھا ہے۔ اسی فکری

اساس نے ان کی شاعری کو اغلب کیا اور غالب کو غالب بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ان کی شاعری میں بھی نثری حقائق کی طرح اپنے عہد کی تاریخ اور زمانے کے احوال وآثار کی بڑی چابکدستی کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے کیونکہ غالب نے بذات خود غدر کے واقعات کو دیکھا اور بھگتا ہے۔ان کے کلام اور خطوط اس کی زندہ مثال ہے۔چند اشعار پر غور کیا جائے۔

بسکہ فعال مایرید ہے آج　　ہر سطح شور انگلستان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک　　آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

یا پھر غالب کا یہ انداز:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے　　اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
روز اس شہر میں ایک نیا حکم ہوتا ہے　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے

اس طرح نہ جانے بہت سارے اشعار ہیں جو ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حالات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس عہد کی تاریخ کو قاری کے ذہنوں میں ولولہ اور جوش پیدا کرتا ہے۔غالب سے جو ہونا تھا وہ ہوا اور اس نے اپنی دنیا آپ بنائی اور ۱۸۶۹ء میں اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئے اور اپنے پیچھے ہزاروں داستانیں چھوڑ گئے۔ان کی ہر داستان ان کے عہد کی تہذیب ،سماجی کیفیت سے دوچار تھی۔ غالب کے خطوط ان کی شخصیت کا مکمل ترجمان،ان کی زندگی ،انسانیت، دوستی وضعداری اور احباب سے والہانہ اور بےلوث محبت کا منظر نامہ ہے۔غالب کی زندگی کا ہر پہلو ان کے خطوط سے جھلکتا ہے۔ان کے خطوط کا من جملہ حق یہ ہے کہ سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کو پیش کرنے میں حق بجانب حق ادا کیا ہے۔اور قدیم روایات سے انحراف ،نئی روایات کی پاسداری کے امین ہیں۔خلیق الرحمٰن اعظمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”غالب کے خطوط ہمارے ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔یہ خطوط اردو

نثر کی تشکیل جدید کی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے بھی قابل مطالعہ ہیں۔مگر ان کی لازوال دلکشی کا راز کچھ اور ہے۔دراصل ان خطوط میں ہمیں وہ فضا ملتی ہے جس میں غالب کا عہد اور ان کا معاشرہ سانس لے رہا ہے۔یہاں وہ آباد خرابے ہیں جس میں غالب نے زندگی کرنے کا ہنر سیکھا۔‘‘ ۷

سرسید احمد خاں:

۱۸۵۷ء کے غدر نے ہر ہندوستانی کے دل کو مروڑ دیا تھا۔مغل تہذیب وتمدن کا خاتمہ بلکہ ہندوستانی تہذیب وثقافت اور سماجی طرز زندگی میں بڑی تبدیلی ہوئی۔اکابرین ملت اور ملک وقوم کے رہبران وغیرہ نے ملک کی سالمیت اور اس کے تحفظ وبقا کے لئے بہت محنت کی اور ملک کو ۱۸۵۷ء کے بعد نئے دھارے پر لانے کی حتی المقدور کوشش کی۔انیسوں صدی کے نصف آخر والا زمانہ بڑی تبدیلی کا ہے۔یہی وہ تین چار دہائی ہیں جس میں اردو نثر نگاری اور شاعری نے اپنی نئی ادبی داستان پیش کی ہے۔اس میں زبان وبیان اور موضوعات کے پھیلاؤ نے اردو زبان وادب کے دامن کو وسیع کیا۔ادبی اور فکری سطح پر اس کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے۔

سرسید اور ان کے نامور رفقاء جن میں مولانا الطاف حسین حالی،مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی،ڈپٹی نذیر احمد،مولوی ذکا اللہ وغیرہ نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے حالات کو بغور دیکھا اور ان لوگوں نے مسلم حاکم جن کے آباواجداد کوئی سو سال تک بڑی آن بان اور شان کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی لیکن وہ دن ختم ہو گئے اور عروج کے بعد زوال کا آنا لازمی ہے۔اسی زوال نے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے زبردست شکست ہونا پڑا اور مسلمانوں کی ایک عظیم تاریخ کا باب سیاہ صفحات کے حوالہ ہو گیا۔اس کی ہولناکی اور قتل عام سے دہلی اور نواح دہلی بلکہ پورے ہندوستان ۱۸۵۷ء کی غدر کے ذریعے خون میں لت پت ہو چکا تھا۔انگریز ملک پر مسلط ہو چکے تھے۔مسلمانوں کے ہاتھوں میں کچھ نہ تھا سوائے کف افسوس کے۔انہی احوال وآثار کے مدنظر سرسید جو قوم وملت کے خیر خواہ تھے،سر پر کفن باندھا اور مسلمانوں کی اصلاح ، ذہنی،نفسیاتی اور فکری بیداری کے لئے فضا تیار کرنے لگے۔کیونکہ شکست کے بعد اب ان لوگوں کے پاس کوئی

دوسرا راستہ نہ تھا۔ جنگ کی صلاحیت کھو چکے تھے۔معاشی تگ و دو میں ہر آدمی پریشان حال تھا۔انگریزوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد مسلمان ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے۔ان پر بغاوت کے بعد بھی ظلم وستم کا سلسلہ جاری رہا۔ملک میں ان کی حکمرانی تھی۔غلامی کی زندگی پر مجبور تھے۔

دوسری جانب میکالے کا بڑی خاموشی کے ساتھ ہندوستانی عوام اور رعایا کو گمراہ کرنے ساتھ ہی ساتھ ذہنی اور دماغی طور پر ان کے حق کی بات کرنے پر زور دینا ان کا خواب تھا۔انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے ،الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سیا نگریزی ہوا''موجودہ عہد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو میکالے کا یہ خواب پورا ہو گیا لیکن حکومت چلی گئی اور اپنی ذہنی نشو نما چھوڑ گئی۔۱۸۵۷ء کے ان حالات اور اطوار نے سر سید اور راجہ رام موہن رائے وغیرہ نے حالات کو بھانپ لیا اور ملک کے کونے کونے میں ان لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اصلاح قوم کا سلسلہ شروع کیا۔

سر سید احمد خاں کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ان کی ولادت ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ ناز ونعم میں پرورش پائی۔عربی فارسی اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔انگریز حکمراں کے خیر خواہ تھے۔ملک کے مختلف حصوں میں ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد میں برٹش کمپنی کے زیر اہتمام الگ الگ عہدوں پر فائز رہے۔سر سید ابتدائی زمانے سے ہی علمی کاموں میں مصروف رہے۔ ملازمت کے کاموں سے فارغ ہو کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ان کی پہلی فارسی تصنیف ۱۸۳۹ء میں ''جام جم'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔جس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے مختصر حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔۱۸۴۷ء میں ''آثار الصنادید''،جس میں دہلی کے تاریخی عمارتوں اور کتبے وغیرہ کے حالات کے ساتھ ساتھ دہلی کے علماء وشعراء ،ادبا اور ارباب کمال شخصیات پر بھی اس کتاب میں لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر سے متعلق ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کی جس میں مسلمانوں کی کمیوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی کمیوں کو بھی گنوایا اور بتایا ہے۔اس کے علاوہ ''تاریخ سرکشی بجنور'' بھی اسی موضوع

پر ہے۔جس میں انگریزوں کو یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ اس کتاب میں بغاوت کے اسباب کیا کیا ہیں اور جن وجوہات کی بنا پر یہ جنگ ہوئی۔اس میں مسلمانوں اور انگریزوں کے نقصانات کیا ہوئے ان تمام چیزوں پر بڑے طویل انداز میں لکھا ہے۔اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کا قیام۔اس سوسائٹی کے ذریعے ان علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ کرنا،مقصد جو مغربی زبانوں میں تھیں اور ہندوستانیوں کی دسترس سے باہر تھیں۔اس لئے اس سوسائٹی کا ۱۸۶۴ء میں قیام عمل میں لایا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں اخبار سائنٹفک سوسائٹی کا اجرا عمل میں آیا۔بعد میں یہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔یہ اخبار سیاسی نوعیت کا تھا۔۱۸۶۹ء میں سرسید اپنے بیٹے کو لے کر انگلستان گئے۔ وہاں ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' جس میں ولیم میور نے نعوذ باللہ کے رسول صلی علیہ وسلم کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا اس کا جواب دینا سرسید کے انگلستان جانے کا سبب بنا۔سرسید ہندوستانی تعلیم سے مطمئین نہ تھے۔اسی غرض سے انگلستان کا رخ کیا۔وہاں لائف آف محمد کا جواب مدلل انداز میں ''خطبات احمدیہ'' کی شکل میں دی۔انگلستان کے تعلیمی طریق کار اور وہاں کی یونیورسٹی خاص طور پر کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں کی تعمیر،تعلیمی ترقی اور اس کے چلانے کا انداز کا جائزہ لیا۔۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آ کر ۲۲ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔اس رسالہ نے ہندوستان میں نئی نثر کی بنیاد ڈالی۔اصلاح معاشرہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔اس کے بعد سرسید نے مدرسہ العلوم کی بنیاد ڈالی جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

آثار الصنادید سرسید کی ادبی خدمات میں کئی چیزیں اہم ہیں۔جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ان کی ایک یادگار کتاب ''آثار الصنادید'' کافی اہم ہے۔اس کتاب کا نام خاقانی کے ایک شعر:

از نقش و نگار درو دیوار شکستہ　　　　آثار پدید است صنادید عجم را

سے ماخوذ ہے۔یہ کتاب دہلی کے آثار قدیمہ اور دہلی کی مختصر تاریخ بیان کرتی ہے۔اس کتاب میں دہلی کی گلی کوچوں،مکانوں اور کتبوں کے علاوہ دہلی کی اہم شخصیات،شعراء حکماء ادباء وغیرہ پر قلم زد ہے۔سرسید نے وقت اور حالات کے تحت اس کام کو ضروری سمجھا کیونکہ مغل حکومت کے زوال کے آثار نظر آرہے تھے۔اسی وجہ سے سرسید نے ان کے نقوش کو بھی تاریخ کے صفحات میں قید کرنا پسند کیا

تا کہ تاریخ کے اوراق میں ان مقامات، مساجد، منادر، مقبرے اور اہم شخصیات پر اہم دستاویز تیار ہو جائے۔ یہ وہ دستاویز ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظمت رفتاں ہیں۔ اس عہد میں تاریخ نگاری پر قلم اٹھانا علم چلن تھا۔ انگریز قوم کی نگاہ میں تاریخ سازی بہت بڑا اقدم تھا اسی وجہ سے سرسید نے بھی اپنے ملک کے دارالسطنت دہلی کے ان تاریخی آثار و شخصیات کو موضوع بنایا۔ اسوقت سرسید انیس سال کے تھے۔ حاؔلی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں جب وہ دلّی میں منصف تھے ان کو عمارات، شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے ''میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لئے مجھ کو دے دیتی تھیں۔ باقی تمام اخراجات ان کے ذمے تھے۔ جو کپڑا وہ پہنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے ملتفی ہوتی تھی۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپے ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہوگئی تھیں۔ کرائے کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی تنخواہ کے روپے ماہوار تھے اور سارے کنبہ کا خرچ تھا۔ سرسید ابتداء ہی سے نہایت فراغ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر مقروض رہتے تھے لہذا ان کو یہ خیال ہوا کہ تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ ''سید الاخبار'' جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ سے عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں شائع کرنیکا ارادہ کیا۔''[2]

سرسید نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے چار ابواب شامل کئے ہیں۔ ہر باب اپنے آپ میں مکمل ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظمت رفتاں، تاریخی مقامات، ستر حویلیوں، بازاروں، باولیوں وغیرہ کا ذکر اس کتاب میں ہے۔ اس کے علاوہ چوتھے باب میں ایک سو بیس مشائخ علما، خطاط، مصور وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ کتاب اپنے وقت کے لحاظ سے یکجہتی کی علامت تھی۔

اسباب بغاوت ہندسر سید کی کتابوں میں ایک اہم کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' بھی ہے۔سر سید کا شماران شخصیات میں ہوتا ہے جوتاریخی اورمحرکات کے اصول پابند ہوتے ہیں۔کامیابی کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے اپنی عظمت کو پالیتے ہیں۔اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید ہر میدان عمل کے مجاہدنظر آتے ہیں۔چاہے وہ سیاست ہو، مذہب، تعلیم یاادب، قانون ہو یافلسفہ الغرض تمام شعبہ جات میں وہ اپنا پرچم بلند کرتے ہیں۔

اسی مناسبت سے انہوں نے ۱۸۵۷ء میں ہونے والے حالات و واقعات کوموضوع بناتے ہوئے ''اسباب بغاوت ہند'' ۱۸۵۹ء میں تحریر کی۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے حوالہ سے آج بھی ماخذات میں شمار کی جاتی ہے اور صاحب نظر اس کتاب کونظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ سرسید نے اس کتاب کو کیوں لکھااورکس کے لئے لکھا،مولانا الطاف حسین حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کرآئے تھے۔جب مرادآباد میں پہنچے تو ان کی تباہی و بربادی کا اوربھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظروں سے گزرا۔جس سے ایک اور چوٹ ان کے دل پر لگی۔گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی خیرخواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کر بدلے لے رہے تھےاوراگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لئے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لئے کافی تھا۔''۸

وہیں دوسری جگہ حالی اس کتاب کے مقاصد اور لکھنے کے اسباب کو واضح کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ:

''مرادآباد میں سرسید نے خاص کر مسلمانوں کی بھلائی کے لئے ایک اورمفید کام کی بنیاد ڈالی۔رسالہ اسباب بغاوت ہند...انہوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے لکھا تھا چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود

> ہندوستان کے باشندے کیا ہندو کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور جو نتائج اس پر مرتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے اس لئے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹیکل ، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں۔ان کی بے چینی اور زیادہ ہوتی تھی۔مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائی عملداری نہیں رہنے کی۔اور سب سے بڑا اور عام الزام جو ان پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اس لئے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔''[9]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے ''اسباب بغاوت ہند'' کے ذریعے کئی معاملات کو بیان کیا ہے جن میں (۱) ۱۸۵۷ء کے ہنگامے غدر کے اسباب وعلل کو تلاش کیا۔(۲) مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں ان کو دور کرنا لازمی جز تھا (۳) سب سے اہم تمام ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو بے گناہ ثابت کرنا وغیرہ جیسے اسباب کو موضوع بناتے ہوئے اسباب بغاوت ہند تحریر کی تھی۔سرسید نے اس کتاب کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ذمہ داری انگریز حکومت اور ان کی غلط پالیسیوں پر ڈال دی اور اپنی وفاداری کا اعلان بھی کرتے رہے۔وہ خود اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مگر ان فسادات کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ سمجھتا ہوں۔''[10]

اس طرح سرسید نے اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے بغاوت کے اسباب کو ابتدائی شکل سے

لے کر جس میں ولی اللہ تحریک اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے ذریعے ملک کے اندر ہونے والے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر جو برائے نام بادشاہ اور لال قلعہ تک ان کی حکومت محدود ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کا زوروں پر آپس میں سازش اور مشورہ کرنا کہ انگریزوں کے خلاف کیسے جہاد کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کے ذریعہ کارتوس میں سؤر اور گائے کی چربی کے استعمال سے جو اشتعال پیدا ہوا۔ اس نے بغاوت کو ہوا دی اور نفرت کی چنگاری نے آگ کی شکل اختیار کر لی۔ انگریز عیسائی مبلغین کی جانب سے تبدیلی مذہب اور اسکول و کالج کے ذریعے مذہب کی تعلیم پر زور، جو لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا اور معاشی کمزوری نے انسانوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی۔ حالانکہ سرسید سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کو پسند کرتے تھے اور مسلمانوں اور ہر ہندوستانی کے لئے مغربی علوم کو حاصل کرنا از حد ضروری سمجھتے تھے لیکن انگریزوں نے اس معاملے کو غلط انداز میں اپنی مذہبی تعلیم اور بچوں میں عیسائیت کی تبلیغ نے معاملے کو طول دینا شروع کیا جس سے سرسید بہت بدظن ہوئے اور اس رسالے کے ذریعے انگریزوں کے اس طریقہ تعلیم اور مشنری اسکولوں کی تعلیم پر اعتراض جتایا اور حکومت کو باور کرانے میں کوئی کمی نہ کی۔ سرسید لکھتے ہیں کہ

> ''مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہمیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تھا تمہارا خدا کون، نجات دینے والا کون اور عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔''[۱۱]

اس طرح اور بھی بہت سارے مسائل ہیں جس کو سرسید نے بڑے انہماک سے اس رسالے کے ذریعے انگریز حکمراں تک پہنچایا اور مسلمانوں کی نمائندگی کی ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید مسلمانوں کی خیر خواہی چاہنے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ساتھ دوستی اور حکومت کی خیر خواہ تھے۔ اس کے ذریعے سرسید نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان وکیل کی

حیثیت سے کام کیا ہے۔

تاریخ سرکشی ضلع بجنور سرسید کی دوسری تصنیف جو ۱۸۵۷ء کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے۔اس تصنیف کی ابتداء مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات درج ہیں۔اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے دوران جو حالات پیش آئے خاص طور پر ان دنوں جب سرسید ضلع بجنور میں صدر امین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔اس کتاب میں ایک مخصوص علاقے کے تعلق سے لکھا گیا۔جس کے سبب لوگوں نے کم توجہ دی جیسا کہ اسباب بغاوت ہند کو لوگوں نے سر آنکھوں پر رکھا کیونکہ ان دونوں کتابوں کے تعلق سے اگر کوئی بات عام ہے تو وہ یہ ہے کہ اسباب بغاوت ہند جدو جہد اور ۱۸۵۷ کے حوالہ سے تمام احوال و آثار کو بیان کیا ہے جبکہ دوسری کتاب سرکشی ضلع بجنور ان کی ایک علاقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قابل توجہ کم ہوئی۔اس کتاب کے فہرست مضامین اس طرح ہیں کہ دیباچہ، فہرست حکام متعہد اور معزز اہلکاران ہنودستان کے تحت ذیلی عنوان میں ''حکام متعہد'' انگریزی نویستان غیر متعہد، شفاخانہ، تحصیل داران، پیش کاران، عملہ خزانہ، عملہ سلکٹری، عملہ فوجداری، تھانہ داران، جیل خانہ، سررشتہ تعلیم ہے۔اس کے بعد سلاست انہاد حکام وغیرہ کا، حالات و واقعات، گوجروں کے فساد کا بیان، انتظام ضلع کی تدبیریں، ۲۹ پلٹن کی کمپنی سہارن پور سے بجنور آنا، مراد آباد کے جیل خانہ کا ٹوٹنا اور اس کے سبب سے ضلع میں زیادہ تر بدنظمی کا ہونا، بجنور کے جیل خانہ کا ٹوٹنا، برم پور کا لٹنا وغیرہ جس میں تقریباً ۲۳۲ عنوانات کے تحت یہ کتاب ابتدا سے انتہا تک محیط ہے۔شرافت حسین مرزا اس کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب (تاریخ سرکشی ضلع بجنور) میں ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ سے آخر اپریل ۱۸۵۸ء تک تقریباً ایک سال کے واقعات و حالات جو ضلع بجنور میں رونما ہوئے بیان کئے گئے ہیں۔اسی سلسلے میں نواب محمود خاں انگریز عہدے داروں، ہندوستانی افسروں اور ضلع کے دوسرے اثر و اقتدار رکھنے والے حضرات کی خط و کتابت بھی درج کی گئی ہے۔یہ خط و کتابت حالات کے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔[۱۲]

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تلنگوں کی کمپنی اور نواب کے سپاہیوں کی تعداد

زیادہ نہ تھی۔فوجیوں میں زیادہ تر تربیت یافتہ بھی نہیں تھے بلکہ جہاد کے جذبے نے انہیں کھینچ لایا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے پاس ہتھیار بھی زنگ آلود تھے اور انگریزوں کے پاس نئے قسم کے اسلحہ اور آلات تھے۔نئی قسم کی توپیں تھیں۔انگریزوں کے پاس نئی تدابیر تھیں جس سے ان لوگوں نے انقلابیوں کوشکست دینے کی ٹھان رکھی تھی لیکن انقلابیوں کے سامنے یہ انگریز نہ ٹک سکے بلآخر ان انگریزوں کواپنی جان بچا کرنواب محمود خان بہادر کے سپرد ضلع بجنور کوحوالہ کر کے نکلنا پڑا۔سرسید نے اپنی جان پرکھیل کران لوگوں کی جان بچائی ورنہ ان انگریز کلکٹروں کی لاش بھی نہ ملتی۔شرافت حسین مرزا لکھتے ہیں کہ:

> ''مجبوراً انگریز کلکٹر کوضلع نواب محمود خاں بہادر کے سپرد کرنا پڑا اور خود جان بچا کر بجنور چلے گئے۔سرسید نے اس موقع پر انگریزوں سے وفاداری کا پورا ثبوت دیا اور اپنی جان پرکھیل کر انگریز حکام کی جان بچائی۔ یہ ان کی اخلاقی بلندی اور انسان دوستی کی بہترین مثال ہے جس کا اعتراف انگریز حکام نے بھی کیا ہے۔اسی طرح جب اس ضلع کے انگریز مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے تو ایسے نازک وقت میں نواب موصوف کی عظمت خسروانہ دوستی کے احساس اور عفو و درگزر کا بھی ثبوت ذیل کی شہادت سے ملتا ہے جس کا ذکر نہ معلوم کیوں سرسید نے نہیں کیا۔''[۱۳]

تاریخ سرکشی ضلع بجنور میں کئی اہم واقعات تھے۔جس سے وہاں کی عوام محمود خاں اور چودھری صاحبان میں خزانہ کے معاملے کو لے کر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔سرسید نے یقین دلایا کے خزانہ کہیں نہیں جائے گا۔کتاب میں اس کے علاوہ دولت واقتدار کی کشمکش، ذاتی عداوت، اپنی غریبی کے باعث غریب عوام آزادی کے جذبے سے سرشار تھے جبکہ اس لڑائی کو ہندو مسلم فساد کا نام دیا گیا۔اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ سرسید نے حالات کے بیان میں سچائی سے کام لیا ہے۔اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اس کتاب میں انگریز دوستی اور حکومت کی خیر خواہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔انقلابیوں کا مذاق بھدے ناموں سے کیا گیا ہے۔انگریز حکام اوران کے ساتھیوں کی خوب تعریف کی گئی ہے۔

سرسید ایک مصلح قوم تھے۔انہوں نے سماج کے بے جا رسم و رواج، عقائد وتوہمات کے

خلاف تحریک چلائی۔ سرسید اپنے آس پاس کے گھرانوں سے بدعقیدگی، جادوٹونا اور اوہام پرستی وغیرہ کو ان کے ذہنوں سے مٹانا چاہتے تھے اور انہیں نئی سمت میں لانا چاہتے تھے۔ سرسید نے بیدار مغز اور فکر انسانی میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اردو ادب کو بھی بہت متاثر کیا۔ ان کی تمام تصنیفات کے حوالہ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو نثر کے فروغ میں یہ کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی وغیرہ نے اردو نثر کو لفظیات سے خوب مالا مال کیا۔ مضمون نگاری کی ابتداء کی، تاریخ نگاری، اور قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ اردو زبان وادب کو عام فہم زبان کے طور پر رائج کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سرسید کے بعد اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ادب اور اس ادب میں اختیار کردہ ادیبوں کے فکری رجحان اور ان کے ادبی ردعمل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس عہد کے تاریخ اٹھارہ سو ستاون سے قبل اور بعد کے ادبی رجحان پر غور وفکر کرنا ہوگا۔ تب ہی ادبی تصانیف کے زیر اثر بہت ساری تصانیف اور نئی اصناف جو ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آئی ہیں جس میں سرسید اور ان کے رفقاء نے مل کر اردو ادب کو نئے نہج پر ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیبوں کی تخلیقات کی بدولت ادب زندگی اور معاشرت کا ترجمان بن گیا۔ سرسید اپنے مضمون میں بےلاگ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

> ''علم ادب وانقنا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب القلفظ کلموں کے تک ملانے اور رازکار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔.....فن شاعری جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد، حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل می یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں، جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ

خیال ہی نہیں کہ فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی
حالت کا کس پیرائے یا کنایہ واشارہ یا تشبیہ واستعارہ میں بیان کرنا کیا
کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔''
ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی
شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ
قصیدوں اور ہجر کے قطعوں وکہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔....
ردیف وقافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ اجزا اور بے قافیہ
شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے
نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔''۱۴

سرسید اور ان کے رفقاء نے اپنے عہد میں جو نقائص تھے ان کو بڑی فنی اور چابک دستی کے ساتھ دور کیا۔ اپنی تحریروں میں ان خصوصیات کو بروئے کار لاکر عملی جامہ پہنایا جس چیز کا وہ ادیب و شاعر سے مطالبہ کر رہے تھے۔ ادب کو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا تاکہ مقصدی ادب اور تمام اصناف میں بہتر ادب قرار پائے۔ ادب اور ادیب کی سماجی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بذات خود جو کچھ سماج میں ہو رہا ہو اس چیز کو سماجی فلاحی نقطۂ نظر سے اس کو بیان کرے۔ سرسید نے اپنے مضامین اور تصانیف کے ذریعے عمل کر کے دکھایا۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا
جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ
لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے
دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''۱۵

اس طرح سرسید نے عصری اور اجتماعی زندگی کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور دیگر ادبا نے ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ اب سرسید کے رفقاء جنہوں نے اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء)

پانی پت کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ زندگی اتھل پتھل رہی۔ بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ علم حاصل کیا ؤ کتب بینی نے ان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ سرسید کے خیالات، آزاد کی رفاقت نے ان کے وسعت علمی میں بے انتہا اضافہ کیا۔ تہذیب الاخلاق میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ علمی کاوش کی بنا پر ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ حالؔی نثر و نظم کے استاد ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں تنقید، سوانح نگاری، نظم نگاری اور ناول کے پیرائے میں مجالس انسا تحریر کی۔ تنقید میں ان کی اہم کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے جو ابتدا سے اب تک ان کی یہ کتاب ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی ناقد اس کتاب کے بغیر نقد نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سوانح نگاری کی روایت یا بناڈالی ہے جس کے ذریعہ انہوں نے حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی اہم اور شاہکار کتابیں لکھی ہیں۔ شیخ چاند حالی کی ''حیات سعدی'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''حیات سعدی لکھ کر حالی نے اردو زبان میں فن سوانح نگاری کا سنگ بنیاد رکھا۔''[16]

حیات سعدی خواجہ الطاف حسین حالی نے پہلی بار باقاعدہ اردو سوانح نگاری میں قدم رکھتے ہوئے ''حیاتِ سعدی'' لکھی۔ ان کی اس تصنیف نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ شیخ سعدی فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ان کی اہم کتب گلستان اور بوستان تقریباً ہر مدارس اور مکتب فکر میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان دونوں کتابوں کی شہرت دوام اب تک قائم ہے۔ پورے برصغیر میں سعدی کی اخلاقی حکایتیں بڑے زور و شور سے پڑھی جاتی ہیں۔ حالؔی کی ذہنی مناسبت سعدی کے مزاج اور اخلاق و عادات سے کافی ملتی جلتی تھی جس کے باعث حالی ان کی سوانح عمری لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اور اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سعدی کے حالات زندگی اور دوسرے میں ان کے کلام پر تبصرہ ملتا ہے۔ حالی نے بڑے مفصل انداز میں سعدی کے کلام کی اچھائیوں اور ان کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ یہ مثال دیکھیں:

> ''شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی، جفاکش آدمی تھا۔ اس کے قویٰ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو

بیس برس کے قریب عمر پائی۔.....اس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔اس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈلا یار باش، ہنسوڑ، ظریف، ریا اور نمائش سے دور سیدھا سادا مسلمان تھا۔اس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تیئں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور پرتکلف، مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔''[17]

اس طرح الطاف حسین حالی نے حیات سعدی لکھ کر اس کی سوانح عمری جو پڑھے لکھے طبقے سے اوجھل تھی ان کے سامنے بڑی جانفشانی سے ان کی کتابوں اور تذکروں سے کنگھال کر ان کی سوانح تیار کی ورنہ ہر آدمی ''گلستان'' اور ''بوستان'' پڑھ کر عش عش کرتا اور ان کی حیات سے نابلد رہتا۔اس کمی کو حالی نے بڑی شدت کے ساتھ پوری کی اور اردو ادب میں بیش بہا قیمتی سرمایہ چھوڑا۔

یادگار غالب ان کی دوسری تصنیف ''یادگار غالب'' ۱۸۹۷ء کی ہے۔اس تصنیف نے غالب اور حالی کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ غالب پر لکھی گئی پہلی تصنیف ہے۔حالی نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ غالب کی شخصیت اور ان کے کلام کو موضوع بحث بنایا ہے۔ کیونکہ غالب پر اب تک کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔حالی کے احباب نے حالی سے التجا کی کہ ان پر کوئی کتاب لائی جائے۔حالؔی نے غالب کے حالات زندگی، ان کے اخلاق واطوار اور ان کی تصنیفات پر خوب جم کر کام کیا۔اس کتاب کی مقبولیت اس قدر ہوئی کہ آج بھی اس کتاب کی اہمیت اور افادیت برقرار ہے۔حالی خود یادگار غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت و بذلہ

سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندکشی کے لباس میں اور کبھی
تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان
چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کتاب کے موضوع سے خارج
سمجھنا چاہئے۔ ۱۸

۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات نے اہم شخصیات کی عظمت دلوں سے مٹادی تھی۔ ان کے کارناموں اور ان کی قربانیوں کو یاد کرنا وقت کا تقاضہ تھا۔ اس لئے حالی نے سب سے پہلے حیات سعدی لکھی اس کے بعد یادگار غالب لکھی۔ اس کتاب کے ذریعہ حالی نے غالب کو وہ مقام عطا کیا جو غالب اپنے عہد میں حاصل نہ کر پائے تھے۔ غالب نے جس انداز سے اپنی دشوار گزار راستوں سے اپنی زندگی گذاری ہے وہ لوگوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت سے تھی۔ جو لوگوں کے دلوں میں بیداری پیدا کرے۔ ان کے اندر اسلاف کی تاریخ کو پڑھنے کے بعد نیکی اور بدی کے اختیار کرنے میں تمیز پیدا کرسکے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ سوانح عمری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

بیاگرافی مولانا (الطاف حسین حالی) کے نزدیک بزرگوں کی ایک
لازوال یادگار ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے ترقی کے بعد تنزلی کا منھ
دیکھا ان کے لئے یہ ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار
کرتا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں نے مثلاً لوتھر اور بنجمن فرینکلن
نے بیاگرافی سے ہی بلندی اور بزرگی کا سبق حاصل کیا۔ علم اخلاق اور
بیاگرافی میں فرق ہے کہ علم اخلاق سے اچھائی برائی کی ماہئیت معلوم
ہوتی ہے لیکن بیاگرافی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی
زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مولانا (الطاف حسین
حالی) کا یہ خیال ایک جدید انگریز مصنف کے خیال سے کتنا ملتا جلتا تھا
کہ ''بیاگرافی'' ہم کو زندہ رہنے کا آرٹ سکھاتی ہے۔ دنیا میں کامیاب
زندگیوں کے مطالعہ سے اکثر یہ مقصد ہوتا ہے کہ زندگی ان ناگوار اور
تلخ کشمکشوں میں وہ کیا حکمت عملی تھی جس پر ان لوگوں نے عمل کیا اور
بامراد رہے۔'' ۱۹

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں غالب کی سوانح حیات، اخلاق و عادات،

تصانیف، استاد و شاگرد، دوست و احباب، قلعہ سے تعلق، بیماری و وفات کا ذکر ہے۔اور دوسرے حصے میں مرزا کے کلام پر تبصرہ ہے اور آخر میں انتخاب کلام بھی شامل ہے۔دوسرے حصہ میں مرزا کے کلام کو چار حصوں میں حالی نے تقسیم کیا ہے۔ان چار میں نظم اردو، نثر اردو، نظم فارسی اور نثر فارسی۔اس ترتیب سے کتاب کی تکمیل ہوتی ہے۔حالی نے غالب کے تمام حالات و واقعات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔کیونکہ حالی کے تعلقات غالب سے بہت اچھے تھے۔ان کی شاگردی میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ان کی شخصیت اور ذہانت دونوں سے حالی واقف تھے، اسی وجہ سے حالی نے جچی تلی رائے دینے کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کے اسلوب و بیان اور طرز ادا پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یادگار غالب اپنی بعض خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ایک مستند کتاب ہے۔اس کتاب کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔رشید حسن خاں کے ان جملوں پر غور کریں جو کہ یادگار غالب کے حوالے سے بہت ہی خاص ہیں:

> ''پچھلے پچاس برسوں میں مرزا صاحب کی شخصیت، اردو نثر اور اردو شاعری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود سو برس زیادہ پرانی کتاب ''یادگار غالب'' کی اساسی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ اس قول کے ساتھ اگر اس جملے کو شامل کرلیا جائے کہ مرزا صاحب کی فارسی نثر اور فارسی شاعری سے متعلق حالی نے جو کچھ لکھا تھا اس پر ذرا سا بھی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے تو بات مکمل ہوجائے گی۔'' [۲۰]

اس طرح حالی نے یادگار غالب کو اپنے عہد میں وقت اور حالات کے پیش نظر تحریر کی اور سوانح نگاری میں منفرد مقام حاصل کیا۔

حیات جاوید، حالی کی سوانح نگاری کے اعتبار سے ان کی تیسری کتاب حیات جاوید ہے۔حیات جاوید ان کا علمی و سوانحی کارنامہ ہے۔حالی کا سرسید سے دلی لگاؤ تھا۔ان کے افکار و نظریات سے بے حد متاثر تھے کیونکہ سرسید اپنے کام کے تئیں پرعزم تھے۔کام کے پکے تھے، زمانے بھر کے لوگ ان سے عداوت رکھتے تھے۔سرسید کے عمل و فعل سے لوگ کتراتے تھے کیونکہ انہوں نے وقت شناسی کے اعتبار سے مغلوں کی پیروی نہیں کی بلکہ آنے والی حکومت یعنی انگریز حکمراں کی

چاپلوسی کی۔ان کی اطاعت قبول کی۔ان کی تابعداری میں اپنے وجود کو صرف کیا۔یہ تمام چیزیں تھیں جو کچھ لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ طعن و تشنیع اور تنقید کے شکار ہوئے۔سرسید ان تمام چیزوں سے اوپر اٹھ کر قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی سوچی۔جس میں انہوں نے کئی اہم تصنیفات چھوڑیں تاکہ قوم ان تمام چیزوں سے سبق لے۔حالی ان کے فکر و عمل سے بہت متاثر تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سرسید کے افکار و نظریات اور ان کی طرز زندگی کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے غور و فکر کیا۔اس میں انہوں نے سرسید سے متعلق سوالات قائم کیئے اور سرسید سے رائے مشورہ بھی کیا اور یہ سوالنامے سرسید کو بھی دکھائے اس کے بعد سرسید کی زندگی کے اوپر کام شروع کیا لیکن جب یہ کتاب تیار ہوئی تو اس وقت سرسید اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔حالی کو بہت ملال ہوا۔سرسید کے اندر بہت ساری خوبیاں تھیں۔انہی خوبیوں کی وجہ سے سرسید،سرسید بنے۔تعلیمی میدان کے عظیم راہ نما تھے تو معاشرے اور سماج کے بہت بڑے صلاح کار،اردو زبان و ادب کے بلند نثر نگار،بہترین منظّم،اعلیٰ مفسر قرآن،زمانے کے نبض شناس،تاریخی مقامات اور اپنے وقت کے حید علماء ادبا،حکما وغیرہ کو صفحہ قرطاس میں جمع کرنا ان سے بہترین فن کار کوئی نہ تھا۔زبان و ادب کے بہت بڑے عالم تھے اسی وجہ سے انہوں نے اپنے تمام رفقاء سے مختلف انداز میں،مختلف چیزوں مختلف،اصناف مختلف ادب لکھوائے کہ آج دنیا عش عش کرتی ہے۔حالی سے انہوں نے تاریخی کارنامہ انجام دلوایا۔ان کا شعری کارنامہ مدو جزر اسلام یعنی مسدس حالی لکھوایا۔۱۸۵۷ء کے بعد لکھی گئی یہ نظم ۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش پر لکھی۔سرسید اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ
> میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا؟ میں کہوں گا
> میں حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔''[۲۱]

بلاشبہ حالی کا یہ مسدس لازوال کارنامہ ہے۔جس میں حالی نے مسلمانوں کے تمام احوال کو بیان کیا ہے۔الغرض سرسید نے حالی اور آزاد کے ذریعے زمانے کے اعتبار سے رائج غزل سے نظم کی جانب موڑ دیا اور ان لوگوں نے نظم کو نئے زاویے سے دیکھا اور آگے بڑھایا جو آج اس کی بہترین مثال ہے۔حیات جاوید دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں چھ ابواب ہیں۔جن میں سرسید کی

ولادت ،خاندان ،بچپن، تعلیم ، شباب، علمی ارتقاء ادبی کارنامے اور ان کی وفات تک احوال و آثار ہیں ۔ دوسرے حصے میں ان کی تصانیف اور ان کے کارناموں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان کی عادات و خصائل جن میں ان کی محنت، جفاکشی، مہمان نوازی، صداقت، جسمانی صحت، توحید و رسالت، اسلام پر یقین کامل وغیرہ جیسے امور پر تفصیل سے بیان ملتا ہے۔حالی حیات جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر چہ ہندوستان میں ہیرو کا عیب و خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیاگرافی کرٹکل طریقہ سے لکھی جائے۔اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے اعلیٰ خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں۔ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔لیکن اول تو ایسا بیاگرافی چاندی سونے کی ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔.....ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیسے لکھی جاسکتی ہے ۔ضرورت ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔
وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔اسی لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔''**۲۲**

حیات جاوید ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب کو حالی سرسید کی زندگی میں لانا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔مزید اس کتاب میں انہوں نے سرسید کے احوال اور ان کی تصانیف کو بڑی تفصیل اور مدلل طریقہ سے بیان تو کیا لیکن ان کے نقائص اور ان کی کمزوریوں کو بیان نہ کر سکے۔ جس کی وجہ سے بہت سارے تنقید نگاروں نے اس کتاب کے مصنف حالی پر انگلی اٹھائی ہے۔جبکہ ان کے عہد کے عظیم سوانح نگار شبلی نعمانی نے حیات جاوید کو یک رخی تصویر گردانتے ہوئے اسے مدلل

مداحی گردانا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرسید کے خصائل کو کم وکاست کیونکر بیان کرتے جبکہ سرسید حالی کے ہیرو تھے اور اپنے ہیرو کی کمیوں کو کوئی اجاگر نہیں کرتا جبکہ حالی اس بات کا اقرار حیات جاوید کے دیباچے میں بیان کرتے ہیں کہ:

''اگر چہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ میں یہ کرامت ہے کہ جس طرح اس میں کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب وتاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔''۲۳

اس طرح خواجہ الطاف حسین حالی نے حیات جاوید تحریر کی۔جس میں سرسید کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے افکار ونظریات، ان کے علمی کارناموں اور عملی زندگی کے احوال کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری :الطاف حسین حالی کی چوتھی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ دراصل یہ کتاب نہیں بلکہ ان کے دیوان ''مدو جزر اسلام'' کا مقدمہ ہے۔اور یہ مقدمہ بہت طویل مقدمہ ہے۔اسی وجہ سے اس مقدمے کو دیوان سے الگ کر کے کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔یہ مقدمہ حالی نے۱۸۹۳ء میں شائع کیا تھا۔اس مقدمے نے تنقید کی ابتدا کی۔گرچہ اس سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھ کر تنقید نگاری کی ابتدا کی ہے۔یہ کتاب تذکرہ نما تنقید ہے۔ جبکہ مقدمہ شعر وشاعری باقاعدہ تنقید اور اس کے لوازمات پر بحث کی ہے۔اسی جہ سے اس مقدمے سے نئی تنقید نگاری کی بنا ہوئی۔اس مقدمے میں حالی نے شعر وشاعری کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویے سے دیکھا ہے اور تفصیل سے اپنے نظریات کو بیان کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو اردو تنقید کا پہلا نمونہ قرار دیا ہے۔آل احمد سرور نے اسے پہلا منشور گردانا ہے۔اس مقدمے کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں شاعری کے اصول وضوابط یعنی نظریاتی مباحث پر مبنی ہے جبکہ دوسرے حصے میں اصناف شاعری کے ذریعہ عملی تنقید پر زور دیا گیا ہے۔اس کے بعد شبلی تنقید کے

نظریات واصول قائم کرتے ہیں۔حالی نے مقدمہ کے ذریعے تنقید نگاروں کے لئے نیا تنقیدی ماڈل تیار کر کے دے دیا ہے۔بعد کے ناقدین نے اسے اسی صورت میں قبول کیا اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔اس طرح حالی نے نظم نگاری میں جوہر دکھایا۔سوانح نگاری میں حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید لکھ کر بہترین سوانح نگار بنے اور لوگوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور تنقید کی دنیا میں پہلے تنقید نگار ثابت ہوئے۔

علامہ شبلی نعمانی:

علامہ شبلی نعمانی کا معترف سارا زمانہ ہے۔ان کی عظمت اور جامعیت کا راز ان کے بہار آفریں قلم کے ذریعے تنقید، تحقیق، شاعری، سوانح نگاری، سفرنامے، تاریخ نگاری اور سیرت نگاری وغیرہ سے ہوئی۔ علامہ شبلی سرسید کے رفقا میں سے تھے۔اور تمام رفقاء میں کم عمر پائی تھی۔لیکن ان کی علمی وادبی کارناموں کے باعث اپنے تمام معاصرین میں شبلی ممتاز اور منفرد ہیں کیونکہ وہ قدیم اور جدید کے سنگم ہیں۔ان کے شجر علمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے اندر قدیم علوم و فنون کا گہوارہ رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید علم وادب کے ماہر تھے۔

شبلی (۱۹۱۴۔۱۸۵۷ء) اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔عربی، فارسی، مذہبی اور فلسفے کی تعلیم بڑے بڑے علما سے لی۔باپ وکیل تھے اور شبلی کو بھی وکیل بنانا چاہتے تھے۔شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کر کے کچھ دن وکالت کرتے رہے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔سرسید، حالی، آزاد، محسن الملک، پروفیسر آرنلڈ وغیرہ شخصیات سے ملاقات نے ان کی زندگی بدل دی۔سرسید کے کتب سے بیش قیمتی ہیرے و جواہرات کو اپنے سینے میں دفن کیا اور وہیں استاد مقرر ہوئے۔ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔مگر ان کی زندہ جاوید تصانیف میں المامون، الفاروق، الغزالی، سیرت النبی، علم الکلام، شعر العجمؒ موازنہ انیس و دبیر تصانیف ہیں۔یہ وہ تصانیف ہیں جنہوں نے شبلی کو شبلی بنایا۔ آیئے ان کی ادبی تصانیف پر گفتگو کرتے چلیں۔

شبلی نے سوانحی ادب میں زور آزمائی سرسید کی فرمائش پر کی۔سرسید چاہتے تھے کہ شبلی ان تمام عظیم شخصیات پر قلم اٹھائیں اور ان کی یادوں کو اس مردہ قوم یعنی زوال آمادہ مسلمانوں کے معاشرہ کی جانب اشارہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی شکست اور صلاحیتوں کے فقدان کے باوجود سیاسی

بصیرت کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔اپنے اسلاف کی یادوں اوران کے کارناموں سے بے خبر تھے۔ان مسلمانوں کو ذہنی اعتبار سے جگانا ضروری تھا۔اس لئے سرسید نے شبلی سے جو کہ اس وقت ان کا ذہن نظم نگاری کی جانب زیادہ تھااس کے باوجودان کوسوانح نگاری یا پھران عظیم شخصیات پرقلم اٹھانے اوران کے کارناموں کے ذریعے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان کی کاوشوں کا سلسلہ لوگوں کی بیاگرافی سے ہوا۔ان کی پہلی سوانح نگاری میں ''المامون'' ہے۔

المامون:شبلی نعمانی نے المامون کی تصنیف ۱۸۸۷ء میں کی ہے۔یہ کتاب قیام علی گڑھ میں آچکی تھی۔اس تصنیف کے دوران شبلی کی نظر میں تاریخ اورسوانح عمری میں کوئی خاص فرق نہ تھا اسی وجہ سے انہوں نے مکمل تاریخ اسلام لکھنے کا ارادہ کیا لیکن مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے چند ناموں کا انتخاب کیا اور اس بات کا خیال رکھا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ سوانح عمری کا بھی لحاظ رہے۔المامون میں ایک جگہ شبلی خود لکھتے ہیں کہ:

> ''آخر میں، میں نے فیصلہ کیا کہ رائل ہیروز آف اسلام (یعنی نامور فرمانروائے اسلام) کا ایک سلسلہ لکھوں جس کا طریقہ یہ ہو کہ اسلام میں آج تک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلہ قائم ہوئے ہیں ان میں سے صرف وہ نامورانتخاب کر لیے جائیں جواپنے طبقہ میں اس عظمت اور جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو۔''۲۴

شبلی ایک تجربہ کارمورخ کی حیثیت سے ''مامون'' کا انتخاب کیا۔ان کی نظر میں ہارون عباسیوں کا ''گل سرسبد'' تھا مگرشبلی نے انصاف پسندی کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہارون کے ہاتھ برامکہ کے خون سے رنگین نہ ہوتے تو اس کے علاوہ کسی اور کا انتخاب نہ کرتے مگر انصاف کا تقاضہ کچھ اور تھا بلاآخر مامون رشید کوموضوع بنایا اوران کے احوال وآثار کو دوحصوں میں بیان کیا۔پہلے حصے میں عباسیوں کی تاریخ مامون کی ولادت، ذہانت، عادات واطوار، مامون کے عہد کی خانہ جنگی کا بیان وغیرہ شامل ہے۔اس کتاب کے دوسرے حصے میں مامون کے سوانحی کوائف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیات کو ابھارنا ان کے اوصاف کو بیان کرنا جو کہ نرم دلی، دریا دلی، رحم و

انصاف، بلند ہمتی، دلیری اور بہادری کو بیان کیا ہے۔اس کتاب میں شبلی نے ان کی بے اعتدالیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔اس کتاب کے حوالہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

''المامون تاریخ کی ایک اچھی کتاب ہے۔مامون کے زمانے کی معاشرت اور دارالسلام بغداد کی تہذیب عصری کا اس سے بہتر موقع شاید کسی اور کتاب میں موجود نہ ہوگا۔شاید مشہور عربی کتاب عصر المامون سے بھی بہتر۔المامون میں اشخاص کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کی تصویریں بھی عمدہ ہیں۔انہی کی وجہ سے المامون ایک معقول سوانح عمری بن گئی۔'' ۲۵

الفاروق: شبلی کی سوانح نگاری میں الفاروق بہت اہم کتاب ہے۔اس کتاب کو تحریر کرنے میں شبلی نے ہندوستان کے سارے ذخیرہ معلومات کو اکٹھا کیا اور اس کے بعد اس کے مواد کی فراہمی کے لئے اسلامی ممالک، روم، شام، مصر، قسطنطنیہ وغیرہ کے کتب خانوں کی سیر کی۔اس کتاب کی تصنیف میں شبلی کو بھی احساس تھا کہ جتنی محنت اس کتاب میں لگ رہی ہے اس کا پھل بھی اتنا ہی میٹھا ہوگا۔اس کا ثمرہ کتاب کے تیار ہونے کے بعد ملا۔یہ کتاب حضرت عمر فارق کی بلند شخصیت، پاکیزہ سیرت اور بہترین طرز حکومت کی اعلیٰ مثال ہے۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں حضرت عمر کے دور کی حالت، سیاسی رجحانات، عہد کی تاریخ و تہذیب، حضرت عمر کی ولادت، خاندان، نسب، اسلام سے پہلے کے احوال، اسلام قبول کرنے کا واقعہ، اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی طرز زندگی، ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی علیہ ولم کی وفات اور مختلف غزوات کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔حضرت عمر کے اوصاف کو بڑے سلیقے سے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے تا کہ خلیفہ ثانی کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔حضرت عمر انصاف کے فاروق تھے، امیر اور غریب کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔شام کے سلاطین کی طرز میں حضرت عمر نے بھی اپنے یہاں بیت المال کی بنیاد ڈالی۔شبلی الفاروق میں حضرت عمر کے حالات و واقعات کا تذکرہ جنگ قدسیہ کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ:

''حضرت عمر کا یہ حال تھا کہ جس دن سے قادسیہ کا معرکہ شروع ہوا تھا

> ہر روز آفتاب نکلے۔ مدینہ سے نکل جاتے اور قاصد کی راہ دیکھتے۔ ایک دن معمول کے موافق نکلے ادھر سے ایک شتر سوار آرہا تھا۔ بڑھ کر پوچھگ کہ کدھر سے آئے ہو۔ وہ سعد کا قاصد تھا اور مژدہ فتح لے کر آتا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سعد کا قاصد ہے ت اس سے حالات پوچھنے شروع کیے۔ اس نے کہا، خدا نے مسلمانوں کو کامیاب کیا۔ حضرت عمر رکاب کے برابر دوڑتے جاتے تھے اور حالات پوچھتے جاتے تھے۔ شتر سوار شہر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ جو شخص سامنے آتا ہے ان کو امیر المومنین کے لقب سے پکارتا ہے۔ ڈر سے کانپ اٹھا اور کہا حضرت نے اپنا نام کیوں نہ بتایا کہ میں گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا۔ فرمایا نہیں کچھ حرج نہیں۔ تم سلسلہ کلام کو نہ توڑو۔ چنانچہ اسی طرح رکاب کے ساتھ ساتھ گھر تک آئے۔[۲۶]

اس کتاب کے دوسرے حصے میں شبلی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہہ کی تمام ملکی فوجی انتظامات، مالی اور غزوات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے واقعات، عہد خلافت سے وابستہ حالات، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ الفاروق میں بہت سارے ایسے متنازع مسائل تھے جو حضرت عمر فاروق کے خلاف تھے۔ اس کو زائل کیا اور مدلل انداز میں حقائق کی روشنی میں واضح کیا، تاکہ کتاب میں کوئی جھول نہ رہے۔ شبلی کے نزدیک اکثر و بیشتر موازنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہہ کی جنگی فتوحات، کردار اور حکومت کرنے کا طریقہ کار کو سکندر اعظم اور چنگیز کی فتوحات سے موازنہ کیا ہے اور بڑے مدلل انداز میں جس سے نگاہیں پڑھتے وقت خیرہ ہو جاتی ہیں۔ مہدی افادی اس کتاب ''الفاروق'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''غالباً یہ عمروں کی کمائی ہے۔ بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال مورخانہ تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلے میں خلیفہ دوم (حضرت عمر فاروق) کی لائف پر یہ ضخیم تالیف کی گئی ہے۔ مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ترکی و مصر وغیرہ کے مصائب برداشت کیے۔ سینکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے لئے

ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصل ماخذ کی چھان
بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہ پایا۔غرض کہ معلومات کا جو
ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات
مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ کسی زبان میں
اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا۔''۲۷

سیرت النعمان: علامہ شبلی نے ہندوستانی تاریخ میں امام ابوحنیفہ پر اب تک کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی اس وجہ سے انہوں نے امام ابوحنیفہ کو موضوع بنایا۔ان کی زندگی کو''سیرۃ النعمان'' کی شکل میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔۱۸۹۱ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔اس کتاب کے ذریعے بہت سارے ایسے امور یا واقعہ جو امام ابوحنیفہ کی جانب منسوب تھے ان کو استدلال کے ساتھ رد کیا اور حقائق دریافت کرنے کی جستجو کی۔جیسے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ امام صاحب عشاء کی وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے اور یہ سلسلہ چالیس سال تک برقرار رہا۔تواریخ کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔شبلی کے نزدیک امام صاحب کی تصویر سادہ اور بشریت سے لبریز ہے۔اسی وجہ سے ان کے اوصاف جو شبلی کے نزدیک ہر دلعزیز ہیں اس کے باوجود انہوں نے مداحی کی صورت اختیار نہ کرکے حقائق کی جانب پیش قدمی کی تاکہ سچائی کا علم ہو۔اسی وجہ سے وہ فن پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔سیرۃ النعمان کے ذریعے شبلی نے امام ابوحنیفہ کی بعض کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی بلکہ اس کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔خود لکھتے ہیں کہ:

''امام صاحب کے مناظر میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا
اثر پاتے ہیں جو بظاہر ان کی کسر نفسی و تواضع کے خلاف ہے لیکن یہ
انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہوسکتا۔''۲۸

شبلی کی یہ تصنیف بہت علمی اور جامع صفات سے متصف ہے۔اس میں اس عہد کے اسلام کے پیروکار، مناظرے، امام ابوحنیفہ کے علمی کارنامے، طرز تعلیم اور علمائے وقت کے اختلافی مسال، حدیث اور ان کی رائے جو اختلافی مسائل تھے۔اس میں تنازعی کے علاوہ فقہ حنفی کی تمدن اور عقلی بنیاد کو موضوع بنایا گیا ہے تاکہ امام ابوجنیفہ کے تمام تر زندگی کے جزئیات اور ان کی زندگی کی مکمل تصویر کشی ہوجائے۔شبلی نے اس میں بھرپور عکاسی کی ہے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے میں کوئی

کسر نہ چھوڑی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے بعد بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔

سیرت النبی: علامہ شبلی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی ہے۔ یہ کتاب عشق رسول اور ان سے والہانہ عقیدت ومحبت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ شبلی بہت پہلے اس کتاب کو تحریر کرنا چاہتے تھے لیکن وقت اور حالات کے پیش نظر نہ لکھ سکے اور اخیر عمر میں اس کی جانب توجہ مبذول کی اور سیرۃ النبی جو خود اور عوام الناس کے لئے بھی نفوس قدسیہ کی زندگیوں کو پیش کیا۔ سیرۃ النبی ہر کلمہ گو کے لئے درس عبرت ہے اور تمام انسانوں کی ضرورتوں اور ان کے انفرادی مسائل میں نصیحت اور تربیت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ شبلی نے یہ کتاب اسی مقصد سے تدوین کی ہے کہ ہر انسانی زندگی میں سیرت نبوی کی ضرورت دنیاوی اور دینوی حساب سے از حد ضروری ہے۔ اس سیرت میں شبلی نے ان تمام مباحث کو چھیڑا ہے جو آپؐ کے خلاف بشریت کے تقاضے کے تحت غیر مسلم مورخوں نے سوال اٹھائے ہیں۔ جبکہ عہد حاضر میں بھی یہ مسئلہ درپیش ہے کہ حضور نور سے پیدا کئے گئے ہیں یا مٹی سے۔ یہ ماننے والوں کے اوپر ہے کہ وہ کس چیز کو فوقیت دیتے ہیں۔ جبکہ شبلی نے قرآن وحدیث کی روشنی میں دلیل کے ساتھ انیسوں اور بیسویں صدی کے علمی ونظریاتی سطح پر بھی وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان اور بشریت تصور کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو سیرت النبی علامہ شبلی کی بہت جامع تالیف ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد علامہ شبلی کی تحریر کردہ ہے اس کے بعد علامہ شبلی اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر جانے سے پہلے سید سلیمان ندوی سے اس کی تکمیلیت کا اعادہ کر گئے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنی شاگردی کا حق ادا کر دیا اور دوسری جلد عین شبلی کی منشا کے مطابق تحریر کی۔ علامہ شبلی سیرۃ النبی کی وجہ تصنیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اسی لئے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر ونگیں بھی ہو اور گوشہ نشین بھی۔ بادشاہ کشور وکشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمان روائے دو جہان بھی ہو اور سبحہ گراں بھی۔ مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی۔ یہ برزخ کامل یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔'' ۲۹

اس طرح علامہ شبلی نے سیرت نگاری پر مفصل انداز میں بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور پوری تاریخ نبوی کو اس سیرۃ النبی میں بیان کیا ہے جو یقیناً قابل رشک اور قابل دید ہے۔آج بھی ہر سیرت نگار اس کتاب کو ماخذ مانتا ہے۔

شبلی نعمانی نے سوانح نگاری کے اعتبار سے اور بھی کئی تصانیف چھوڑی ہیں ان میں الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ بھی اہم تصانیف ہیں جس میں ان لوگوں کے علمی احوال و کوئف کو بیان کیا ہے۔

شعر العجم: حالی کے بعد اردو تنقید میں سب سے بڑا نام شبلی نعمانی کا ہے۔انہوں نے اپنی تنقیدی نظریات کو''شعر العجم''میں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اس میں انہوں نے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر اردو تنقید جلد چہارم میں شعر العجم میں انہوں نے شاعروں کے متعلق نظریاتی بحث کی ہے۔شبلی کے نزدیک شعر و ادب میں لفظ کے ذریعے حسن کاری اصل محرک ہے۔ان کے نزدیک شاعری کا مقصد پڑھ کر اخلاق کو درست کرنا نہیں بلکہ فرحت و انبساط حاصل کرنا بھی از حد ضروری ہے۔حالی کی طرح شبلی نے بھی الفاظ و معنیٰ سے بحث کی ہے۔حالی معنی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جبکہ شبلی لفظ پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔شبلی کے نزدیک شاعری کے لئے دو چیزیں مرکب ہیں (۱) محاکات اور (۲) تخیل اور شاعری کے دوسرے لوازمات میں وزن، خیال بندی، شیریں اور سادہ الفاظ، طرز ادا اور جدت کا ہونا از حد ضروری ہے۔

شعر العجم کے علاوہ تنقیدی کتابوں میں''موازنہ انیس و دبیر' سوانح مولانا روم اور مقالات شبلی اہم کتابیں ہیں۔سفر نامے کے حوالے سے شبلی نے''سفر نامہ روم و مصر و شام''جس میں اسلامی ممالک کے کتب خانوں سے نظام تعلیم کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی غرض سے سفر کیا تھا۔تاریخ نگاری میں بھی خوب نام کمایا۔ان میں''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''،'الجزیہ''،'کتب خانہ اسکندریہ''وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد:

مولانا محمد حسین آزاد (۱۹۱۴۔۱۸۳۳ء) کی شخصیت کسی سے مخفی نہیں۔دہلی کے مشہور عالم دین مولانا باقر حسین کے گھر میں پیدا ہوئے۔ان کی ولادت کے تین سال بعد محمد باقر نے اردو کا اہم

اخبار'' دہلی اردو اخبار'' جاری کیا جس نے ۱۸۵۷ء سے پہلے خوب کمالات دیکھائے اور غدر کی داستان کو بیان کرنے میں سرفہرست تھے۔حقائق پر مبنی تصویر کشی اس اخبار کا شعائر تھا۔انگریزوں کو بچانے پھر ان کو چھوڑ دینے کی پاداش میں انہیں گولی ماردی گئی۔خیر آزاد کی ابتدائی تعلیم عربی، فارسی کے علاوہ ذوق کی شاگردی نصیب ہوئی۔دلّی کالج کے متعلم رہے۔ان کے ہمراہ نذیر احمد، ذکا اللہ، پیارے لال آشوب وغیرہ تھے۔ والد کے انتقال کے بعد در بدر کی زندگی،کبھی لکھنؤ، حیدر آباد اور لاہور میں پھرتے رہے۔۱۸۶۴ء میں لاہور میں محکمہ تعلیمات میں ملازمت مل گئی۔اس میں انہوں نے بہت ساری کتابوں کا فارسی اور اردو میں ترجمہ کیا۔انگریز حکمراں کے زیر التفات انجمن بنجاب کو فروغ دیا۔اس میں نئے طرز کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔کرنل رائڈ اس کے مشیر تھے۔محمد حسین آزاد نے بہت ساری کتابیں تحریر کی ہیں۔ان کتابوں میں قصص ہند،آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال،سخندان فارس،دیوان ذوق کے علاوہ مجموعہ نظم آزاد ہے۔

آب حیات: '' آب حیات'' ان کی شاہکار تصنیف ہے۔ یہ اپنی تحریر اور اسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں اس کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ کتاب گرچہ تاریخ شعرا کی حیثیت سے تونہیں ہے لیکن اردو کے بہترین تذکروں میں سے ایک ہے۔ اس تذکرے میں محمد حسین آزاد نے تمام شعراء ادب اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب شعری خزانوں کا بیش بہا تحفہ ہے لیکن آزاد نے اس کتاب میں شاعروں کے حالات اور ان کے کلام میں جانبداری سے بھی کام لیا ہے۔بعض کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض کے کلام کو بہت بلند ثابت کرنے کی سعی کی ہے جیسے غالب اور ذوق ،ان دونوں میں ذوق ان کے استاد تھے جب دونوں کے کلاپ پر گفتگو کرتے ہیں تو ذوق کے کلام میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور غالب سے بہتر شاعری گردانتے ہیں اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔اسی طرح انیس و دبیر کے تذکرے میں جانبداری سے کام لیتے ہیں اور انیس کے مقابلے میں دبیر کو بہت کمتر ثابت کرتے ہیں۔ان تمام چیزوں کے باوجود یہ کتاب اپنے وقت اور حالات کے پیش نظر بہت اہم کتاب تھی۔سید احتشام حسین اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'' آب حیات اردو شاعری کی پہلی تاریخ ہے جس میں سماجی پس منظر،

معاشرتی ماحول، تاریخی ارتقا اور ادبی شعور کا لحاظ رکھتے ہوئے شعرا کا
تذکرہ کیا گیا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس میں خامیاں اور غلطیاں بھی
ہیں لیکن اپنے عہد میں آزاد نے تحقیق کا حق ادا کیا۔''۳۰؎

نیرنگ خیال: محمد حسین آزاد نے کرنل رائڈ کے مشورے سے اور ان کی ترغیب پر مذکورہ کتاب تحریر کی۔ یہ کتاب اردو نثر میں بیش بہا اضافہ ہے۔ نثری ادب میں اس کا اہم مقام ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں خیالی اور تمثیلی مضامین ہیں۔ خواب اور خیالی افسانوں کے زیر اثر اخلاق و نصیحت اور پند و موعظت پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب یونانی ادبیات سے زیادہ متاثر ہے کیونکہ اس میں یونانی علم الاصنام مرقع کارفرما ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ اردو ادب میں اس وقت اس قسم کے خیالات و حکایات کا چلن نہ تھا اور نہ ہی کوئی تحریر اس زبان میں وارد ہوئی تھی۔ آزاد نے اس نیرنگ خیال کے ذریعے قدیم رومی اور یونانی ادبیات کی مدد سے حکایتی انداز میں بہترین نثری ادب اور اردو زبان و ادب میں نقش چھوڑا ہے۔ اس زبان سے پہلے اس کے اثرات رمزیہ انداز میں مختلف زبان و ادب میں نمودار ہو چکے تھے جیسے انگریزی ادب میں سویفٹ، ایڈیسن جانسن وغیرہ نے ایسی کتابیں اور مضامین تحریر کئے ہیں۔ فارسی زبان میں انوار سہلیڈ مولانا روم، عربی میں اخوان الصفا اور سنسکرت زبان میں ہتوپدیش کافی اہم کتابیں ہیں جس سے حکایتیں نوع بنوع ظاہر ہوتی ہیں۔ آزاد نے بھی دیگر زبانوں کی مدد سے اس کتاب میں چاشنی بھر دی ہے۔ نند کشور وکرم اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''اپنے منفرد جدید اسلوب میں لکھی گئی آزاد کی کتاب ''نیرنگ خیال''
بھی نثری ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔.....مزے کی بات یہ
ہے کہ اگرچہ آزاد انگریزی زبان و ادب سے زیادہ واقف نہ تھے لیکن
انہوں نے اس تصنیف میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور انہیں
اتنا دل چسپ بنا دیا ہے کہ کوئی بھی مضمون ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں
چاہتا۔''۳۱؎

سخندان فارس: محمد حسین آزاد کی یہ کتاب بہت مشہور ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے ادب فارسی سے متعلق بہت دلچسپ باتیں اور سفر ایران سے متعلق بہت ساری سرگوشیاں شامل کی

ہیں۔ وہاں کی ادبی فضا، ادب اور زمانے کے تال میل۔حکومتی سطح پر زبان وادب کی حفاظت اور ادبی محفلوں کی روداد بھی اس میں ہے۔سفر کے مختلف حالات و واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں فارسی زبان و ادب کی ساخت، اس کی ہئیت اور بنیادی ماخذ کو بیان کیا ہے۔اور دوسرے حصے میں ایران کے مختلف کالجز اور یونیورسٹی میں طلبا کو دیئے گئے لکچر کا مجموعہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس بات کی بھی ضامن ہے کہ اسلام سے قبل ایران کی تہذیب و تمدن، زبان و بیان، اسلام کے بعد کے حالات اور اس کے رسم و رواج، انقلاب زمانہ، زبان و بیان اور ادبی فضا، شعرا وادبا کی تصانیف پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

دربار اکبری: اس کتاب میں محمد حسین آزاد نے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر اور ان کے حوارین سے متعلق ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں شہنشاہ اکبر کے دلچسپ تاریخی واقعات اور ان کے عہد کی تاریخ ہے۔درباری حالت، مزید دربار سے وابستہ امیروں، شاہوں، عالموں اور وزراء کے احوال وکوائف کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے دوران تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب ''منتخب التواریخ'' کو زیر نظر رکھا تھا۔کتاب کے مطالعہ سے اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔اس عہد کی تہذیب وتمدن اور سماجی احوال کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور باہمی اتفاق نے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔

کلام ذوق کی تدوین: اس میں آزاد نے اپنے استاد ذوق دہلوی کے کلام کی ترتیب و تدوین کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے ہر زندگی کو مبہوت کر دیا تھا۔ ذوق کے کلام جل کر خاک ہو چکے تھے جو بچے تھے آزاد ان کو لے کر پھر رہے تھے۔آزاد کا اردو زبان وادب کے چاہنے والوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے بڑی تگ ودو کے بعد کلام ذوق کو ہم تک پہنچایا اور ان کے کلام کی ترتیب وتدوین کی شکل دی۔ دیوان ذوق کے ابتدائی حصے میں یہ لکھا ہے کہ:

> ''ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے تھے اور ان کی زبان سے بھی کچھ سنے اور کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے

بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کی ہاتھ کی بہت سی تحریریں ہیں
بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا تھا اور جمع
کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا اس زمانے کے
خیالات کو.......سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک
روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناصر تھا۔ راتیں صبح
ہوگئیں اور دن اندھیر ہوگئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔'' ۳۲

اس کے علاوہ محمد حسین آزاد کے سفر نامہ ایران، مکتوبات آزاد، فلسفہ الہیات وغیرہ کتابیں دستیاب ہیں اور بہت ہی اہم ہیں۔

نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد (۱۹۱۲۔۱۸۳۳ء) سرسید کے رفقا میں سے ایک تھے۔ ان کی ولادت بجنور میں ہوئی۔ کم عمری میں ہی دہلی آ گئے تھے اور مستقل یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وقت کے جید علماء سے حاصل کی اور دلّی کالج پہنچے۔ جہاں ان کے ساتھ محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، محسن الملک، پیارے لال وغیرہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک بعد میں اپنے وقت کے اعتبار سے جید عالم بنے اور قوم وملک کی خوب خدمت کی۔ نذیر احمد کالج کے دنوں میں بھی اچھے طلبا میں شمار ہوتے تھے اور پڑھنے لکھنے سے شروع ہی سے تعلق رہا ہے۔ نئے خیالات اور نئی تعلیم سے بہت جلد مانوس ہو گئے اور انگریزی زبان وادب پر خوب مہارت حاصل کی۔ انگریزی کتابوں خاص طور پر قانون کی کتابوں کا ترجمہ بھرپور کیا۔ مترجم کے بعد نذیر احمد تحصیلدار ہوئے پھر ڈپٹی کلکٹر بنے۔ ان کی علمی لیاقت کے تحت بہت ساری یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈلٹ کی ڈگری تفویض کی اور حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔

نذیر احمد ایک بہت بڑے مصنف، مترجم اور با اثر خطیب تھے۔ ۱۸۶۲ء میں نذیر احمد نے ولیم ایڈورڈس کی ''سرگزشت غدر'' انگریزی کا اردو میں ''مصائب غدر'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ نذیر احمد انگریزی عہدے پر فائز رہتے ہوئے علمی مشغولیات میں مصروف رہے۔ قانون کی کتابوں میں ''تعزیرات ہند'' اور ''قانون شہادت'' ان کے شاہکار ترجمہ ہیں اس کے علاوہ انہوں نے

قرآن مجید کے ترجمے بھی کیے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ علم و ادب میں بھی انگریزی کی پڑھائی جاری تھی ملک کے مختلف جگہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی کی تعلیم اوراس کے ذریعے تراجم کے کام زوروں پر ہورہے تھے۔ مختلف اصناف کی آگہی ہورہی تھی۔ طرح طرح کے مضامین لکھے جارہے تھے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے قوموں کو بیدار کیا اوراس میں ہر چیز پر دھیان دیا۔ یہاں تک کہ اردو ادب کے پرانے رسم و رواج اور نئے طریق کار کا وجود تلاش کررہے تھے۔ اردو زبان وادب اپنی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے جدید طرز کی روایات کی بنیاد ڈال رہی تھی۔ انگریزی ادب کے ذریعے اردو میں بھی نئے نئے اصناف کا اضافہ ہوا۔ ان ہی اصناف میں ایک صنف ناول ہے۔

اردو کے سب سے پہلے ناول نگار نذیر احمد کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جبکہ نذیر احمد نے اپنے بچوں کی اصلاح کے لئے کہانیاں لکھ رہے تھے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ناول کے اولین نقوش کے طور پر ابھرے اوران کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف موضوعات پر رنگ برنگ کے ناول لکھے جن میں ''بنات النعش''، ''توبتہ النصوح'' ابن الوقت ''فسانہ مبتلا'' 'ایامیٰ'' رویائے صادقہ'' وغیرہ ناول لکھ کر اپنے آپ کو ثابت کردیا۔ ہر چہار جانب آپ کی شہرت پھیل گئی۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ نذیر احمد کالج کے بعد انگریز ادب اورانگریزی حکمراں کے گن گاتے تھے اور ان کے اندر کا ایمان متزلزل ہورہا تھا۔ ادھر کالج کے استاد ماسٹر رام چندجو ہندومت تھے ہندو ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس کی وجہ سے نذیر احمد بھی تشکیک میں مبتلا تھے۔ نئے شعور کے ساتھ اسلام کی جانب واپس ہوئے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ''مراۃ العروس'' کہانی لکھی۔ اپنے بیٹے بشیرالدین احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مجھ کو ایسا احمق مت سمجھو کہ بہت دنیا جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں۔ بشیر! دنیا کو تو خوب دیکھا۔ غریب محتاج تھا۔ خدا نے مال دارغنی کیا۔ اولاد ہوئی، حکومت کے مزے اڑائے ناموری اور شہرت

سے بھی بے نصیب نہیں رہا لیکن انجام ان سب بکھیڑوں کا کیا ہے۔
آخر فنا۔ اب خداوند ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لئے بھی
کروں۔"۳۳

مراۃ العروس: نذیر احمد نے پہلا ناول اصلاحی موضوعات پر لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے حالات خاص طور پر پہلے اور غدر کے بعد کی جو صورت حال تھی وہ نا قابل بیان ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی حالت زار اور ان کی سوچ وفکر منجمد ہو گئی تھی۔ ان کے اندر اصلاحی اخلاقی، تہذیبی اور تعلیمی بیداری کی ضرورت تھی۔ نذیر احمد نے کہانیوں کے ذریعے خاص طور پر اپنے بچوں کے لئے جو وقت کے اعتبار سے بگڑتے جا رہے تھے۔ ان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ قوم کے دیگر بچوں کے لئے بھی یہ سامان تیار کر رہے تھے۔ اس سے پہلے مافوق الفطرت عناصر کا زور تھا۔ قوم اور قوم کے لوگ بیدار ہو رہے تھے۔ داستانوں کا دور ختم ہو رہا تھا اور جدید دور کے تقاضے کے مطابق چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی جانب رغبت دکھلا رہے تھے۔ نذیر احمد نے بھی اسی جانب پیش رفت کی اور "مراۃ العروس" لکھ ڈالی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل داستانوی اثرات سے باہر آتے ہوئے ۱۸۵۱ء میں مطبع مصدر لنوادر، آگرہ نے "دھرم سنگھ کا قصہ" شائع کیا۔ ۱۸۵۲ء میں اسی مطبع نے "سورج پور کی کہانی" شائع کی۔ جدید تقاضے کے مطابق نذیر احمد نے بھی کہانی کی جانب رغبت دکھلائی جس میں وہ بھرپور کامیاب ہوئے۔ مراۃ العروس کے دیباچے میں نذیر احمد لکھتے ہیں کہ:

"اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جب انہیں حسب منشا کوئی ایسی کتاب
نہ ملی جو اخلاق ونصائح سے معمور ہو اور ان معاملات کو بیان کرتی ہو جو
عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور
جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج ومصیبت رہا کرتی ہیں
اور جس کے پڑھنے سے ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کے
عادات کی تہذیب ہو اور جس کا پیرایہ ایسا دلچسپ ہو کہ ان کا دل نہ
اکتائے۔"۳۴

مختصر کہ نذیر احمد نے یہ ناول عورتوں کے فائدے کے لئے لکھا ہے جس میں ایک شریف خاندان کا فرضی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں شرفاء کی زبان بیان کی گئی ہے۔ واقعات اس انداز

میں بیان کئے گئے ہیں جو سسرال میں ہونے والے حالات اور واقعات کا پیش خیمہ ہے۔عورتوں کے طور طریق کا بیان ہے۔

بنات النعش: نذیر احمد کی یہ تصنیف بنات النعش پہلے ناول مراۃ العروس کی تکمیلہ ہے۔ پہلے ناول میں خانہ داری، لڑکیوں کی تعلیم اور ان کے بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جبکہ بنات النعش میں ایک جیتی جاگتی کردار حسن آرا کی ایسی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے کہ وہ سماج کے لئے ایک مثالی عورت بن کر ابھرتی ہے۔مراۃ العروس والی اصغری بیگم عورتوں کی تعلیم و اصلاح کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے اور معاشرے کی بگڑی لڑکیوں کو سدھارنے کا کام کرتی ہے۔اس میں حسن آرا بھی ہوتی یں بہت ہی زیادہ شرارتی اور بد دماغ ہوتی ہیں مگر اصغری بیگم کی تعلیم و تربیت سے یہ بچے تہذیب کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔اس طرح مراۃ العروس بگڑے گھرانوں کو سنوارنے کا کام کرتی ہے تو بنات النعش اس کے تصورات کو عملی جامہ پہناتی ہے۔اس طرح اس عہد میں لڑکیوں کی اصلاح کا کام اس انداز میں ہوتا تھا۔رشید النسا ایک ناول نگار ہیں انہوں نے ۱۸۸۱ء میں اصلاح النساء کے نام سے اصلاحی ناول لکھا ہے جس میں انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ''نذیر احمد کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک انہیں معلوم تھا انہوں نے لکھا اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو انشا اللہ تعالیٰ لکھیں گے۔''اس طرح نذیر احمد نے اس ناول کے ذریعہ عورتوں میں عورتوں کے کردار کے ذریعے اصلاح کا پہلو تلاش کیا اور اس میں معلومات عام کا ایک دریا بہا دیا ہے۔یہ کتاب قصے اور کہانیوں کے ذریعہ آگے ضرور بڑھتی ہے لیکن قصے سے کہیں زیادہ علمی کتاب کا احساس ہوتا ہے۔

توبتہ النصوح: نذیر احمد کے ابتدائی ناولوں میں فن پر گرفت کمزور تھی لیکن ''توبتہ النصوح'' میں ارتقائی عمل کا احساس ہوتا ہے۔ابتدائی ناولوں کے مقابلے میں اس ناول کے فنی اسلوب اور طور طریق بہت نمایاں ہیں۔اسی وجہ سے عرصے کے بعد مختلف ناقدوں نے اس تصنیف کو نمائندہ ناول قرار دیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس میں کچھ کچھ تکنیک کی خرابی پائی جاتی ہے لیکن یہ خرابی تقریباً ہر ناول میں پائی جاتی ہے۔اس ناول کے مقصدیت پر زور دیتے ہوئے بڑے پر جوش انداز میں لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا مذکور ہے جو تربیت اولاد کے

نام سے مشہور ہے۔اس کتاب کے تصنیف کرنے سے مقصود اصلی یہ
ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع ہو رہی
ہیں اس کی اصلاح ہو اور ان کے ذہن نشین کرادیا جائے کہ تربیت
اولاد صرف اسی کا نام نہیں کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا۔......بلکہ
ان کے اخلاق کے تہذیب،ان کے مزاج کی اصلاح، ان کے
عادات کی درستی،ان کے خیالات اور متضات کی تصیح بھی ماں باپ پر
فرض ہے۔'' ۳۵

بچوں کی اصلاح اور تربیت کم سنی میں کی جاتی ہے لیکن جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو اس وقت اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔اس ناول میں نذیر احمد نے اس سماج کے افراد کو بیان کیا ہے جو ایک طول عمر گذر جانے کے بعد اولاد کی تعلیمی، مذہبی،اخلاقی اصلاح کی غرض سے متوجہ ہوتے ہیں لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملتی ہے۔اولاد میں جو اس وقت تک مغربی تہذیب وتمدن کے رنگ میں رنگ چکے تھے لڑکی کسی طرح راہ راست پر آجاتی ہے لیکن لڑکا ٹھوکریں کھا کر مر جاتا ہے۔ اس ناول میں کئی کردار ہیں جن میں نصوح،کلیم،نعیم ہے۔نصوح کلیم اور نعیم کا باپ ہے نصوح اپنے بچوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں بچے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یہی کشمکش اس ناول کا موضوع ہے۔نصوح مرکزی کردار میں ہے۔نعیمہ وقت اور حالات کے تحت راہ راست پر آجاتی ہے لیکن کلیم پر لاکھ کوششیں کرنے کے باوجود بھی وہ راہ راست پر نہیں آتا بلکہ نصوح کو اس کے تئیں محرومی اور مایوسی کا احساس ہوتا ہے جبکہ قاری نصوح کے لئے ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور اس بات کی طرف بھی دھیان جاتا ہے کہ اگر بچپن میں ہی ان کی تربیت کی جاتی تو بڑح ہونے کی صورت میں اتنا نہیں بگڑتا جتنا کہ وہ بگڑ چکا ہے۔کلیم اپنی زندگی سے ہار چکا ہے اور بستر مرگ پر پچھتاوے کا عمل ہے۔کلیم یوں لب کشا ہوتا ہے۔

''غالباً میری زندگی دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت ہوگئی، گو اپنی زندگی
سے میں خود مستفید نہیں ہوا لیکن اگر دوسروں کو کچھ نفع پہنچے تو میں ایسی
زندگی کو رائیگاں اور عبث نہیں کہہ سکتا۔'' ۳۶

اس طرح اس ناول کے ذریعے نذیر احمد نے اصلاحی خیالات کو موضوع بنایا اور داستانوی

اثرات سے انحراف کرتے ہوئے نئی سوچ اور فکر کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھایا جو ایک مستحسن بات ہے۔ جمیل جالبی اس ناول ''توبتہ النصوح'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''توبتہ النصوح میں نذیر احمد کے مقاصد اور تمام موجود رجحانات نے ایک تخیلی صورت اختیار کر لی ہے اور اسی لئے یہ تصنیف فن کے اعتبار سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ نذیر احمد کی دوسری تخیلی تصانیف جو اس سے پہلے اور اس کے بعد لکھی گئیں ان میں وہ قوت، وہ توانائی محسوس نہیں ہوتی جو توبتہ النصوح میں محسوس ہوتی ہے۔ دلّی کی زندگی کے واقعاتی نقشے اور ظاہر دار بیگ جیسے زندہ تجسم (Personification) اسے دوام بخشتے ہیں۔ اس میں ایسا ربط، ایسا تسلسل ہے، اس کا اندازِ بیان اور مکالمے ایسے ڈرامائی، جان دار اور برمحل ہیں اور اس کی ہئیت اس قدر چست ہے کہ آج بھی وہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ توبتہ النصوح ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔''۳۷

اس طرح نذیر احمد نے توبتہ النصوح ناول تحریر کر کے قارئین کی نظروں میں ہیرو ثابت ہوئے کیونکہ اس میں جیتے جاگتے سماج کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں ''ابن الوقت'' کافی اہم ناول ہے۔ اس ناول کے ذریعہ سرسید احمد خاں کی جھلک نظر آتی ہے جو بے حد کامیاب ناول ہے۔ اس کے علاوہ ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' وغیرہ بھی اہم ناول ہیں جس میں سماجی مسائل اور اس کے حقائق کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

نواب محسن الملک:

سرسید کے عزیز ترین دوستوں میں محسن الملک (۱۹۰۷۔ ۱۸۳۷ء) بھی تھے۔ ان کی ولادت اٹاوہ کے مہذب گھرانے میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کے ماہر عالم تھے۔ ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری پڑی تھی۔ زبان و ادب پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ انگریزی ملازمت کے ذریعے بہت آگے بڑھے۔ سب سے پہلے سررشتہ دار مقرر ہوئے پھر تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سرسید کی رفاقت اور سفارش کی بدولت سر سالار جنگ نے ان کو حیدر آباد مدعو کیا اور ان کی وفات کے

بعد وطن واپسی پر آمادہ تھے لیکن مسٹر ڈبلیو بی۔ جونس، ریذیڈینٹ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہوکر ان کو۱۸۸۴ء میں میر لائق علی منصب وزارت پر فائز تھے تو اس کے ذریعے انہوں نے ایک نیا محکمہ پولیٹیکل وفنانس قائم کیا اس میں میر مہدی علی جو محسن الملک کا اصلی نام ہے اس کو معتمد کے عہدے پر فائز کیا۔ اس عہدے پر رہ کر میر مہدی نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ اس کے کام کے طریق کار سے خوش ہوکر انگریزی حکام نے ۱۸۸۷ء میں نظام نے محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب عطا کیا۔ بعد میں میر مہدی علی نے اس ٹائٹل کو اپنے لئے مختص کیا اور ہمیشہ محسن الملک ہی لکھنے لگے۔

محسن الملک کی ملاقات سرسید سے۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی دور میں سرسید کے مذہبی افکار سے مخالفت کرتے تھے لیکن بعد میں ان کے تعلیمی مشن اور ''تبئیین الکلام'' کے زیر مطالعہ ذہن صاف ہوگیا۔ سرسید کے بے حد قریب ہوگئے۔ ان دونوں کے متعلق باہمی تعلقات کے حوالہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید ان کو ہمیشہ اپنا ہردلعزیز جانتے تھے اور لحمک لحمی، محبوب وغیرہ جیسے القاب سے نوازتے تھے۔ محسن الملک ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں پہلے پہل آپ سے علی گڑھ میں ملا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت آپ کے خیالات اور ارادوں پر بحث ہوئی تھی۔ آج اس دن کو قریب قریب پچیس برس ہونے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس زمانے میں، میں آپ کا مخالف تھا اور اس تعلیم کے معاملے میں آپ کے ارادوں کی بلند پروازیاں سن سن کر بہت ہنستا تھا اس وجہ سے کہ مجھے معلوم تھا کہ جس قوم کی بہبودی اور ترقی کے لئے آپ فکر کر رہے ہیں وہ سستی اور لاپرواہی کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔''[۳۸]

سرسید کی تحریروں اور ان کے افکار ونظریات کو جب انہوں نے دیکھا، پرکھا اور ان کے مشن کے تئیں دلچسپی نے محسن الملک کو سرسید کے قریب کر دیا۔ اور وہ ان کے زبردست حامی اور مددگار ثابت ہوئے۔ اس طرح سرسید سے جوڑنے کے بعد محسن الملک نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے بہت ساری کتابوں کے ترجمے کئے۔ ''خطبات احمدیہ'' کی تالیف کے دوران انہوں نے اس کتاب میں بہت مدد کی۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے مشن کے متعلق بہت کچھ لکھا اور اردو زبان و

ادب کے بیش بہا مضامین تحریر کئے اور ان مضامین نے لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کئے۔ کیونکہ ان کے مضامین بہت اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے۔ جہاں تک ان کی تصانیف کی بات ہے تو وہ تصانیف سرسید کے دیگر رفقا کے مدمقابل اس کے لائق نہیں ہیں بلکہ ان سے کمتر ہیں۔ ان کی تصانیف میں مضامین تہذیب الاخلاق، تقلید عمل بالحدیث، مسلمانوں کی تہذیب، آیات بینات، مکمل مجموعہ لیکچرز، کتاب المحبت وشوق مکاتیب وغیرہ اہم ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو سب سے اہم اور قابل ذکر ہے وہ ان کے خطوط کے مجموعے ''مکاتب الخلاق'' ہے۔ اس میں انہوں نے جتنے بھی خط سرسید اور ان کے دیگر احباب کے نام لکھے اس میں دستیاب ہیں۔ وہ خطوط ان کے عہد کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے ان کی زبان بہت صاف ستھری ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زبان و بیان پر خوب مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ قدیم روایات اور منقولات کا بھرپور سہارا لیتے ہیں اور اس سے خوب استفادہ کرتے ہیں۔

مولوی چراغ علی:

مولوی چراغ علی (۱۸۹۵۔۱۸۴۴ء) کا تعلق کشمیری نسل سے تھا۔ سرسید سے ان کے مراسم بہت اچھے تھے۔ ان کا انداز مناظرہ کا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی سے ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں والد مولوی محمد بخش کا انتقال میرٹھ میں ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد تعلیم کوئی خاص نہ ہوئی۔ البتہ انگریزی ملازمت ملنے کے بعد حیدرآباد میں بہتر ملازمت مل گئی۔ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے معتمدی مالگزاری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جہاں تک ان کی تصانیف کا تعلق ہے تو انہوں نے بہت ساری کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں تعلیقات، قدیم قوموں کی تاریخ، اسلام کی دینوی برکتیں، بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ، تعلیقات نیاز نامہ وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے ان کی پہچان تو نہیں بنی لیکن ان کتابوں۔ یہ کتابیں قدیم طرز زندگی کو ابھارتی ہیں اور جدید تقاضے کا مطالبہ میں اس عہد کے حالات ضرور نظر آتے ہیں بھی کرتی ہیں۔ ان کی یہ کتابیں زیادہ تر اسلامیات پر مبنی ہیں۔ ملک کے اندر ۱۸۵۷ء کے حالات کے بعد جس طرح کا ماحول پنپا۔ اس سے اسلام مخالف زیادہ ابھرے، اسلام میں جرائم کی حدود وتعزیرات، اسلامی غزوات میں غلاموں اور کنیزوں سے متعلق احکام، اقوام وملل کے قصے اور ان کی تفصیلات کو بڑی وضاحت کے

ساتھ مدلل انداز میں چراغ علی نے جواب دیا ہے۔ چراغ علی نے اپنی ان تمام تصانیف میں اسلام کی اصل تصویر، اس کے قوانین اور دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی فوقیت اور اس کی عظمت کا اعتراف کروایا ہے۔

تعلیقات: مولوی چراغ علی کی تصانیف میں سب سے بہتر اور اہم کتاب ہے۔ان کی پہلی تصنیف ''ردشہادت قرآن بر کتب ربان'' ہے۔ ''تعلیقات'' کی تصنیف ۱۸۷۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اس زمانے میں خاص طور پر۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہر چہار جانب اپنے عیسائی مبلغین کو تبلیغ کے کام پر زورشور سے لگا دیا۔ غیر مسلمین میں سے اکثر و بیشتر مفادات کی آڑ میں عیسائی ہورہے تھے۔ مسلمانوں میں بھی اس طرح کے حالات دیکھنے اور سننے میں آتے تھے۔ دلّی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر کی مثال خود سامنے ہے۔ جو اہل علم تھے تو جو اہل علم میں سے نہ تھے ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ماسٹر رام چندر کے ساتھ ساتھ عمادالدین نے بھی عیسائیت قبول کرلی تھی اور ان کی تبلیغ کے لئے انہوں نے ''تاریخ محمدیؐ لکھ کر اسلام اور حضرت محمدؐ کے خلاف الگ الگ باتیں لکھیں۔ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں میں غم و غصے کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ مولوی چراغ علی نے بھی اس کتاب کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیا۔ جس طرح سرسید نے ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب دینے کے لئے لندن کا سفر کیا۔ اسی طرح چراغ علی نے بھی اس کتاب کا منہ توڑ جواب اور دفاع دین دیا۔ اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت محمدؐ کی سیرت طیبہ کو بیان کیا ہے اور اس کے اعتراضات کو بہتر انداز میں مدلل طریقے سے تاریخی حقائق کی روشنی میں جواب دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں حدیث، فن حدیث، اقسام حدیث اور محدثین کا کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تمہید میں مولوی چراغ علی لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے کئی کتابیں جو انگلستان کے فاضلوں نے جنات خاتم المرسلین وافضل النبین کی سیرت کے بیان میں مفصل یا مختصر طور پر لکھی دیکھیں اور ہر ایک کی ماہیت پر کماہی اطلاع اور آگاہی حاصل کی۔ ہرچند کہ بقول ماڈرس (صاحب مخزن تذکرات) جناب رسالت مآب کی سیرت کی کتابیں اختراعات اور مبالغوں سے بھری

> ہوئی ہیں اور ان کے پیروؤں کی طرف سے بنظر اظہار فضائل اور عیسائی مورخوں کی جانب سے مختصر اور بدنامی کی غرض سے بہت جھوٹی باتیں اختراہوئی ہیں۔ (مانڈرس ٹریزری آف بیا گرافی ۱۸۶۶ء) تاہم چند اقوال انگلستان کے علماء باانصاف وفضلاء تارکان اعتراف کے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ ان اقوال کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ صاف باطن، حق پرست اور انصاف دوست مصنفوں کی رائے اور امر حق کا ظہور اس طور پر ہوتا ہے کہ پادری عمادالدین کے مانند متعصب، ناحق کوش، انصاف دشمن، کج بخت، مولف کا طرز حد ادب حق شناسی کے خلاف تھا۔'' ۳۹؎

اس طرح مولوی چراغ علی نے اپنی تصانیف کے ذریعے اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو معترضین کے جواب میں مدلل انداز میں دیا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''بشارت شیل موسیٰ، رسالہ دوم مجموعہ روایات استرقاق وتسری، رسالہ سوم تدبیر الاسلام فی تحریر الامہ و الغلام، رسالہ چہارم تحقیق مسئلہ تعداد زوجات اور انگریزی میں Proposed Politicals, legal and Social Reforms under Muslim Rule" جس کا ترجمہ مولوی عبدالحق نے ''اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام'' کیا ہے اس کے علاوہ حیدرآباد انڈر سر سالار جنگ انگریزی کتاب "Critical Exposition of the Popul Jihad" جس کا ترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے ''تحقیق الجہاد'' کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ان کی کتابیں ہیں۔ ان تمام کتابوں میں نمایاں خیالات ہیں جو سرسید کے طریق کار پر ہیں۔ ان کی تحریروں میں سرسید کی جھلک بدرجہ اتم موجود ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں سادگی، سلاست اور صاف ستھری زبان ہے۔ ان تمام تصانیف میں اس عہد کی مکمل تہذیب و ثقافت کا عکس نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مولوی چراغ علی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''قصہ کوتاہ، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے دراصل سید صاحب ہی کے عقائد اور خیالات کی تبلیغ کی اور ان عقائد کو اس زور سے پھیلایا کہ آہستہ آہستہ یہی خیالات غیر محسوس طور پر سب لوگوں کے عقائد کا جزو

بن گئے۔ چنانچہ آج بے شمار لوگ سید صاحب سے اختلاف رکھنے کے
باوجود کہتے اور مانتے وہی ہیں جو سید صاحب،نواب محسن الملک،اور
مولوی چراغ علی کہتے اور مانتے تھے۔''[۴۰]

مولوی ذکاءاللہ:

سرسید کے رفقاء میں مولوی ذکاءاللہ (۱۹۱۰۔۱۸۳۲ء) کا نام بھی کافی اہم ہے۔ دلّی کالج کے احباب آزاد،نذیر،محسن الملک وغیرہ کے ہمراہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اسی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔اس کے بعد آگرہ کالج میں اردو اور فارسی کے معلم رہے۔آپ کی انگریزی بہت اچھی تھی۔انگریز حکمراں کے ساتھ تعلقات بہتر تھے۔تیاری کے بعد بلند شہر میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔۱۸۷۲ء میں لاہور کالج میں پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا ہی تھا کہ میور کالج،الہ آباد میں بھی عربی و فارسی کے پروفیسر کا عہدہ ملا۔اس کو ترجیح دی اور اخیر عمر تک اس کالج سے جڑے رہے۔ علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی ابتداء ہی سے تھی۔قلم میں روانی تھی۔تہذیب الاخلاق کے مستقل مقالہ نگار تھے۔اس میں ان کے مضامین بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے کیونکہ ان کا علم بہت وسیع تھا۔ ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتے تھے۔ دنیا پر گہری نظر تھی اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں بھی وہ چیزیں دکھائی دیتی تھیں جس سے دور اندیش اور مستقبل شناس تھے۔اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ان کی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔انہوں نے اردو زبان وادب کی خوب آبیاری کی ہے۔ریاضیات،تاریخ،جغرافیہ،ادب،اخلاقیات،سیاسی موضوعات کو سپرد قلم کیا ہے۔ان کی تصانیف کی تعداد ۱۴۳ کے قریب ہے۔یہ بات سچ ہے کہ مولوی ذکاءاللہ نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان میں وہ چمک اور رمق نہ کے برابر ہے،ورنہ حالی اور شبلی کے مدمقابل آنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بہرحال ہر ادیب وشاعر کا اپنا انداز واسلوب ہوتا ہے جس سے کہ ان کی پہچان بنتی ہے۔کوئی کم لکھ کر اپنی پہچان بنا لیتا ہے اور کچھ لوگ بہت زیادہ لکھ کر بھی پہچان نہیں بنا پاتے ہیں۔مولوی ذکاءاللہ کی پہچان ان کی ریاضی،تاریخ نگاری کی وجہ سے ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

''مولوی ذکاءاللہ کا بیشتر کام مدرسانہ ہے۔کچھ کام ترجمہ کا ہے اس

> زمانے کے عام افکار سے بھی وہ متاثر تھے مگر اوریجنل فکر اور تصنیف
> میں وہ اپنے ممتاز معاصرین مثلاً حالی اور شبلی، نذیر احمد وغیرہ سے فروتر
> ثابت ہوئے ہیں۔مقالات میں قومی، معاشی اور علمی مجلس سب
> موضوعوں پر خامہ فرسائی کی ہے مگر ان کے تمام تصنیفی کاموں میں افکار
> عالی، چمک اور روشنی بہت کم ہے بس زیادہ لکھنے والے لوگوں میں سے
> ہیں ان کی نگارشات کے بہت بڑے موضوع جو ان کے لئے وجہ امتیاز
> ہیں۔ایک ریاضیات، دوم تاریخ ریاضی کی کتابیں درسی ہیں۔''[۱۴]

ان کی کتابوں کی فہرست جن میں آئینہ قیصری، فلسفہ امثال و منتخب الامثال، اقبال نامہ اکبری، مبادی الانشاء، محاسن الاخلاق، مکارم الاخلاق، مسلمان اور سائنس، ریاضیات، رسالہ مجلس مناظرہ، سوانح عمری ملکہ معظّمہ وکٹوریہ با قیصر ہند اور پرنس کونسورٹ البرٹ، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، تاریخ ہندوستان دس جلد وغیرہ کتابیں اہم ہیں۔

تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان: مولوی ذکاء اللہ کی یہ کتاب بہت اہم ہے۔یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں اسلامی تاریخ کو موضوع بنایا ہے۔اس کی ہر جلد اپنے آپ میں ایک تاریخ بیان کرتی ہے۔جلد اول مسلمانوں کے عہد سلطنت کی تاریخ پیش کرتی ہے۔اس جلد میں مسلمانوں کے تاریخی علم و ادب، بیہقی، ضیاء الدین برقی، محمد ابن فاوند شاہ ابن خلدون کے علاوہ مغربی تاریخ داں جن میں لارڈ بیکن، ہیگل جرمنی، پکلر، کارلائل، لنگڑ جیفری وغیرہ کی تاریخ نگاری کے حوالہ سے ان کے خیالات اور تاریخی افکار پر روشنی فرداً فرداً ڈالی ہے۔اس کے بعد عرب کے حالات زمانہ جاہلیت کے عہد سے لے کر خلفائے راشدین، بنوامیہ، بنوعباسیہ، سلجوقی سلطنت عثمانیہ، مغل حکمراں کی تاریخ بیان کی ہے۔اس میں واقعاتی فہرست زیادہ ہے۔اس اعتبار سے تاریخ ہندوستان جو دس جلدوں پر مشتمل ہے اس میں ہر جلد کی اپنی خصوصیات ہیں جبکہ سید عبداللہ کے نزدیک اس تاریخ کی اپنی پہچان ''تہذیب انسانی کی تاریخ'' ہونی چاہئے تھی۔مولوی ذکا اللہ اپنی کتاب تاریخ ہندوستان کی پہلی جلد کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''کسی نسل و قوم انسانی کو یہ قوت حاصل نہیں ہوئی جب تک اس کی
> عقل و دانش و فرزانگی و زیرکی میں پختگی نہ آئی ہو۔اب یہ قوت تربیت و

تعلیم وتہذیب انسانی کا نتیجہ ہے۔مختلف قوموں میں ایسی نظم نے جو
تاریخ سے قرابت قریبہ رکھتی ہے ایک عجیب وغریب خوبی پہلے اس
سے پیدا کی ہے کہ کوئی ذلیل سے ذلیل تاریخ بھی ان کے پاس ہو۔
ہندوستان میں ہندوؤں کو رامائین اور مہا بھارت پر فخر و ناز ہے
مگر تاریخی علم ان کے پاس موجود نہیں۔یونان میں ہومر شاعر پہلے
ہیروڈوٹس مورخ سے موجود ہے۔انگلستان میں شیکسپئر شاعر پہلے سے
موجود ہے کہ کوئی مورخ وہاں پیدا ہو۔غرض مورخوں سے پہلے شعرا
پیدا ہوتے ہیں چھوٹے قصوں،فسانوں وقافیہ سنجیوں کی زنجیروں سے
قدیمی قوموں کا پاؤں نہایت آہستہ آہستہ بتدریج نکلا ہے۔اور مصالح
تاریخی جو قوانین قدرت کے موافق ہو حاصل ہوا ہے۔دنیا میں تاریخ
نویسی چین وجاپان نے سب سے اول شروع کی ہے اور ان کا تاریخی
علم ادب بہت وسیع ہے اور قوموں نے بھی تاریخ نویسی کو شروع کیا
ہے مگر ہم کو صرف اپنی قوم کے تاریخی علم ادب بیان کرنے کی ضرورت
ہے۔اس لئے ہم فقط اہل عرب کی تاریخ نویسی کو ذکر کرتے ہیں اور
باقی سب کو ترک کرتے ہیں۔'' ۴۲

اس طرح تاریخ کے حوالے سے مولوی ذکاءاللہ نے مورخانہ رجحانات کو بیان کیا ہے جو اس عہد میں عام تاریخ نویسیوں کے نزدیک تھے۔انہوں نے مغربی تاریخ نویسوں کی پیروی نہیں کی بلکہ بذات خود اپنا طرز بنایا ہے۔جس سے ہندوستان کی تاریخ یا پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت آنے سے قبل دیگر ممالک میں ایران،افغانستان،عراق،عرب ممالک کی تاریخ نویسی پر ان کی نظر تھی،جس کو انہوں نے اپنی تمام جلدوں میں برتا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ مولوی ذکا اللہ نے تاریخ ہندوستان لکھ کر اہم کارنامہ انجام دیا ہے لیکن اس میں بہت ساری چیزیں جو ذہن کو قبول نہیں کرتی ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی اور کتاب کی تلخیص یا پھر ترجمہ ہے۔اسی طرح ان کی دوسری تصانیف بھی اسی زمرے کی ہیں جس میں اعلیٰ ادب اور معیاری افکار ونظریات کا فقدان نظر آتا ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی ذکاءاللہ کی تحریر اپنے وقت اور حالات کے پیش نظر تھی جس کی افادیت سے انکار نہیں۔ناقد کا کام نقص نکالنا ہے اور مصنف کا کام وقت کے اعتبار سے

کام کرنا ہے۔مولوی ذکا اللہ نے بھی یہی کیا۔جو اپنے عہد کی تاریخ،تہذیب اور قدیم رسم ورواج کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کی سوانح عمری جو دیگر انگریز حکمراں کے حوالے سے لکھی ہے وہ بھی اس زمانے کی بہترین عکاس ہے۔

۱۸۵۷ء کے آس پاس اور بھی بہت سارے اصناف وجود میں آئے اور لوگوں نے خوب لکھا۔ادیبوں اور مصنفوں نے بڑی دلچسپی کے تحت الگ الگ انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعے مختلف موضوعات پر تصانیف پیش کی ہیں۔امام بخش صہبائی نے ۱۸۶۶ء میں شعراء کا تذکرہ اردو زبان وادب میں ''انتخاب دواوین'' عبدالغفار نساخ نے ۱۸۶۴ء میں ''سخن الشعراء'' میں شعرا'امیر مینائی نے ۱۸۷۳ء میں ''انتخاب یادگار'' اور مولانا عبدالسلام ندوی نے ''شعرالہند'' وغیرہ تصانیف لکھی ہیں۔سفرناموں میں اردو ادب کا پہلا سفر نامہ ۱۸۷۴ء میں ''عجائب فرنگ'' کے نام سے یوسف خاں کمبل پوش نے لکھا۔اسی زمانے میں سید فدا حسین نے ''سفر نامہ کابل'' جعفر تھانیسری نے روم ومصر وشام ۱۸۹۳ء میں منظر عام پر آیا۔سوانح نگاری میں حالی اور شبلی سے پہلے مرزا حیرت دہلوی نے ''سوانح اکبری'' عبدالرزاق کانپوری نے ''البرامکہ'' منشی محمد دین فوق اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے مختلف انداز میں سوانح عمریاں لکھی ہیں۔مکتوب نگاری میں بھی ۱۸۵۷ء سے قبل تحریر آ چکی تھیں۔جس میں غالب ، سرسید، میر مہدی مجروح ،ذکاء اللہ، چراغ علی، حالی، شبلی ،نذیر احمد وغیرہ کے علاوہ نوابوں،امرا، ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کے مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔تراجم کے حوالہ سے بہت سارے اصناف اردو میں آئے ہیں۔مغربی ناولوں،افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔فورٹ ولیم کالج کے ذریعے آسان اور سہل کتابوں کے ترجمے آئے۔دلّی کالج کے ذریعہ ۱۸۲۵ء میں ورناکلر سوسائٹی کے تحت سائنس کی کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں ہوئے۔جس میں علم طبیعیات،تاریخ،فلسفہ اور قانون کی کتابوں کے ترجمے آسان اردو میں ہوئے۔۱۸۵۷ء کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کے تحت سرسید نے مغربی علوم وفنون کے ترجمے اردو میں کروائے ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے تحت ترجمہ کو عمل میں لایا گیا جن میں تاریخ،سوانح،جغرافیائی،علم طب،ادب اور فن موسیقی کی کتابوں کے خوب ترجمے ہوئے۔حالی اور آزاد،شبلی،مولوی ذکا اللہ اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے لاہور اور حیدر آباد میں ترجمے کا کام خوب کیا ہے۔اس کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، سر

عبدالقادر، نیاز فتحپوری، عبدالغفار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں نذیر احمد کے ناولوں کے بعد جن ناول نگاروں نے بڑی ترقی کی اور اردو ادب کو وسعت بخشی ان میں رتن ناتھ سرشار کے ناول جن میں ''فسانہ آزاد، جام سرشار، سیر کوہسار، کامنی، پی کہاں وغیرہ ناول ہیں۔ عبدالحکیم شرر نے تاریخی ناول لکھے ہیں۔ ان کے ناولوں میں خاص طور پر مسلمانوں کی قدیم زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ''فردوس بریں''، ''حسن کا ڈاکو''، منصور موہنا، زوال بغداد، حاجی بغلول، احمق الذی وغیرہ ناول ایسے ہیں جن میں لکھنوی تہذیب اور زبان و بیان بڑی شگفتگی کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ عظیم ناول نگاروں میں مرزا ہادی رسواء نے ''امراؤ جان ادا'' شریف زادہ، ذات شریف، علامہ راشدالخیری نے تاریخی ناولکھے ہیں جس میں مسلمانوں اور ملک کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے ناولوں میں ''صبح زندگی'' شام زندگی، ماہ عجم، عروس کربلا، شب زندگی وغیرہ ناول ملتے ہیں۔ اس طرح اور بھی ناول نگار ہیں جنہوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد بہت ساری کتابیں لکھی گئی جس میں انقلاب کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس انقلاب نے خصوصاً اردو نثر کو وسیع پیمانے پر بہت وسعت بخشی۔ ہر اصناف میں نئی تبدیلی کے ساتھ وجود میں آئی۔ ادیبوں نے تخلیق کاروں نے فراغ دلی کے ساتھ ان اصناف کو برتا اور اس میں زمانے کے حالات و اطوار کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ ادب کے پیرائے میں سمویا۔

بلاشبہ اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس میں اٹھارہ سوستاون کے حالات اور اس میں ہونے والے فسادات کو بڑی جامعیت کے ساتھ ادیبوں نے اس عہد کے تاریخی واقعات کو قلم بند کیا ہے جو اس کے مطالعہ کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ انہیں تاریخی کارناموں میں ایک کارنامہ دستاویزات کا ہے جو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں بیس ہزار سے زائد دستاویزات اردو اور فارسی زبان میں ۱۸۶۷ء کے سلسلے میں موجود ہیں۔ جنہیں Muntiny papers یعنی ''کاغذات غدر'' کے نام سے مشہور ہے۔ کاغذات غدر کی فہرست بھی چھپ چکی ہے جس میں عرضیوں، درخواستوں، احکام، رسیدوں، حاضری کے طوماروں، شکایتوں، معروضات، مردوں کی فہرست، فتح کی پیشین گوئیاں، وفاداری کے وعدوں، نامعتبر جواسیس کے نوٹس اور محبت کرنے والوں

کے بارے میں علحیدہ بکسوں میں بند ہیں۔ یہ تمام دستاویزات ''کاغذات غدر'' کے تحت اس لئے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے حالات اور واقعاتی شہادت کی شکل میں موجود ہے۔ ذاکر حسین اپنے مضمون ''نیشنل آرکائیوز کے'' کاغذات غدر: اجمالی جائزہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

> '' کاغذات غدر (Mutiny papers) کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی دوچند ہوجاتی ہے کہ پرسیول سپیر اور تلمیذ خالدون نے دہلی دربار شہریوں اور سپاہیوں کے نقطۂ نظر سے دہلی کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ خاص طور سے آخر الذکر نے ۱۸۵۷ء سے متعلق نیشنل آرکائیوز کے کاغذات کو استعمال کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سپاہیوں کو دہلی میں رہنا پڑا اور دہلی کے شہریوں سے رقم وصول کرنا پڑی۔ جس نے ہمیشہ ایک ایسے شہر میں نت نئے مسائل کو جنم دیا جو نا قابل رحم دشمن کی گرفت میں ہو۔ یہ صورت حال کچھ حد تک دہلی میں بھی تھی۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دستاویزاتی شہادت اس نظام پر مشتمل ہے جس میں عام حکومت قائم تھی مثلاً قرضوں کا لینا، فوجی انتظامات، غیر ملکی طاقتوں اور پڑوسی سرداروں سے روابط۔ مقامی اخبارات کے جنگ انگلستان و فارس (ایران) سے متعلق پیراگراف اوت مختلف اقسام کا کاغذات بھی ہیں۔......ان کاغذات غدر کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مجاہدین کے کورٹ آف ایڈمنسٹریشن کا ایک بارہ نکاتی پروگرام پیش کرتے ہیں جو کہ جدید ترین برطانوی جمہوری تصورات کا آئینہ دار تھا جسے ہم ہندوستان کا پہلا جمہوری دستور بھی قرار دے سکتے ہیں۔''۴۳

اس طرح ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے زیر اثر ہندوستانی دل و دماغ بیداری کی طرف گامزن ہوئے۔ دماغ روشن ہوا، ذہن نے نئی تبدیلی کی راہ ہموار کی۔ خیالات کی نئی اپج نے نئی بلندی کی جانب رہنمائی کی۔ غدر سے پہلے کے حالات اور غدر کے بعد کے حالات کا تقابلی مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ قدیم رسم و رواج نے نئی تہذیب و تمدن کی جانب پیش رفت کی۔ زبان و بیان کی فرسودہ روایات کو ختم کرتے ہوئے نئے قالب میں نئے انداز تحریر اور نئی سوچ و فکر نے آسان اور سہل زبان کا سہارا لیا۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

''اس کے بعد ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔
اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے ادب کے راہی قرار دیا
جاسکتا ہے۔جنہوں نے ادب کوقوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور
کیا۔ان کے خیال میں ایک ادیب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا
ہے۔ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں۔سرسید احمد خاں،
خواجہ الطاف حسین حالی،مولانا محمد حسین آزاد ڈاکٹر نذیر احمد،مولانا شبلی
،مولانا ذکا اللہ، چراغ علی،محسن الملک اور وقار الملک۔ان سب کا
عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہواوراس کے لئے فائدے
مند بھی ہو۔''۴۴؎

آج اردوادب کا پورا سرمایہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی نئی تبدیلی کے ساتھ رونما ہوئی اور دور دراز تک اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ان تمام ادبا اور شعرا کے خیالات اور افکار کے اردگرد ہی ہمارے عہد کے تمام ادبا،نقاد اور شعرا چکر لگا رہے ہیں۔ان ہی کی کوکھ سے نئی سوچ اور فکر کے پروردہ افراد پیدا ہو رہے ہیں۔یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان وادب میں نئے آنے والے سرسید اور ان کے نامور رفقا کے احسانوں تلے ہی ان کی تخلیق،تنقید ابھر کر سامنے آئے گی۔

حواشی

۱۔	مرحوم دلّی کالج	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند	ص۔۷۱
۲۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	ص۔۱۸۲
۳۔	عود ہندی	مرزا غالب	مطبع نول کشور لکھنؤ	ص۔۹۵
۴۔	مرزا غالب	ڈاکٹر نتالیہ پری گارنیا مترجم اسامہ فاروق	ادارہ ادبیات اردو	ص۔۳۰۷
۵۔	خطوط غالب جلد اول	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی	ص۔۱۸۱
۶۔	خطوط غالب جلد اول	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی	ص۔۶۸۔۲۶۷
۷۔	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیورو دہلی	ص۔۶۳۔۶۲
۸۔	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیورو دہلی	ص۔۹۳
۹۔	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیوروڈ دہلی	ص۔۱۰۲
۱۰۔	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	ص۔۷۹
۱۱۔	اسباب بغاوت ہند	سرسید احمد خاں	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	ص۔۸۷
۱۲۔	تاریخ سرکشی ضلع بجنور	سرسید/مرتب شرافت حسین مرزا	ندوۃ المصنفین	ص۔۴۸
۱۳۔	تاریخ سرکشی ضلع بجنور	سرسید احمد خاں مرتب شرافت حسین مرزا	ندوۃ المصنفین	ص۔۵۱
۱۴۔	مقالات سرسید حصہ دہم	سرسید احمد خاں		ص۔۱۲۰

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	صفحہ
۱۵۔	مقالات سرسید حصہ دہم	سرسید احمد خاں مرتب محمد اسمٰعیل پانی پتی		ص۔۱۱۴
۱۶۔	رسالہ اردو	شیخ چاند		ص۔۲۸
۱۷۔	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	ص۔۲۴۰
۱۸۔	یادگار غالب	خواجہ الطاف حسین حالی	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	ص۔٦
۱۹۔	سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا	ڈاکٹر سید عبداللہ	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ	ص۔۱۰۹
۲۰۔	مضمون یادگار غالب	رشید حسن خاں		ص۔۱۹
۲۱۔	جدید نظم حالی سے میرا جی تک	کوثر مظہری		ص۔۵٦
۲۲۔	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیورو دہلی	ص۔۳۸
۲۳۔	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیورو دہلی	ص۔۳۵
۲۴۔	المامون	شبلی نعمانی	ادریس المطابع دہلی	ص۔۴
۲۵۔	سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء	ڈاکٹر سید عبداللہ		ص۔۱٦۱
۲٦۔	الفاروق	شبلی نعمانی	مطبع مفید عام آگرہ	ص۔۱۱۵
۲۷۔	افادات مہدی	مہدی حسن افادی		ص۔۴۵
۲۸۔	سیرۃ انسان	شبلی نعمانی		ص۔۹۴
۲۹۔	سیرت النبی	شبلی نعمانی	مطبع معارف اعظم گڑھ	ص۔۲۱۳
۳۰۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو	ص۔۱۸۹
۳۱۔	محمد حسین آزاد	نندکشور وکرم	ترقی اردد بیورو دہلی	ص۔۴۰۔۳۹
۳۲۔	دیوان ذوق	محمد حسین آزاد		ص۔۳
۳۳۔	موعظہ حسنہ خطوط نذیر احمد	مرتب افتخار احمد صدیقی		ص۔۱۳۰
۳۴۔	مراۃ العروس	نذیر احمد	مطبع نول کشور لکھنؤ	ص۔۲

۳۵۔ توبۃ النصوح — نذیر احمد — ص۔۴

۳۶۔ توبۃ النصوح — نذیر احمد — ص۔۷۰

۳۷۔ تاریخ ادب اردو جلد چہارم حصہ دوم — جمیل جالبی — ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی — ص۔۱۱۵۱

۳۸۔ دستاویزات محسن الملک — مرتبہ پروفیسر اقبال حسین — سرسید اکیڈمی علی گڑھ — ص۔۱۱

۳۹۔ تعلیقات — مولوی چراغ علی — ص۔۲

۴۰۔ سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقاء — ڈاکٹر سید عبداللہ — ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ — ص۔۸۱

۴۱۔ سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقاء — ڈاکٹر سید عبداللہ — ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ — ص۔۱۹۶

۴۲۔ تاریخ ہندوستان — مولوی ذکاءاللہ — ص۔۳

۴۳۔ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی — ترتیب پروفیسر ارتضیٰ کریم — موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی — ص۔۱۹۶

۴۴۔ اردو ادب اور ۱۸۵۷ء — سید احتشام حسین — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان — ص۔۲۴۷

☆☆☆☆☆

Student Approval Form

Name of the Author	**BUSHRA GHAFOOR**
Department	Urdu
Degree	Ph.D.
University	University of Delhi
Guide	Dr. Mohd. Mohsin
Dissertation Title	**1857 KE GHADAR KI DASTAVEEZAAT AUR TASNEEFAAT KA ADABI JAIZAH**
Year of Award	2018

Agreement

1. I hereby certify that, if appropriate, I have obtained and attached hereto a written permission/statement from the owner(s) of each third party copyrighted matter to be included in my thesis/dissertation, allowing distribution as specified below.
2. I hereby grant to the university and its agents the non-exclusive license to archive and make accessible, under the conditions specified below, my thesis/dissertation, in whole or in part in all forms of media, now or hereafter known. I retain all other ownership rights to the copyright of the thesis/dissertation. I also retain the right to use in future works (such as articles or books) all or part of this thesis, dissertation, or project report.

Conditions :

1. Release the entire work for access worldwide	Yes
2. Release the entire work for 'My University' only for 1 Year 2 Year 3 Year and after this time release the work for access worldwide.	2 Years

3. Release the entire work for ‘My University’ only while at the same time releasing the	
following parts of the work (e.g. because other parts relate to publications) for worldwide access. a) Bibliographic details and Synopsis only. b) Bibliographic details, synopsis and the following chapters only. c) Preview/Table of Contents/24 page only.	Yes
4. View Only (No Downloads) (worldwide)	Yes

Signature of the Scholar

Signature and seal of the Guide

Place : ______________________

Date :________________________

۱۸۵۷ کے غدر کی دستاویزات اور تصنیفات کا ادبی جائزہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

(۲۰۱۳ تا ۲۰۱۸)

مقالہ نگار
بشریٰ غفور

نگراں
ڈاکٹر محمد محسن

شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

حاصل مطالعہ

مقالے کے اس آخری عنوان حاصلِ کلام کے اندر میں آپ سبھی حضرات کو مقالے کے سبھی ابواب سے مختصر طور پر روشناس کرانا چاہوں گی کہ پورے مقالے میں آزادی کے واقعات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

میرے مقالے کا تعلق آزادی سے متعلق واقعات، حالات اور اسباب سے ہے۔ جس میں آزادی کے سبھی واقعات پر میں نے اپنا اظہار خیال پیش کیا ہے۔ اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے۔

پہلے باب کا عنوان ''۱۸۵۷ء اور اردو'' ہے۔ اس باب میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے اردو ادب کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے کہ آزادی سے پہلے اردو کی کیا اہمیت تھی اور آزادی کے بعد اس کو کیسے فروغ حاصل ہوا۔ اس کو آزادی کے بعد کس طرح سے عام بول چال کی زبان قرار دیا گیا ہے۔

دراصل جنگ آزادی سے پہلے اردو کا زیادہ بول بالا نہیں تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی ادب کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ صرف سرکاری زبان تک ہی محدود تھی جس کو کچہری وغیرہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ملک ہندوستان پر انگریزوں کا بول بالا تھا اس لئے انگریزوں کے حکم کے بغیر کوئی بھی کام ہندوستانی عوام اپنی مرضی سے نہیں کرسکتا تھا۔ ہندوستانی افراد کو حق حاصل نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کے حکم کے بغیر کچھ کرسکیں یا کچھ بول سکیں نہ تو کسی کام کو کرنے کا حق تھا اور نہ ہی کچھ بولنے کا۔ ہندوستان کی حالت بے حد خستہ تھی۔ ایسے تباہ کن حالات سے چھٹکارا پانے اور انگریزوں کی غلامی سے رہائی حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی عوام نے آزادی حاصل کرنے کے لئے جنگ کی ابتداء کی اور اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے انہوں نے زبان وادب کا سہارا لیا۔ کہیں تحریکی

شکل میں تو کہیں اخبارات وتصانیف کو اردو زبان میں لکھ کر عوام کے سامنے پیش کیا۔لہذا ہندوستانی عوام کا خیال تھا کہ جو بات لکھ کر عوام کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے وہ بول کر نہیں کر سکتے کیونکہ پڑھ کر عوام جس بات کو سمجھ سکتی ہے وہ سن کر نہیں کر سکتی۔اس لئے جب عوام کسی بات کو سمجھے گی تب ہی اس بات کو حل کر سکتی ہے۔رفتہ رفتہ ہندوستانی عوام نے اردو زبان کے ذریعے ترقی حاصل کر لی اور آزادی کے بعد رفتہ رفتہ یہ زبان بھی عوام کی دلچسپی کا باعث بن گئی۔آزادی کے بعد سے لے کر آج تک جو شہرت اردو زبان کو حاصل ہے وہ کسی اور زبان کے زمرے میں نہیں آتی۔اسی لئے یہ زبان زیادہ تر افراد کی دلچسپی کا باعث بن گئی

اب میں آپ کو اپنے مقالے کے باب دوم سے روشناس کرانا چاہوں گی جس کا عنوان ہے۔''**اسباب بغاوت ہند**'' اس باب کے ذریعے میں آپ کو غدر کے دوران پیش آنے والے حالات واسباب سے واقفیت کرانا چاہوں گی کہ غدر کے زمانے میں ہندوستانی عوام کو انگریزوں سے کیسے لوہا لینا پڑا اور کون سی ایسی وجوہات تھیں جن کے سبب غدر کا آغاز ہوا۔جس کے سبب اس جنگ کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی قرار دیا گیا۔دراصل ہندوستانی عوام انگریزوں کے سوچ سے ناواقف تھے۔انگریزوں نے تجارت کی غرض سے دھیرے دھیرے ہندوستان میں آمد کی ابتدا کی اور پھر تجارت کے باعث ملک میں اپنا سکہ جمالیا جس کے نتیجے میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنایا۔انگریزوں کی گرفت میں رہتے ہوئے ہندوستانیوں کے دماغ میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا خیال آیا۔تو اس آزادی کی غرض کی خاطر ہندوستانیوں نے انگریزوں سے لوہا لینے کی بات اپنے دماغ میں بٹھالی اور جنگ کا اعلان کر دیا۔اس دوران چھوٹے بڑے بچے، بوڑھے، جوان سبھی عوام آزادی کی اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے گئے اورانہوں نے آزادی حاصل کرنے کی خاطر جنگ میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھا جس میں کافی تعداد میں انگریزی عوام اور ہندوستانیوں کے درمیان مارکاٹ کا سلسلہ کافی عرصے تک قائم رہا۔جہاں کچھ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور کچھ گھر سے بے گھر ہو گئے تو وہیں کچھ کی جانیں دیش کے نام پر شہید ہو گئی۔جن میں ٹیپو سلطان، بھگت سنگھ، بیراگی اونتی بائی لودھی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، نانا صاحب پیشوا، ویر عبدالحمید، بابو کنور سنگھ، بہادر شاہ ظفر، منگل پانڈے، مولوی احمد شاہ، عظیم اللہ خان، فقیر چند وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان

باتوں کا تذکرہ ہمارے محسن الملک سرسید احمد خان نے بھی اپنی مشہور تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اسباب بغاوت ہند کے ساتھ انہوں نے ان تمام محرکات کا تذکرہ اپنی دیگر مشہور تصانیف ''تاریخ سرکشی''،ضلع بجنور میں بھی کیا ہے۔

ہم کو سرسید احمد خاں کی اس خاصیت کو بھی نظر میں رکھنا از حد ضروری ہے کہ سرسید احمد خاں ایک مصلحت پسند انسان تھے جو مغلیہ سلطنت کے زوال کو بھانپ چکے تھے۔تو ایسے تباہ کن حالات کو جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ملک کو آزاد کرانے کے لئے انہوں نے انگریزی حکمراں کی تابع داری کرنے میں بھلائی سمجھی جس سے کہ انگریزوں سے پیار سے انتقام لیا جا سکے۔

کیونکہ زمانۂ سرسید کے دوران تمام تجارت کا کام خاصا اہم تھا جن میں فرانس، جرمنی، سوئڈن Swiden ڈینمارک اور برطانیہ وغیرہ ممالک خاصے اہم تھے۔مغل بادشاہ جہانگیر سے ملاقات کرنے کے لئے انگریز تاجر بے حد بے چین و بے قرار تھے لیکن جہانگیر نے دو سال بعد ہی ان کو ملنے کی اجازت دی۔

جہانگیر کے بعد اورنگ زیب جو بہت نرم دل رکھتے تھے اس نے انگریزوں کے خیالات کو بھانپ لیا اور پھر آپسی کشمکش کو پرکھنے کے بعد اورنگ زیب نے فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور ملک کو ان سے نجات دلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

اورنگ زیب کے بعد ۱۶۹۰ء میں انگریزوں کو دوبارہ سے ہندوستان میں تجارت کرنے کا موقع ملا۔اس کے بعد ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کے وصال کے بعد ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔

دوبارہ تجارت کے سلسلے میں انگریز دن بہ دن ہندوستان پر اپنا قبضہ جمانے لگے جس کے نتیجے میں انگریز دن بہ دن ہندوستان میں اپنی طاقت بڑھاتے رہے اور بادشاہوں کو دن بہ دن نذرانہ بھیجتے رہے بادشاہوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی رنگ رلیوں شراب و کباب اور عیش و عشرت میں مگن رہتے تھے۔موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزی عوام نے ہندوستان پر پوری طرح سے اپنا سکہ جما لیا اور روزمرہ ہندوستانیوں پر اپنا ظلم ڈھانے میں کامیاب رہتے جس کے نتیجے میں انگریزوں نے سب سے پہلے کلکتہ پر اپنا قبضہ جما لیا۔اسی دوران انگریزوں نے تین بڑی کمپنیوں کو ہندوستان پر قبضہ

کرنے کے لئے ایک کمپنی میں منظّم کیا جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام دیا گیا جو غدر کے زمانے تک سب سے مشہور و مقبول کمپنی تھی۔

۱۷۵۷ء میں مرشد آباد کے حاکم نواب سراج الدولہ نے انگریزوں سے خاصی جنگ کیں لیکن ان کے وزیر میر جعفر کی غداری سے وہ وہ جنگ ہار گئے۔ جبکہ سراج الدولہ کے پاس ۷۰ ہزار فوجی سپاہی تھے اور انگریز فوجیوں کی تعداد محض تین ہزار تھی۔ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک دہلی کی سلطنت پر تقریباً بارہ بادشاہوں کا تقرر ہوا۔ یہ وہ دور تھا جن میں بادشاہوں کی عیاش پرستی نے ان کو ڈبو دیا۔

اسباب بغاوت ہند میں ڈاکٹر فوق کریمی لکھتے ہیں:

> ''چاروں طرف بدامنی پھیل رہی تھی۔ شمالی ہند میں مرہٹوں کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی دوسری طرف جاٹ تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے جنوب، آگرہ اور دہلی کے درمیان آباد تھے۔ یہ بڑے جری، جفاکش تھے اور دہلی کی سڑکوں پر ان کی علمداری تھی۔ شاہ جہاں اور عالم گیر کے عہد میں ان لوگوں کی سرکشی کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے بظاہر جاٹوں کی سرکوبی ہو گئی تھی لیکن اس فتنے کا پورا استحصال نہ ہو سکا۔''

ان حالات کو دیکھتے ہوئے دوسری جانب انگریز ملک کی سازشوں اور حالات کا بھرپور جائزہ لے رہے تھے اور ملک کی عوام پر ان کی نظر ٹکی ہوئی تھی۔

ان سب کے بعد محمد شاہ مغل حکومت کا تخت نشین ہو گیا۔ اس کے دربار میں عریانی اور بے حیائی کا دور دورہ تھا۔ عوام عیش و عشرت کی زندگی میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ وہ اپنے دربار میں حسین اور بھرپور خوبصورت شہزادیوں کی عیاشی میں ملوث تھا اور چور ڈاکوؤں کا غلبہ ان کی حکومت میں تھا جس کے نتیجے میں سرکاری خزانے میں خرد برد کے الزام میں ان کو گرفتار کر لیا گیا۔

اسی دوران ۱۸۳۸ء میں نادر شاہ دہلی پر حملہ کرنے کی غرض سے باہر نکلا۔ غدر کے زمانے میں نادر شاہ کا نام بھی خاصا قابل ذکر ہے۔ قیام دہلی کے دوران دہلی میں نادر شاہ کے قتل کا چرچا عام ہو گیا تو اس افواہ کے پھیلتے ہی چاروں جانب قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا تھا جس میں نادر شاہ کی

فوج کو خاصا نقصان ہوا۔ ہزاروں فوجی قتل کردیئے گئے جب نادر شاہ اس بات سے باخبر ہوا کہ اس کے قتل کے چرچے چاروں طرف عام ہو چکے ہیں اور اس کی فوج گاجر مولی کی طرح کاٹی جارہی ہے تو وہ کھل کر عوام کے سامنے آیا اور عوام سے مقابلہ کرنے میدان میں نکل پڑا اور صبح سویرے نکل کر نیام سے تلوار نکال کر جنگ کا اعلان کردیا جس کے نتیجے میں نادر شاہ کی فوج کو خاصا جانی و مالی نقصان ہوا اور چاروں جانب تباہی کا بازار گرم ہو گیا جس سے جنگ نے اور زیادہ زور پکڑ لیا۔ صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک قتل کا سلسلہ جاری رہا جس کو نظام الملک کی منت اور التجا اور خاص جستجو کے بعد وہ قتل عام کو رکوانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کے نتیجے میں نادر شاہ دہلی سے خاصی ملکیت مثلاً ستر کروڑ روپے، دس ہزار گھوڑ اور تین سو ہاتھی لے کر روانہ ہو گیا جس سے دہلی کا خزانہ خالی ہو گیا اور تباہی و بربادی کا بازار اور زیادہ گرم ہو گیا۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد ان کے خاص مشیر احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر خاص نظر رکھی۔ نادر شاہ کے وصال کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نو مرتبہ دہلی کو حملہ کا نشانہ بنایا جس سے ملک کے حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے پوری دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے بعد شاہ ولی اللہ نے ملک کی خدمت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی جس کے لئے انہوں نے ملک کی امن اور فضا کو قائم کرنے کے لئے جی توڑ کوشش کی۔ انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ملک کے اندر دین پھیلانے اور آزادی حاصل کرنے کے ساتھ اپنا اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔

پھر ٹیپو سلطان کا دور قیام عمل میں آیا۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۹ء میں زبردست مقابلہ آرائی کے بعد شہید کردیا۔ کیونکہ میسور میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ انہوں نے انگریزوں کے ناپاک ارادوں کو بھانپ لیا تھا اور ان کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا جس سے ہندوستان کی باگ ڈور اور کمزور ہوتی گئی۔ اس وجہ سے انگریزوں نے ملک ہندوستان پر اپنا قبضہ اوزیادہ مضبوط کرلیا جس میں بنگال اور آسام پر بھی انگریزوں نے اپنا قبضہ جما لیا جس کو ڈاکٹر فوق کریمی نے اسباب بغاوت ہند کے مقدمے میں اس انداز میں بیان کیا ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

''دہلی میں چند میل کے فاصلے سے لے کر آگرہ تک اور میوات کے
حدود سے فیروز آباد اور شکوہ آباد تک سورج مل قابض ہو گیا تھا کسی کی
طاقت نہ تھی کہ مذہبی تائید کی تبلیغ آزادی کے ساتھ کرسکتا۔
انگریز، فرانسیسی اور ڈچ قوتیں ہندوستان کی سیاست پر اثر انداز ہو چکی
تھی، دکن میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزی حکومت قائم ہو
چکی تھی''

محض یہ کہ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کی ہمت وحوصلہ افزائی اور زیادہ بڑھ گئی جس سے وہ پوری طرح ملک پر قابض ہو گئے جس کے نتیجے میں انہوں نے بنگال، کرناٹک، میسور اور پنجاب، سندھ، اودھ وغیرہ جیسے اہم مقامات پر اپنا قبضہ کرلیا۔ دہلی میں جگہ جگہ جنگ کا غلبہ زور وشور سے جاری تھا اس لئے علما نے ملک کو آزاد کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں شاہ اسماعیل شہید، مولانا قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، مولانا فضل الحق خیر آبادی کے نام خاص قابل ذکر ہیں۔ ان سبھی حضرات نے آزادی کے لئے دل کھول کر جنگ لڑی۔

جب جاٹوں، مرہٹوں وغیرہ نے جنگ کا بازار گرم کر رکھا تھا تو ان سبھی حضران نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کیونکہ اسباب بغاوت ہند کے دوران سکھ قوم، افغانی قوم کی عورتوں کی عزت کے پیچھے پڑی تھی۔ ان کی جان و مال کو نقصان پہنچاتی ان کی عورتوں سے زبردستی زنا کرتے تھے ان تمام حالات کے سبب جنگ نے اور زیادہ زور پکڑا جس کا خاتمہ کرنے کے لئے علمائے دین نے خاصی اہم خدمات انجام دیں جن میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا نام خاصا قابل ذکر ہے جنہوں نے سکھوں کے خلاف آواز بلند کی اور انہوں نے پنجاب کے حکمراں رنجیت سنگھ کے خلاف علم بغاوت کا بیڑا اٹھایا۔

نتیجہ یہ کہ مجاہدین اور انگریزی عوام میں بغاوت کا سلسلہ اور بلند ہو گیا جو کہ ۱۸۵۲ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔

پھر بہادر شاہ ظفر کا دور حکمرانی آیا جن کو دیکھ کر یہ کہا گیا کہ اب ان کے بعد کسی کو ملک کا حکمراں تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس بات پر زیادہ دھیان دینے کی کوشش کی گئی کہ سبھی ہندوستانیوں

کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کو عام کرنے کا سلسلہ قائم کیا جائے۔

نتیجہ کے طور پر انگریزوں کی ظلم وزیادتی پر ہندوستانی کے دل میں آزادی کا جوش و ولولہ قائم کر دیا تھا جو لوگ مالی اعتبار سے کمزور تھے وہ اس ظلم کو سہن کر رہے تھے اور جن کے دلوں میں آزادی کی تڑپ جاری تھی وہ انتقام کا بدلہ لینے کی محنت ولگن سے جی توڑ کوشش کر رہے تھے۔ انگریز قوم بہت ہی چالاک تھی۔ وہ ملک کے کونے کونے پر نظر رکھتی، ہندو اور مسلمانوں کے خلاف آپسی پھوٹ ڈالنے کی مہم میں جٹی رہتی۔ اس لئے انہوں نے آپسی مذہبی اموری پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ابتدا کر دی۔ ایسے میں انہوں نے اسباب بغاوت ہند کو منظر عام پر لانے کے لئے جی توڑ محنت کی جس میں بیوہ عورتوں کی عزت کو بھی سر عام رکھا گیا تھا۔ اسی لئے بغاوت میں جگہ جگہ کبھی بہت زیادہ سختی ہوتی تو کہیں پر نرمی سے مسئلے کا حل کر لیا جاتا۔ ہندو اور مسلمان کی آپسی نفرت کی کشمکش کے سبب انگریز قوم ان پر خوب زیادہ ظلم وستم ڈھاتی محض ہ کہ انگریزوں کا مقابلہ مختلف جگہوں پر مختلف طبقے سے کیا جاتا۔ انگریزوں کی ظلم وزیادتیاں آپسی نفرت اور حسد کے سبب بغاوت نے اور زیادہ زور پکڑ لیا۔ نتیجہ یہ کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی باشندوں نے انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کر کے ہندوستان کی آزادی حاصل کر لی۔

بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہیت کے اعلان ہونے کے بعد ۱۳ رمئی ۱۸۵۷ء سے دہلی پر حملے کے بعد علی گڑھ، فیروز پور، روڑکی، شاہ جہان پور اور کان پور وغیرہ میں یہ بغاوت کی اس آگ نے طول پکڑ لیا۔

نانا صاحب نے کانپور کی باگ ڈور سنبھالی تو دوسری جانب رانی لکشمی بائی نے ۷رجون کو جھانسی کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ان سبھی باتوں سے یہ قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ مغلیہ سلطنت میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس سلطنت میں زوال آنا لازمی تھا۔

اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب وغیرہ نے ملک کے لئے جان و مال کی قربانی دی۔ ملک کو آزاد کرانے کے لئے نواب سراج الدولہ نے شاہ ولی اللہ کے نام سے ایک نئی تحریک کی ابتدا کی۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمانوں نے ایک جٹ ہو کر ملک کو آزاد کرانے میں دل و جان سے جی توڑ محبت کی اور ایک دن ان کو کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہندو مسلمان

نے جن تحریک کو جنم دیا ان میں ستیہ گرہ (ستیہ نمک گرہ) گول میز کانفرنس، جلیا نوالہ باغ کا قتل عام، آزاد ہند فوج، انقلاب زندہ باد، ریشمی رومال تحریک، جمیتہ اعلمائے ہند، خلافت تحریک، مسلم لیگ وغیرہ تحریک قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کو انگریزوں سے باہر نکال کر ملک کو آزاد کرانے میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء نے جو انگریزوں کے خلاف تحریک چلی وہ بلا آخر ۱۹۴۷ء میں آکر مکمل ہوئی۔ اور ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اس لئے اس باب میں اسباب بغاوت ہند سے لے کر آزادی جیسی اہم باتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

باب سوم کا عنوان ''**سیاسی کشمکش اور عوامی اضطراب**'' ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں انگریز مختلف طرح سے ہندوستانی عوام کو نظر انداز کرر ہے تھے کیونکہ اس زمانے میں انگریزوں کا بول بالا تھا اور انہوں نے ہندوستانی عوام کو اپنی گرفت میں قید کرر کھا تھا جس کے سبب فرنگی عوام ہندوستانی عوامکو ہر طرح کا جانی و مالی نقصان پہنچاتی۔

کیونکہ ۱۸ ویں صدی کی پہلی دہائی میں اورنگزیب کی وفات کے بعد ملک کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔ یہی مغل حکمراں کے زوال کی صدی تھی جس میں مغل سلطنت کے حکمراں ہمایوں، جلالالدین اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں وغیرہ نے ملک کی باگ ڈور کو سنبھالنے اور ملک کو ترقی کی راہ پر کامزن کرنے کے لئے خاص اہم خدمات انجام دیں کیونکہ اہ جہاں کے بعد ان کے بیٹوں میں تخت شاہی کے لئے آپسی کشمکش کی ابتدا ہوئی جس میں اورنگ زیب نے دارشکوہ اور شجاع الدولہ کو شکست دی اور ملک کی باگ ڈور اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ میں سنبھال لی اور اپنے والد شاہ جہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ اورنگ زیب علم فہم اور حساس دل، نیک انسان تھے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی درست ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی پوری زندگی سادگی اور نیکی میں گزاری۔ بقول ڈاکٹر تاراچند:

> ''اس کی ذاتی زندگی ایک نیک انسان کا نمونہ تھی وہ ان تمام برائیوں
> سے بری تھا جو ایشیا کے بادشاہوں اور شہزادوں میں عام طور سے پائی
> جاتی تھیں وہ سادگی کی زندگی بسر کرتا تھا۔''

انہوں نے اپنی زندگی قرآن مجید کی کتابت کر کے اور ٹوپیاں سی کر گزاری۔ جس کے لئے

ڈاکٹر تاراچند دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

''بادشاہت کے نظم ونسق کے بھری کاموں میں مشغولہونے کے باوجود
وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن کی نقل کرنے اورٹوپیاں
سینے کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔''

اورنگ زیب نے بڑی محنت و جفاکشی سے ملک کی باگ ڈور کوسنبھالا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی تجہیز وتکفین کا انتظام بھی پہلے ہی کردیا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اس کی وفات کے بعد ملک زوال آمادہ ہوگیا جو کہ مغلیہ سلطنت کا زوال تھا۔ یہیں سے مغل حکمراں کی آزمائشوں کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد زیادتر بادشاہوں نے ملک کی باگ ڈوڑ سنبھالی جو کہ عیاش پسند اورشراب وکباب میں مبتلا رہتے تھے جن کو اپنے عیش وآسائش کی فکر رہتی تھی اوررات دن رنگ رلیوں میں مبتلا رہتے جن میں عظیم الشان کے لڑکے فرخ سیر اور جہاندارشاہ خاصے قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں زیادہ تر بادشاہوں کا قتل عام ہوا جس سے ملک کی فضا بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور ملک میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کردیا جس سے انگریزوں کے پاؤں ملک ہندوستان میں جم گئے۔ قبائلی جماعتیں حکومت کی خلاف ورزی پراتر گئی تھی اوراورنگ زیب کے تمام ارمانوں کو پست کردیا گیا۔ اورنگ زیب کے وصال کے بعد ملک کی بنائی ہوئی فضاؤں کا خاتمہ کردیا گیا اورمرہٹوں نے بھی ملک پر دوبارہ اپنے قدم جما لیے جبکہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے درمیان مرہٹوں کا خاتمہ کردیا تھا اورکئی قلعہ کو فتح پر کرایا۔ ان کے انتقال کے بعد مرہٹوں نے دوبارہ ہندوستان پر اپنا سکہ جمالیا۔ وہ اپنی چال سے ملک کے کئی حصوں پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے دہلی کی آبادیوں کو بھی خوب لوٹا۔ کیونکہ مغلیہ سلطنت کے حکمران اپنی عیاشیوں میں بے پناہ ملوث تھے۔ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کرلیا تھا اورظلم وزیادتی کی آگ بڑھتی گئی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ آخرکار ۱۷۶۱ء میں افغانستان کا بادشاہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا جس نے مرہٹوں کو شکست دی اور دولاکھ سے زائد مرہٹے مارے گئے ان کے بعد ٹیپوسلطان کے دور کا قیام عمل میں آیا جس میں مرہٹوں نے انگریزوں کا بہت ساتھ دیا جس سے ۱۷۹۹ء میں ٹیپوسلطان کو بھی شہید کردیا گیا۔ پھر انگریزوں نے ملک پر اپنا قبضہ جمالیا کیونکہ انگریز حاکموں کا اصل مقصد تھا ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ان کا یہ منصوبہ زیادہ دن کامیاب نہ رہ سکا اور

ایک دن وہ ملک ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا کیونکہ ٹیپو سلطان بھی انگریزوں کے باغیانہ خیالات کو بہت جلدی سمجھ چکے تھے اس لئے انہوں نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مرہٹوں کے بعد جاٹوں نے بھی ملک ہندوستان پر اپنا قبضہ جمانا چاہا۔ ان کا اصل مقصد غریبوں کو پریشان کرنا تھا۔ ملک میں چاروں جانب قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ ہر طرف بدامنی کی فضا پھیلی ہوئی تھی۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد کسانوں کے ساتھ زیادتیاں اور ان کے کھیتوں سے لگان وصول کرنا ملک کے باغی حکمراں کا پیشہ تھا جس سے کہ حکومت کا بول بالا دوگنا زور پکڑنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ۳۱ر دسمبر ۱۸۰۲ء کو باجی راؤ نے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور انگریزوں نے جگہ جگہ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا جن میں قلعہ احمد نگر، برہان پور، بندیل کھنڈ وغیرہ خاصے قابل ذکر ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر سے یہ معلومات فراہم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں خاصا ردو بدل ہوا اور فتح حاصل کرنے کی تراکیب کو قدم بہ قدم تیزی سے انجام دیا جا رہا تھا۔ محض یہ کہ ملک کو آزاد کرانے میں بے حد ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستانی عوام کو خاصی قتل و غارت گری کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے اسباب میں عیسائیت کا دور بھی خاصا قابل ذکر ہے جس میں ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی مذہب کو اپنانے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جس کا تذکرہ سر سید احمد خاں نے اپنی مشہور تصنیف میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

> ''ہم یہ ذکر کرتے جاتے تھے کہ انگلستان کا بڑا پادری چاہتا ہے کہ ہندوستان کو دین مسیح میں داخل کرے جو لوگ خوشی سے اس کا دین قبول نہیں کرتے ان سے سختی کے ساتھ پیش آتا ہے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔''

جبکہ سر سید کا اہم مقصد تھا سوتوں کو جگانا سب کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنا، سوتی ہوئی مسلم قوم کو جگانا تھا۔ سر سید احمد خاں ایک محسن الملک انسان تھے جنہوں نے ہندو مسلمانوں میں کبھی بھید بھاؤ نہیں کیا انہوں نے ہندو مسلمانوں کو ہندوستان کی دو آنکھوں کی مانند قرار دیا۔ ہندوستان کی آپسی کشمکش اور ملک کو آزادی حاصل کرانے میں سر سید احمد خاں کا نام بھی خاصا قابل ذکر ہے۔

ان کے علاوہ ۱۸۵۷ء جنگ میں اردو اخبارات نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان اخبارات میں برطانوی نظام کے ظلم و زیادتیوں کو بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا جاتا تھا۔ اخبارات میں انگریزوں کے آنکھوں دیکھے مظالم کو بیان کیا گیا ہے جن میں سید الاخبار، آگرہ، سلطان الاخبار کلکتہ، عمدۃ الاخبار بمبئ اور بریلی خاصے قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ حبیب الاخبار بدایوں، خیر خواہ ہند، ترجمانِ شوق، تاریخ بغاوت ہند، آگرہ، سراج الاخبار اور اردو اخبار دہلی وغیرہ بھی آزادی ملک کی زندہ مثال ہیں۔اس طرح ۱۸۵۷ء سے جو تحریک چلی وہ ۱۹۴۷ء تک پوری ہوئی اور ملک انگریزوں کی غلامی سے مکمل طور پر آزاد ہوا۔

باب چہارم جس کا عنوان ''انتقامی جذبہ آزادی کی تڑپ'' ہے سے روشناس کرانا چاہوں گی جن میں ہم انگریزوں پر تبصرہ کریں گے کہ بغاوت کے لئے انگریز ہی ذمہ دار تھے اور ایسے تباہ کن حالات میں انگریزوں نے ہندوستانیوں سے کیسے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہندوستانیوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے کیسے لوہا لیا۔

دراصل اردو ادب کے ذریعے ہی ہماری قوم میں آپسی بھائی چارے کا جذبہ قائم ہوا۔ کیونکہ اس باب میں، میں یہ تذکرہ کرتی چلوں کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے پہلی جنگ نواب سراج الدولہ کے ساتھ ہوئی جس میں نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ برطانوی نظام میں عوام نے خوب مذہبی اور غیر مذہبی طور پر بغاوت کا احتجاج کیا۔

سبھی عوام ایک دوسرے سے نفرت کی گرفت میں مبتلا تھی۔ انگریزی حکومت ہندوستان کے خون کی پیاسی تھی چاروں جانب نفرت کا دور دورہ تھا۔نفرت کے لئے جو خاتمہ کا بیڑہ اٹھایا وہ اخبار نویسی کا دور تھا۔ابتدا ہی سے اخبار کا مزاج باغیانہ تھا۔ مار کاٹ اور لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ تھا اس لئے ان سبھی کڑوی باتوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک بعد بعد دیگر یا خبار کی اشاعت کا سلسلہ قائم رہا اور اخبار نویسی میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ خبر کے ذریعے ہندوستانی عوام انگریزوں کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو سکے۔اب مقالے کو آگے بڑھاتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہوں گی کہ اخبارات، دستاویزات وغیرہ کے لئے عوام نے قلمکے لئے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا چاہی۔

انگریزوں نے غدر سے پہلے اپنے اخبارات شائع کرائے جن میں ۱۷۸۰ء میں ہندوستان میں انگریزی میں سب سے پہلے انگریزی اخبار کی اشاعت ہوئی۔ یہ پہلا انگریزی اخبار انگریزوں کے ذریعے ہی شائع ہوا اس اخبار کے نکلنے سے عوام میں تھوڑا سلیقے کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد سال بعد ۱۸۲۲ء میں ہندوستان میں بھی اخبار نویسی کی ابتداء ہوئی جس کا تذکرہ محمد عتیق احمد نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''ہندوستانی اخبار نویسی کے ابتدائی دور ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء کا اگر جائزہ لیا جائے جو بڑی حد تک فارسی اور اردو اخبار نویسی کا دور تھا تو اس کی گہرائی میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف نفرت وعداوت کے بھڑکتے شعلے نظر آئیں گے اس کا عروج ۱۸۵۷ء کے اوائل کا زمانہ تھا جب کہ خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی اخباروں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے جذبات عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔''

اس اقتباس سے ہم یہ قیاس لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے آغاز سے ہی ہندوستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے تھے جن کا خاتمہ کرنے کے لئے ہندوستانی اخبارات نے انگریزوں پر نکتہ چینی کرنا شروع کردی۔ جس میں لکھنؤ اور کلکتہ کے اخبارات کا تذکرہ قابل غور ہے۔ صادق الاخبار، اردو اخبار، سراج الاخبار وغیرہ میں بھی غدر کے حالات کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ سراج الاخبار ایسا اخبار ہے جس کی اشاعت بہادر شاہ ظفر کے زمانے سے ہوئی۔

دہلی اردو اخبار، یہ اخبار، زمانہ غدر میں دہلی سے شائع ہوا اس کے بانی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر تھے۔

ہندوستانی اخبارات کو انگریز زیادہ پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ان میں انگریزوں کی مخالفت کھل کر کی جاتی تھی۔ محض یہ کہ دہلی اردو اخبار عوام کی آپسی بھید بھاؤ اور جنگ کو روکنے میں خاصا مددگار ومعین ثابت ہوا۔

صادق الاخبار: اس اخبار کی اشاعت ۲۰ / اپریل ۱۸۵۷ء سے ہوئی۔ اس اخبار میں بھی انگریزوں کی مخالفت کو کھل کر بیان کیا گیا تھا اس کا مقصد ہی انگریزوں کے ظالمانہ رویہ کو عوام کے

سامنے پیش کرنا تھا جس سے دور دور تک عوام انگریزوں کے ظلم سے روشناس ہو سکے جس سے کہ انگریزی حکومت اور ہندوستانیوں کے خلاف آگ بھڑکنا بند ہو جائے۔ نتیجہ یہ کہ یہ اخبار بھی انگریزوں کا دشمن ثابت ہوا۔نتیجہ یہ کہ ہندوستانیوں نے صحافت اخبارت اور دستاویزات کے ذریعے بھی ملک کو آزاد کرینے میں خاص محنت ولگن کے ساتھ آزادی کے کام کو بڑھاوا دیا۔جس کے سبب شہر دہلی میں اخبارات کو خاص مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

باب پنجم کا عنوان ''**ادبی تصانیف (۱۸۵۷ء کا ادبی، لسانی اور تہذیبی پہلو**'' ہے اس باب پر ہم ۱۸۵۷ء کے ادبی لسانی اور تہذیبی پہلو پر اظہار خیال کریں گے۔ دراصل ۱۸۵۷ء کی جنگ کا تعلق ہندو مسلمان کی آپسی سیاسی کشمکش کو قرار دیا جاتا ہے لیکن غدر کا اصل مقصد انگریزوں کا ہندوستان میں قیام کرنا اور ہندوستان پر قبضہ کرنا تھا۔ کیونکہ انگریزی قوم ہندوستانی قوم پر زبان وادب کے لحاظ سے پوری طرح مسلط تھی جس کے نتیجے میں انگریزوں نے تہذیبی تمدنی، ثقافتی غرض کہ ہر لحاظ سے ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔

اس لئے دوران غدر زبان وادب کے ساتھ ساتھ عوام مذہبی اعتبار سے بھی آپس میں تفریق کرتی تھی کیونکہ غدر کا اصلی سبب فرنگیوں کے ذریعے ہندوستانی عوام کے سارے حقوق چھین لینا تھا چاہے وہ مذہبی اعتبار سے ہوں، سائنسی اعتبار سے یا ادیب یا لسانی اعتبار سے ہوں۔ محض یہ کہ فرنگیوں کا اصل مقصد ہر طرح سے ہندوستانیوں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے اپنی غلامی کے شکنجے میں قید رکھنا تھا۔ لہذا بغاوت کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے تاریخ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ادبی اور لسانی پہلو کو سمجھنا از حد ضروری ہے۔ ویسے تو غدر کا اصلی سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں قیام کرنا تھا جس کے سبب ہندوستانی عوام میں بغاوت کا سماع اور زیادہ زور پکڑنے لگا۔ غدر کے دوران زیادہ اثر ہندوستانی عوام کے رہن سہن پر بھی ہوا جس می عوام کی بول چال کو خاص اہمیت حاصلہے۔ ہندوستانیوں کی اپنی عام بول چال کی زبان اردو، ہندی تھی جس پر انگریزوں نے خاص مخالفت کی۔ یہ زبان مغلیہ حکومت کی دین سمجھی جاتی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے عمل آتے ہی ہندوستانی عوام نئے ادیب اور شعرا سے واقف ہونے لگے اس وقت اردو زبان میں شعر و شاعری کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ فرنگیوں نے

ہندوستانیوں کی شان وشوکت کو اپنی دغا بازی سے چھین لیا تھا۔فرنگی عوام ہندوستانی عوام کو کسی بھی حالت میں چین وسکون کی زندگی گزارتے دیکھ خوش نہیں تھے۔ہندوستانی عوام کا تمام چین وسکون فرنگیوں نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا جس کا تذکرہ ہم ''انقلاب ۱۸۵۷ء'' مدون پی۔سی جوشی کی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۵۶ سے لے سکتے ہیں۔

''کافر فرنگیوں نے ہندوستان کی تمام دولت اور شان وشوکت وفارغ البالی چھین لی''

پھر بغاوت نے زور پکڑ لیا،زیادہ تر محکمے برباد ہو چکے تھے۔دوران بغاوت اودھ کو اس زمانے میں فنِ تہذیب کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا جس کو ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔اس دوران دہلی میں مغل حکومت کا صرف نام ہی باقی رہ گیا تھا کام نہیں۔اس وقت نئی نئی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا جو کہ ہندوستانی تہذیب وتمدن سے بیگانہ تھا۔اس زمانے می اودھ حکومت کا تعلق بھی ہندوستانی حکومت سے بالکل مختلف تھا۔بغاوت کے دوران معاشرے میں تذہیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی کوئی وقعت حاصل نہیں تھی۔فرنگی عوام کا اصل مقصد ہندوستانی عوام کو پوری طرح سے اپنے رنگ میں تبدیل کرنا تھا۔چاہے اس کا تعلق مذہبی اعتبار سے ہو یا سماجی یا سائنسی اعتبار سے۔دوران بغاوت سماج اور سائنس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ انگریز ملک میں چاروں جانب اپنا دبدبہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔اس وقت سماج میں افراتفری کا ماحول نہیں تھا بالکل غلامی کا دوردورہ تھا۔اس ساتھ ادب کے پیشتر حصے میں مختلف رنگ نمایاں ہوا۔جس کا تذکرہ ہم انقلاب ۱۸۵۷ء مدون پی۔سی۔جوشی کی کتاب سے صفحہ نمبر ۲۴۶ سے کر سکتے ہیں۔

''اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کے نئے انداز فکر کے راہنما قرار دیا جاسکتا ہے جنہوں نے ادب کو قوم کے ارتقاء میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ان کے خیال میں ادب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے۔ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں:

سر سید احمد خان،خواجہ الطاف حسین حالؔی،مولانا محمد حسین آزادؔ،ڈاکٹر نذیر احمد،مولانا شبلی نعمانی،مولانا ذکا اللہ، چراغ علی،محسن الملک اور وقار الملک ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق ہی ہوا اور

اس کے لئے فائدہ مند بھی۔ پہلے یہ شعوری طور پر ممکن نہ تھا۔‘‘

جب ہم اردو ادب کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کی واقفیت رکھنی چاہئے کہ بغاوت میں اردو ادب کو زیادہ ماہئیت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی اردو ادب کو بغاوت کے دوران زیادہ اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اردو ادب کو انگریزی عوام بے حد بدتر نظر سے دیکھتی تھی کیونکہ دورا بغاوت انگریزی عوام ہندوستانی عوام کو بے حد حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ کیونکہ اس وقت بغاوت کی وسعت اور اصلیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی جس کے نتیجے میں عوام میں آپس میں نہ اتفاقی برپا ہوگئی۔ یہ خیال اس قدر عام ہوگیا کہ بغاوت کو قومی تحریک سے آگاہ کرانے میں خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے بھی غدر کے حالات کو اردو اور فارسی زبان میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ غالبؔ جس طرح سن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو اپنی تصانیف میں شامل کر کے دور دراز کے علاقوں میں ہندوستانی عوام کے درمیان انصاف کا جذبہ قائم کیا اسی طرح سے ہندوستانی عوام نے بھی غالبؔ کے اس جذبے کی قدر کی۔

غالبؔ کی طرح سرسید احمد خان نے بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ غالب کا اصل مقصد کالے اور گوروں کی تفریق کا خاتمہ کر کے آپس میں بھائی چارہ اور قومی اتحاد پیدا کرنا تھا جس میں غالبؔ کے خطوط خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

اسی طرح سرسید احمد خان کا اصل مقصد ہندوستان کی سوتی ہوئی قوم کو جگانا تھا اور ہندو اور مسلمان میں آپسی قومی اتحاد کو قائم کرنا تھا۔ محض یہ کہ غالبؔ اور سرسید جیسی عظیم شخصیت نے بھی اردو ادب کو خاصہ کارفرما بنادیا۔ سرسید احمد خاں کی سب سے اہم قربانی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام تھا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے آج بھی دنیا کے ہر کونے میں مشہور و مقبول ہے۔

اخبارات، رسالے، تصانیف کے ذریعے سرسید احمد خان نے ہندوستانی مسلمانوں کے علم دین کو آگے بڑھانے کی دعوت دی جس میں انہوں نے مسلمان بچوں کو زیادہ تر علم سیکھنے کی جانب متوجہ کیا۔ کیونکہ دورن غدر ہندوستان جہالت سے بھرپور تھا ایسے تباہ کن حالات میں سرسید نے تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ فرنگیوں کے ڈر سے عوام اسکول میں اپنے بچوں کو تعلیم کی اجازت نہیں دیتی تھی سرسید احمد